مولانا وحید الدین خاں

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس مجموعہ میں راقم الحروف کی نشری تقریریں شامل کی گئی ہیں۔ یہ مختلف موضوعات پر ہیں۔ ان کا باہمی ربط یہ ہے کہ وہ سب کی سب نشری تقریریں ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) سے میری پہلی تقریر ۹ جون ۱۹۶۸ کو نشر کی گئی تھی۔ اس تقریر کا عنوان تھا: پیغمبر اسلام کا کردار۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں میری تقریریں ریڈیو پر نشر ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً تین درجن ہوگئی۔ یہ مجموعہ انھیں تقریروں پر مشتمل ہے۔ البتہ کچھ ریڈیو پروگرام بات چیت کے انداز میں ہوئے۔ ان میں سے ایک "روزہ کے بارے میں" تھا۔ یہ پروگرام ۱۹ اگست ۱۹۷۸ کو ہوا۔ اور اس میں تین مذہب کے نمائندوں نے روزے کے بارے میں بات چیت کے انداز میں اظہار خیال کیا۔

اس قسم کا دوسرا پروگرام وہ ہے جو ۱۸ ستمبر اور ۲۴ ستمبر ۱۹۸۷ کو نئی دہلی ریڈیو سے نشر کیا گیا۔ راقم الحروف کا ایک مضمون ٹائمس آف انڈیا (۵ ستمبر ۱۹۸۷) میں شائع ہوا۔ جس کا عنوان تھا:

Not by grievances alone

اس مضمون کی اشاعت کے بعد آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی نے راقم الحروف کے ایک انٹرویو کا انتظام کیا۔ اس میں انٹرویور نے مذکورہ مضمون کی روشنی میں ہندستانی مسلمانوں کے مسائل پر سوالات کیے۔ اور میں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان کا جواب دیا۔ اس انٹرویو کا ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے اس کو زیر نظر مجموعہ میں شامل نہ کیا جاسکا۔

ریڈیو گویا انسانی آواز کی توسیع ہے۔ ریڈیو کے ذریعہ یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ آدمی اپنی زبان سے ایک مخصوص مقام پر بولے، مگر مشین کے ذریعہ اس کی آواز تمام دنیا میں سنائی دے۔ مزید یہ کہ عین اسی وقت اور اسی لب و لہجہ میں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید مواصلاتی ذرائع اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اللہ کی بات کو پھیلانے ہی کے لیے اب تک ان جدید ذرائع کو سب سے کم استعمال کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی ملکوں کا حال بھی اس معاملہ میں کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یہ دور جدید کا ایک عظیم امکان ہے جو ابھی تک تقریباً غیر استعمال شدہ حالت میں پڑا ہوا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں جو ریڈیائی تقریریں شامل کی گئی ہیں وہ سب کی سب وہ ہیں جو پیشگی طور پر لکھی گئی تھیں اور ریڈیو کے اسٹوڈیو میں پڑھ کر سنائی گئیں۔ ان کو آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے دوبارہ اس مجموعہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی تقریریں وہ ہیں جو زبانی طور پر ریکارڈ کرائی گئیں۔ آجکل میں زیادہ تر اسی انداز پر بولتا رہا ہوں۔ ان تقریروں کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اور نہ میں نشریہ کے بعد ان کو قلم بند کر سکا۔ اس لئے اس قسم کی تقریریں زیر نظر مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔

وحید الدین

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۶

بابِ اوّل

رسول اللہ ؐ کا کردار

طائف کی وہ شام بھی کس قدر بھیانک تھی جب شہر کے لڑکے پیغمبر اسلام کو پتھر مار مار کر شہر سے باہر لے جا رہے تھے۔ آپ مکہ سے پچاس میل کا سفر طے کرکے حجاز کے رئیسوں کے گرمائی صدر مقام پہنچے تھے تاکہ انھیں دین اسلام کی دعوت دیں۔ مگر طائف کے رئیسوں نے آپ کے خیر خواہانہ پیغام کو سننے کے بجائے شہر کے اوباش لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لڑکے اس وقت تک آپ کا پیچھا کرتے رہے جب تک سورج نے غروب ہوکر آپ کے اور ان لڑکوں کے درمیان تاریکی کا پردہ نہ ڈال دیا۔

آپ کا جسم زخموں سے چور تھا۔ سر سے پیر تک آپ خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے تھک کر انگور کے ایک باغ میں پناہ لی۔

غور کیجئے یہ کسی آدمی کے لئے کتنا نازک وقت ہوتا ہے۔ آپ نے خود ایک بار حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا کہ طائف کی یہ شام میری زندگی کی سخت ترین شام تھی۔ مگر آپ کی زبان سے اس انتہائی سنگین موقع پر بھی اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی برا کلمہ نہیں نکلا۔ بلکہ آپ نے فرمایا ــــــ "خدایا انھیں صحیح راستہ دکھا۔ کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں"۔

رسول اللہ ؐ کا یہی اخلاق تھا جس نے آپ کے دشمنوں کو اس طرح زیر کیا کہ سارے عرب نے آپ کے پیغام کو قبول کر لیا۔ آپ کے اعلیٰ کردار کے آگے کوئی تعصب، کوئی دشمنی اور کوئی ہٹ دھرمی ٹھہر نہ سکی۔ آپ کی بلند سیرت لوگوں کو جادو کی طرح مسخر کرتی چلی گئی۔

آپ نے ایک بار فرمایا "صلۂ رحمی یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو (بخاری۔ کتاب الادب) تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار اسلام کے کچھ دشمنوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ پر زنا کی تہمت لگائی جو قطعاً جھوٹ اور بے بنیاد تھی۔ اس فرضی داستان کو گھڑنے اور اس کو پھیلانے میں ایک شخص مسطح نامی بھی شریک تھا جو حضرت ابوبکر رضؓ کا رشتہ دار تھا۔ اس شخص کو ضرورت مند سمجھ کر حضرت ابوبکر اس کو کچھ ماہانہ رقم دیا کرتے تھے۔ جب حضرت ابوبکر کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی پر جھوٹی تہمت لگانے میں مسطح بھی شریک رہا ہے، تو آپ نے اس کی امدادی رقم بند کر دی۔ اس پر اللہ کے رسول کے اوپر یہ آیت اتری کہ اگر کوئی شخص معاشی حیثیت سے ضرورت مند ہے تو اس کے اخلاقی جرم

کی وجہ سے اس کی مالی امداد بند نہ کرو۔ بلکہ اس کے جرم سے درگذر کرتے ہوئے اس کی معاشی امداد جاری رکھو۔

اسی طرح حضرت ابوبکر ہی کا واقعہ ہے کہ ایک بار وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر آپ کو گالی دی۔ حضرت ابوبکر پہلی بار گالی سن کر چپ رہے دوسری بار اس نے گالی دی تو اس وقت بھی آپ چپ رہے۔ مگر اس نے جب تیسری بار بدزبانی کی تو آپ خاموش نہ رہ سکے اور کچھ بول اٹھے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ فوراً وہاں سے اٹھ گیے۔ حضرت ابوبکر نے عرض کیا۔ یارسول اللہ کیا آپ مجھ سے خفا ہو گیے۔ فرمایا" ابوبکر جب تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا۔ جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔" سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الانتصار)۔

گویا برائی کے جواب میں جب آدمی اپنی طرف سے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتا تو وہاں خدا اس کی طرف سے انتقام لینے کے لئے موجود ہوتا ہے۔ مگر جب آدمی خود انتقام لینے پر اتر آئے تو خدا اس کے معاملہ کو اس کے حوالے کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان خدا سے بہتر انتقام نہیں لے سکتا۔

حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم سے کچھ اشرفیاں قرض لیں۔ اس کے بعد ایک روز وہ تقاضے کے لئے پہنچا۔ آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس تمہارا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ یہودی نے جواب دیا" جب تک تو میرا قرض ادا نہ کرے گا میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔" چنانچہ ظہر کے وقت سے لے کر وہ اگلی صبح تک آپ کا دھرنا دیے بیٹھا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مدینہ میں آپ کا اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے اس کو ڈانٹ کر بھگانا چاہا مگر آپ نے سب کو منع کر دیا۔ لوگوں نے کہا "حضور ایک یہودی آپ کو قید کئے ہوئے ہے۔" آپ نے فرمایا کہ" ہاں۔ مگر مجھے ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔" جب دوسرا دن شروع ہوا تو یہودی کی آنکھیں کھل گئیں اور آپ کے اس عمل سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا۔ یہ یہودی مدینہ کا ایک بہت مالدار شخص تھا۔ کل تک اس نے چند اشرفیوں کے لئے آپ کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ اور اب آپ کے اعلیٰ کردار سے اتنا متاثر ہوا کہ ساری دولت آپ کے سامنے حاضر کر دی اور کہا کہ اس کو آپ جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ (بیہقی)

عبداللہ ابن ابی الحسماء بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار میں نے خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کیا۔ ابھی معاملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ مجھے کچھ ضرورت پیش آگئی۔ میں نے کہا کہ آپ ٹھہریئے۔ میں گھر سے واپس آتا ہوں تو بقیہ معاملہ کو مکمل کرتا ہوں۔ مگر واپس آنے کے بعد میں ایسا

مشغول ہوا کہ اپنا وعدہ بھول گیا۔ تین روز بعد مجھ کو اپنا وعدہ یاد آیا تو میں اس مقام پر پہنچا، دیکھا کہ وہاں رسول اللہ موجود ہیں۔ آپ نے فرمایا "تم نے مجھ کو بہت تکلیف دی۔ میں تین روز سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں" (ابوداؤد)

اس طرح کے عمل میں اتنی کشش ہے کہ کٹر سے کٹر آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا السام علیکم (تباہی ہو تم پر) حضرت عائشہؓ سے نہیں رہا گیا۔ انھوں نے کہا" بلکہ تم لوگ غارت ہو جاؤ اور تم پر خدا کی لعنت ہو" آپ نے سنا تو منع فرمایا۔ آپ نے کہا" خدا مہربان ہے اور وہ ہر کام میں مہربانی کو پسند کرتا ہے" حقیقت یہ ہے کہ دشمن کا دل جیتنے کے لئے اس سے بڑا کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی بدزبانی کا جواب نرم باتوں سے دیا جائے۔ ہتھیار کے حملے کی تاب لانا تو ممکن ہے مگر کردار کے حملے کے مقابلے میں کوئی ٹھہر نہیں سکتا۔ یہاں ہر شخص کو اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے موقع پر تین شرطوں کے ساتھ قریش سے معاہدہ کیا تھا جن میں سے ایک شرط یہ تھی:

جو غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے یہاں چلا جائے اس کو وہ واپس کر دیں گے مگر جو مسلمان ہمارے پاس آجائے گا ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

یہ معاہدہ ہو رہا تھا کہ مکہ سے ایک مسلم نوجوان ابو جندلؓ حدیبیہ پہنچے۔ ان کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں مکہ والوں نے قید کر رکھا تھا اور وہ بیڑیاں پہنے ہوئے گرتے پڑتے اس حال میں یہاں پہنچے تھے کہ ان کا جسم بیڑیوں کی رگڑ سے زخمی ہو رہا تھا۔ وہ فریاد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مجھے دشمنوں کے چنگل سے بچائیے۔

یہ بے حد نازک موقع تھا۔ تمام صحابہ کی تلواریں کھنچ گئیں۔ ابوجندل کے جذباتی واقعہ کے بعد ہر شخص کا رجحان یہ ہو گیا کہ معاہدہ کو کالعدم کر کے ابوجندل کی زندگی کو بچایا جائے۔ دوسری طرف مکہ والوں نے کہا" محمد! یہ معاہدہ کی تعمیل کا پہلا موقع ہے" خدا کے رسول نے فیصلہ کیا کہ جو معاہدہ ہو چکا ہے اب اس سے ہم پھر نہیں سکتے۔ چنانچہ انھیں دوبارہ مکہ والوں کے حوالے کر دیا گیا۔

بظاہر اس واقعہ کے معنی صرف یہ تھے کہ مظلوم کو دوبارہ ظالم کے چنگل میں دے دیا جائے۔ مگر اس واقعہ میں وعدہ پورا کرنے کا جو شاندار مظاہرہ ہوا اس نے ظالموں کو اندر سے پچھاڑ دیا۔ اگرچہ وہ ابوجندل کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھیں اپنے یہاں قید میں رکھا۔ مگر ایفائے عہد

کی اس بلند ترین علامت کو دیکھ کر مکہ کے لوگ اتنی کثرت سے مسلمان ہونے شروع ہوئے کہ قید و بند کی حالت میں بھی ابو جندل انھیں ایک زبر دست خطرہ معلوم ہونے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں عافیت سمجھی کہ ان کو رہا کر کے مکہ کے باہر بھیج دیا جائے۔ (صحیحین)

حضرت ابوہریرہؓ مدنی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نجد کے دشمنوں کی طرف چند سوار بھیجے۔ وہ شہر یمامہ کے حاکم ثمامہ بن اثال کو راستہ میں پا گئے اور اسے گرفتار کر لائے۔ اور مدینہ لاکر مسجد کے ایک ستون سے اسے باندھ دیا۔ رسول اللہ اس کے پاس آئے اور حال دریافت کیا۔ ثمامہ نے جواب دیا ــــ "اگر تم نے مجھے قتل کر دیا تو میری قوم تم سے میرے خون کا بدلہ لے گی، اور اگر مجھ پر احسان کر کے چھوڑ دو گے تو عمر بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ اور اگر مال کی خواہش ہے تو جتنا مال چاہو میں پیش کرنے کو تیار ہوں" رسول اللہؐ نے اس کی رہائی کا حکم دیدیا۔

یہ واقعہ اس وقت کی دنیا میں بہت عجیب تھا۔ کیوں کہ قبائلی زندگی میں کسی دشمن کے ہاتھ آجانے کے بعد اس کا ایک ہی انجام تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ رسول اللہ نے اس کے جسم کو تو قتل نہیں کیا مگر اپنے اخلاقی عمل سے اس کی روح کو قتل کر دیا۔ چنانچہ قید سے چھوٹنے کے بعد ثمامہ قریب کے ایک باغ میں گیا اور غسل کر کے دوبارہ مسجد نبوی میں آیا۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کس لئے دوبارہ یہاں آیا ہے۔ مگر جب اس نے بلند آواز سے کلمہ شہادت ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ نے اسے رہا کر کے در اصل ہمیشہ کے لیے گرفتار کر لیا تھا۔

اس کے بعد ثمامہ عمرہ کرنے کے لئے مکہ گیا جب وہ حرم میں پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو ثمامہ کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے کہا "تم بے دین ہو گئے" ثمامہ نے جواب دیا "بے دین نہیں ہوا۔ البتہ محمد کے دین کو قبول کر لیا ہے"

اس زمانہ میں مکہ کے لوگوں کو باہر کے جن مقامات سے گندم فراہم ہوتی تھی، ان میں یمامہ ایک خاص مقام تھا۔ چنانچہ انھوں نے مکہ والوں سے کہا کہ سن لو! محمد کی اجازت کے بغیر اب گندم کا ایک دانہ بھی تمہارے یہاں نہیں آئے گا۔" (صحیح مسلم)

کردار بظاہر ایک بے قیمت چیز ہے۔ مگر اس کو دے کر آدمی کیسی کیسی قیمتی چیزوں کو خرید لیتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ جون ۱۹۶۸ کو نشر کیا گیا۔

ابراہیمؑ کا ایثار

جدید اثری تحقیقات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ۲۱۶۰ ق م میں ہوئی۔ ۱۷۵ سال کی عمر پاکر آپ نے ۱۹۸۵ ق م میں انتقال فرمایا۔ آپ دریائے فرات کے کنارے واقع قدیم شہر ار (UR) میں پیدا ہوئے۔ اس علاقے کو پرانے زمانہ میں بابل کہا جاتا تھا، اب اس کو عراق کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی قوم سورج، چاند اور ستاروں کو پوجتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس قسم کے تقریباً ۵ ہزار خدا بنا رکھے تھے۔ ان میں سورج اور چاند سب سے بڑے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کو اپنی قوم کے دین سے رغبت نہ ہو سکی۔ انسانی بستیوں کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے لئے کشش نہ پاکر آپ بستی سے باہر نکل جاتے اور تنہائیوں میں زمین و آسمان کے نظام پر غور کرتے۔ ماحول کے فکری دباؤ سے آزاد ہوکر جب آپ سوچتے تو آپ پر نئی حقیقتوں کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آتے۔ آپ آسمان میں یہ منظر دیکھتے کہ چاند چمکتا ہے اور پھر ماند پڑ جاتا ہے۔ ستارے نکلتے ہیں اور پھر ڈوب جاتے ہیں۔ سورج روشن ہوتا ہے اور پھر رات کی تاریکی میں چھپ جاتا ہے۔ ان واقعات پر غور کرنے کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ چیزیں جو عروج و زوال کے قانون میں بندھی ہوئی ہیں وہ خدا نہیں ہو سکتیں۔ خدا تو وہی ہو سکتا ہے جو عروج و زوال کی حد بندیوں سے اوپر ہو۔

یہ آپ کی ایثار و قربانی سے بھری ہوئی زندگی میں پہلا "ایثار" تھا۔ جوانی کی عمر میں آدمی تفریحات میں رہنا پسند کرتا ہے مگر آپ نے خاموش تنہائیوں کو اپنا دوست بنایا۔ اس زمانہ کو آدمی بے فکری میں گزار دیتا ہے مگر اس کو آپ نے سنجیدہ سوچ بچار کی بے قراری کے حوالے دیا۔ اس عمر کو پہنچ کر آدمی مادی لذتوں اور دنیوی ترقیوں کی طرف دوڑتا ہے مگر آپ نے اپنی بہترین گھڑیوں کو حقیقت کی تلاش میں لگا دیا۔ آدمی کے لئے سب سے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر چل پڑے مگر آپ نے ایک انقلابی انسان کی طرح رواج کو چھوڑ کر سچائی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ "جو ہو رہا ہے" کے مقابلہ میں آپ نے "جو ہونا چاہئے" کو ترجیح دی۔ یہ بہت بڑا نفسیاتی ایثار تھا۔ ماحول کے خلاف کسی سچائی کو اختیار کرنا ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اس کے سوا سب کچھ چھوڑنے پر اپنے کو راضی کرے۔ جب آپ نے یہ فیصلہ کیا تو اللہ نے اس کو اس طرح قبول فرمایا کہ آپ پر سچائی کی معرفت کے دروازے کھول دئے اور آپ کو اپنی پیغمبری کے لئے چن لیا۔ یہ خدائی کام آپ کے سپرد ہوا کہ آپ اپنے وقت کے انسانوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دیں۔

اس کے بعد آپ کے ایثار کا دوسرا شدید ترین دور شروع ہوتا ہے۔ آپ کے زمانہ کا حکمراں نمرود (ارنمو) خدائی بادشاہ بن کر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانہ کے دوسرے بادشاہوں کی طرح نمرود نے عوام میں یہ عقیدہ بٹھا رکھا تھا کہ اس کو حکومت کرنے کا خدائی حق حاصل ہے۔ وہ کہتا تھا کہ سورج سب سے بڑا معبود ہے اور نمرود کا خاندان اس معبود کا دنیوی مظہر ہے۔ سورج جس طرح "آسمانوں پر" حکومت کر رہا ہے اسی طرح سورج کی اولاد ہونے

کی وجہ سے اس کو یہ حق ہے کہ وہ زمین پر بسنے والوں کا حاکم بنے۔

اس اعتبار سے سورج چاند کی پرستش، اس زمانہ میں محض ایک مذہبی عقیدہ نہ تھی بلکہ وہ اس وقت کی سیاست کی اعتقادی بنیاد بھی تھی۔ موجودہ زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد عوامی حاکمیت ہے، اُس زمانہ کی سیاست کی نظریاتی بنیاد خدائی حق حکمرانی تھا اور یہ خدائی حق حکمرانی اس شاہی خاندان کے لئے مخصوص سمجھا جاتا تھا جو مفروضہ معبود کی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ حضرت ابراہیم کا گھرانا اس نظام میں خاص اہمیت رکھتا تھا کیوں کہ آپ کا باپ آذر [Terah] اس زمانہ کے بت سازی کے "کارخانہ" کا مالک تھا اور شاہی بت خانہ میں افسر اعلیٰ کا درجہ رکھتا تھا۔ وقت کے سیاسی نظام میں اس کو بہت اونچی سیاسی حیثیت حاصل تھی۔ اس کا عہدہ اس زمانہ کے لحاظ سے تقریباً وہی تھا جو آج کل کسی ایسی سیاسی پارٹی کے صدر کا ہوتا ہے جو کسی ملک میں حکمراں پارٹی کی حیثیت رکھتی ہو۔

ان حالات میں حضرت ابراہیم کے لئے بنا بنایا کامیابی کا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی جگہ لے لیں، وہ قائم شدہ نظام کا ساتھ دے کر اس میں اونچا مقام حاصل کرلیں۔ مگر آپ نے دوبارہ ایثار و قربانی کے راستہ پر چلنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے باپ آزر سے صاف لفظوں میں کہا: کیا تم ستاروں کو خدا مانتے ہو اور ان کی شکلیں بنا کر ان کو پوجتے ہو۔ یہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں میں تم کو اور تمھاری قوم کو دیکھ رہا ہوں (انعام ۷۴)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وقت کے ستارہ پرستی کے نظام سے اپنے باپ کی طرح موافقت نہیں کی بلکہ وہ اس کے خلاف داعی اور مصلح بن کر کھڑے ہو گئے۔ جس نظام میں اعلیٰ ترین عہدہ ان کا انتظار کر رہا تھا وہ خود اس نظام کو بدلنے کے علم بردار بن گئے۔ انھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ ناحق کو مان کر اس کے ڈھانچے میں عزت اور ترقی کے خواب دیکھیں بلکہ ناحق کی تردید اور حق کا اعلان کرنے کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گھر سے نکال دئے گئے۔ قوم میں حقیر سمجھے جانے لگے۔ خود بادشاہ وقت بھی آپ کا دشمن بن گیا۔ کیونکہ آپ کی تحریک، اس وقت کے حالات میں بادشاہ کو اس کی سیاسی زمین سے محروم کرنے کے ہم معنی تھی۔

چلتے ہوئے نظام سے بغاوت ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ اس نظام کے اندر آدمی ہر قسم کے مواقع سے محروم ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے اس فیصلہ نے آپ کی پوری زندگی کو ایثار و قربانی کی زندگی بنا دیا۔ آپ گھر سے بے گھر کئے گئے۔ خاندانی جائداد میں آپ کا کوئی حصہ نہ رہا۔ باپ کی جانشینی کے لئے آپ نااہل قرار پائے۔ وقت کے سماج میں آپ کی حیثیت ایک اجنبی انسان کی ہوگئی۔ اُر کی تقریباً تین لاکھ کی آبادی میں کوئی آپ کا ساتھی نہ رہا۔ وقت کی حکومت آپ کو خطرہ کی نظر سے دیکھنے لگی۔ کیونکہ آپ اس کے پھیلائے ہوئے اِس توہماتی عقیدہ کی تردید کرتے تھے کہ سورج چاند خدائی ہستیاں ہیں اور اُن کی طرف سے کسی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ زمین پر لوگوں کا بادشاہ بن جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے پرسکون زندگی کے اوپر مصیبت کی زندگی کو ترجیح دی۔ انھوں نے عوام کے درمیان مقبولیت کے مقابلہ میں عوام کے درمیان اجنبی بن جانے کو پسند کرلیا۔ وہ عہدہ اور جائداد کو چھوڑ کر خالی ہاتھ ہو جانے پر

قائغ ہوگئے۔ بادشاہ وقت کے دربار میں معزز کرسی پر بیٹھنے کے بجائے انھوں نے یہ خطرہ مول لیا کہ بادشاہ کی نظر میں وہ معتوب ہوجائیں اور حکومت کی طرف سے ان کی پکڑ دھکڑ شروع ہوجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ قوم کے اندر بے عزت کئے گئے۔ پھر آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا جس سے اللہ نے آپ کو بچا لیا۔ اس کے بعد آپ کو مجبور کیا گیا کہ آپ عراق کو چھوڑ دیں اور ملک کے باہر چلے جائیں۔

یہاں سے آپ کی زندگی میں ایثار و قربانی کا ایک اور شدید تر مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ملک کے معزز ترین خاندان کا ایک فرد اس طرح بے سروسامانی کی حالت میں اپنے وطن سے نکلا کہ اس کے ساتھ صرف اس کی بیوی سارہ تھی اور اس کا بھتیجا لوط۔ تین آدمیوں کا یہ مختصر قافلہ خانہ بدوشوں کی طرح دریائے فرات کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا حاران پہنچا۔ پھر بحر ابیض کے ساحلی علاقوں سے گزرتا ہوا شام اور فلسطین اور مصر تک چلا گیا۔ مگر ان مقامات کے لوگ بھی اسی قسم کے غیر خدائی معبودوں کو ماننے والے تھے جن کو نہ ماننے کے جرم میں آپ کو اپنے وطن سے نکلنا پڑا۔ آخر اللہ کی طرف سے آپ کو یہ حکم ہوا کہ تم حجاز کے بے آب وگیاہ علاقہ میں جاؤ۔ وہاں پتھروں اور خشک پہاڑوں کے درمیان خدا کا ایک گھر بناؤ۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم جب مکہ آئے تو اس وقت وہاں نہ کوئی آدمی تھا اور نہ پانی (لیس یومئذ بمکۃ احدٌ ولیس بھا ماءٌ، بخاری، کتاب الانبیاء) وقت کے انسانوں نے خدا کو چھوڑ کر خود اپنے بنائے ہوئے معبودوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ تاہم پتھر اور پہاڑ اب بھی اپنی اصل فطری حالت پر باقی تھے۔ اس فطرت کے ماحول میں آپ کو خدا کا گھر بنانے کا حکم ہوا تاکہ کوئی بندہ جو خالص خدا کی عبادت کرنا چاہے وہ یہاں آکر خدا کی عبادت کرے۔ اب حضرت ابراہیم بحر قلزم کے ساحلی علاقوں سے گزرتے ہوئے موجودہ مکہ کے مقام پر پہنچے اور یہاں بیت اللہ کی تعمیر کی۔ وہ شخص جو عزت اور خوش حالی کی گود میں پیدا ہوا تھا اُس نے حق کی خاطر تنہائی، مسافرت اور تنگ و دشوار زندگی کو اپنے لئے اختیار کر لیا۔

حضرت ابراہیم ۷۵ سال کی عمر میں عراق سے نکلے تھے۔ ۱۰ سال کی مسافرانہ زندگی کے بعد ۲۰۷۴ ق م میں آپ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے اسماعیل رکھا (اسماعیل کے معنی سمیع اللہ کے ہیں) اس وقت آپ کی عمر ۸۶ سال تھی۔ بڑھاپے کی اولادیوں بھی آدمی کے لئے عزیز ہوتی ہے۔ اور آپ کا حال تو یہ تھا کہ تمام دوستوں اور رشتہ داروں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور اب آپ تمام تر اپنے بیوی بچے کے سہارے پر رہ گئے تھے۔ ایسی حالت میں ہونہار لڑکا آپ کے لئے کتنا زیادہ محبوب ہوگا۔ مگر بیٹا جب بڑا ہوا اور آپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو ایثار و قربانی کا اور بھی کڑا امتحان سامنے آگیا۔ خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ اپنے آخری سہارے سے بھی دست بردار ہوجاؤ، اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کردو۔ تورات کے بیان کے مطابق جب قربانی کا حکم ہوا تو اس وقت آپ کے فرزند کی عمر ۱۳ سال تھی۔

حضرت ابراہیم سو سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ خواب کو عام طور پر ایک تمثیلی چیز سمجھا جاتا ہے۔ آپ اس کو کسی تعبیری مفہوم میں لے سکتے تھے۔ مگر یہ حضرت ابراہیم کے

ایثار و قربانی کے جذبہ کی انتہا تھی کہ آپ نے خواب کی کوئی تاویل نہ کی۔ آپ اس خواب کو اس کی اصلی صورت میں زیر عمل لانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مروہ پہاڑی کے مقام پر تاریخ کا وہ انوکھا واقعہ پیش آیا جس کو دیکھنے کے لئے زمین و آسمان رک گئے۔ بوڑھا باپ اپنے محبوب بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کر رہا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر مداخلت کر کے حضرت اسماعیل کو ذبح ہونے سے بچا لیا۔ آسمان سے آواز آئی کہ بس تم نے تسلیم و وفاداری کا آخری ثبوت دے دیا۔ بیٹے کے بدلے میں اللہ نے آپ کی طرف سے مینڈھے کی قربانی قبول کر لی۔ اس کے بعد یہ طریقہ مستقل طور پر تمام خدا پرستوں کے لئے مقرر کر دیا گیا۔ حکم ہوا کہ آدمی اپنی قربانی کے علامتی فدیہ کے طور پر ہر سال انھیں تاریخوں میں جانور ذبح کرے جن تاریخوں میں حضرت ابراہیم خدا کے حکم کی تعمیل میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیم کو جو خواب دکھایا گیا اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ آپ اپنے عزیز بیٹے کو دعوت توحید کے مرکز (بیت اللہ) کی خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ اسی غرض سے حکم ہوا تھا کہ اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے جا کر مکہ کی خشک اور سنسان زمین پر بسا دو۔ مگر اس بات کو چھری سے ذبح کرنے کی صورت میں ممثل کیا گیا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دین کی خدمت کوئی معمولی چیز نہیں ہے، یہ اپنے آپ کو جیتے جی ذبح کرنا ہے۔ "ذبح" ایثار و قربانی کی آخری انتہا ہے اور ایثار و قربانی کی آخری انتہا پر پہنچ کر ہی آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ خدا کے دین کی خدمت کر سکے۔

حضرت ابراہیم کا ایثار صرف یہ نہ تھا کہ آپ نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ بیٹے کی قربانی تو ایثار و قربانی کے لمبے سلسلے کی صرف آخری صورت تھی۔ آپ کا ایثار یہ تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ لوگ صرف دکھائی دینے والے خداؤں کے لئے اپنی محبتیں اور عقیدتیں وقف کر رہے تھے، آپ نے نہ دکھائی دینے والے خدا کو اپنی محبت و عقیدت کا مرکز بنایا۔ ایسے حالات میں جب کہ ناحق ہر طرح کے مادی دلائل کے زور پر اپنی اہمیت ثابت کر رہا تھا، آپ نے ایک ایسے حق کو پہچانا اور اس کو قبول کر لیا جس کی تائید میں صرف ذہنی دلائل قائم ہو سکتے تھے۔ ایسی فضا میں جب کہ باطل کے ساتھ مصالحت کرنے میں آپ کے لئے عزت و ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے، آپ نے محض سچائی کی خاطر ایک ایسے غیر مصالحانہ راستہ کو اختیار کر لیا جس میں سختیوں اور مشکلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایسے ماحول میں جب کہ لوگ متمدن شہروں میں اقامت کو پسند کر رہے تھے، آپ نے ایک خشک بیابان میں لے جا کر اپنے گھر والوں کو بسا دیا۔ یہ سب کچھ غیر معمولی ایثار و قربانی کے جذبہ کے تحت ہوا۔ ایثار و قربانی کی نفسیات کے بغیر ان میں سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا تھا —— خدا پرست بننا اپنے کو ذبح کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے کو ذبح کرنے پر تیار نہ ہو وہ خدا پرست بھی نہیں بن سکتا۔

حضرت ابراہیم کی زندگی سراپا حق کی زندگی تھی۔ آپ کی زندگی میں خدا پرستوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ آپ کی زندگی یہ سبق دیتی ہے کہ ـــــ اگر تم خدا والے بننا چاہتے ہو تو ظواہر سے گزر کر حقائق کو دیکھنے والی نگاہ پیدا کرو۔ اگر تم خدا والے بننا چاہتے ہو تو ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر خدا کی پسند کو اپنا مقصود بناؤ۔ اگر تم خدا والے بننا چاہتے ہو تو خدا کی راہ میں اپنی عزیز ترین چیز قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ اگر تم خدا والے بننا چاہتے ہو تو غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو خدا کی اطاعت کے لئے راضی کرو۔

حضرت ابراہیم کی زندگی اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے بھی ایک نمونہ کی زندگی تھی اور قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے بھی وہ بہترین نمونہ کی حیثیت سے قائم رہے گی۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

رحمۃ للعالمین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمۃ للعالمین (سارے عالم کے لئے رحمت) کہا گیا ہے۔ اسی بات کو خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مسدس میں اس طرح نظم کیا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

پیغمبر اسلام رحمت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ ایک مورخ کے الفاظ میں، رحمت آپ کی شخصیت کو سمجھنے کی کنجی ہے۔ آپ کا تمام قول اور تمام عمل جس بنیادی اصول کے ماتحت ہوتا تھا وہ یہی رحمت کا پہلو ہے۔ آپ وہی بات بولتے تھے جس میں انسانوں کے لئے رحمت کا سامان ہو۔ آپ اسی طریقہ کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کرتے تھے جو انسانی معاشرہ میں رحمت والا نتیجہ پیدا کرے۔

آپ جس دین کو لائے اس کی بابت قرآن میں یہ الفاظ ہیں کہ اللہ اس دین کے ذریعہ لوگوں کو سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ اسی لئے آپ کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام قرار پایا جس میں سلامتی کا مفہوم شامل ہے۔ آپ مکمل سلامتی تھے اور آپ نے لوگوں کو سلامتی کی طرف دعوت دی۔

آپ نے انسان کو جس جنت کا طالب بننے کی دعوت دی، اس کی تصویر قرآن میں یہ ہے کہ اس میں کوئی لغو بات یا گناہ کی بات نہ ہوگی۔ وہاں ہر طرف صرف سلامتی کا قول سنائی دے گا۔ اس طرح آپ نے لوگوں کو بتایا کہ اگر تم موت کے بعد والی دنیا میں جنت کے ماحول میں رہنا چاہتے ہو تو موت سے پہلے کی زندگی میں تم کو لغو باتوں اور گناہ والے کاموں سے بچنا ہوگا۔ تم کو دنیا کے لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تمہارے دل میں لوگوں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر تم نے اپنے بارہ میں اس اخلاقی صفت کا حامل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تو تم جنت کی نفیس آبادیوں میں بسائے جانے کے لئے نااہل ٹھہرو گے۔

آپ نے انسان کو یہ تعلیم دی کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملے تو وہ اس سے کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ (تمہارے اوپر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو) یہ صرف ایک لفظی کلمہ نہیں، بلکہ یہ دوسرے کے بارہ میں اپنے دل کی کیفیت کا اظہار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارے لئے میرے دل میں صرف سلامتی کا جذبہ ہے۔ میں تمہارا اتنا زیادہ خیر خواہ ہوں کہ

میرے دل سے تمھارے لئے امن وعافیت کی دعائیں نکلتی ہیں۔ مجھ سے تم کوئی اندیشہ محسوس نہ کرو، بلکہ میری طرف سے مامون رہو۔ کیوں کہ مجھ سے تم کو سلامتی اور رحمت کے سوا کوئی اور تجربہ ہونے والا نہیں۔

آپ نے لوگوں کو تلقین کی کہ ہر شخص دوسرے کے لئے نفع بخش بننے کی کوشش کرے، اگر وہ نفع بخش نہ بن سکے تو وہ اس کے حق میں اچھی بات کہے۔ اگر یہ بھی اس کے بس میں نہ ہو تو وہ کم از کم یہ کرے کہ وہ اپنے شر سے دوسروں کو بچائے۔ آپ نے راستہ سے پتھر یا کانٹا ہٹانے کو بھی ایمان کا جزء قرار دیا۔

آپ نے اپنے پیروؤں کے لئے جو عبادتی احکام مقرر کئے، ان میں سے ایک زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کمائی کا ایک حصہ ہر سال دوسرے حاجت مندوں کو دیا جائے۔ یہ گویا مال کے ذریعہ اس بات کی تصدیق کرنا ہے کہ میں سنجیدگی کی حد تک دوسروں کا خیر خواہ ہوں۔

انسانی اخلاقیات کی بنیاد آپ نے جس اصول پر رکھی وہ یہ تھا کہ ـــــ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ یہ اصول پوری سماجی زندگی کے لئے رحمت ہے۔ ہر آدمی کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ اس کو کیا چیز پسند ہے اور کیا چیز ناپسند۔ مثلاً ہر آدمی چاہتا ہے کہ مجھ سے محبت کی جائے، مجھ سے نفرت نہ کی جائے۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ امانت داری کا معاملہ کیا جائے، اس کے ساتھ دغابازی کا معاملہ نہ کیا جائے۔ ہر آدمی کو پسند ہے کہ لوگ اس سے میٹھا بول بولیں، کڑوا بول نہ بولیں۔

بس پسند اور ناپسند کا یہی معاملہ ہر آدمی دوسروں کے ساتھ بھی کرنے لگے۔ اگر ہر آدمی ایسا کرے کہ دوسروں کے ساتھ وہ وہی سلوک کرے جو سلوک وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے تو سارا سماج امن اور سلامتی کا گہوارہ بن جائے۔

آپ نے لوگوں کو جن باتوں کی تعلیم دی، ان میں سے ایک اہم تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، تب بھی تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ تم لوگوں کے ساتھ برابر کا اخلاق نہ برتو بلکہ برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کرو۔ دوسروں کے ساتھ تمہارا برتاؤ ان کے عمل کے ردعمل میں نہ ہو، بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی روشنی میں ہو۔

اس تعلیم میں بہت بڑی حکمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا یہی واحد راز

ہے۔ یہاں دوسروں کی طرف سے بدی کا تجربہ پیش آنے کے باوجود ان کے ساتھ نیک سلوک کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ "باوجود" کے اس اصول کو نہ انیں وہ اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، وہ کبھی اس اعلیٰ اخلاقی رویہ پر قائم نہیں رہ سکتے۔ جس کا انھوں نے اپنی زبان سے اقرار کیا تھا۔

موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں ہر آدمی آزاد ہے۔ ہر آدمی کو کھلا موقع حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دنیا میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ تمام لوگ ایک جیسے ہو جائیں۔ ایسی یکسانیت پتھر کے بنے ہوئے مجسموں میں ہوسکتی ہے مگر زندہ انسانوں میں ایسی یکسانیت ممکن نہیں۔

اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر لوگوں کا نظریہ یہ ہو کہ جو شخص ہم سے اچھا سلوک کرے، اس کے ساتھ ہم اچھا سلوک کریں گے، اور جو شخص ہم سے برا سلوک کرے، اس کے ساتھ ہم بھی برا سلوک کریں گے۔ اگر یہ نظریہ ہو تو سماجی زندگی میں کبھی امن وسلامتی کا ماحول قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے آپ نے کہا کہ لوگوں کی برائی کے باوجود تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ دوسروں سے تم کو ظلم کا تجربہ ہو تب بھی تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

اس اخلاق کو قرآن میں خُلقِ عظیم (برتر اخلاق) کہا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ آپ اس برتر اخلاق کا کامل نمونہ تھے۔

اس برتر اخلاق پر قائم ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے ایک برتر مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ آپ نے لوگوں کو ایک انتہائی اعلیٰ اور پاکیزہ مقصد دیا، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جن لوگوں کے دل میں یہ برتر مقصد پوری طرح بیٹھ جائے وہ اسی کے ساتھ ضرور اعلیٰ اخلاق والے بن جائیں گے۔

یہ برتر مقصد خدا کی معرفت ہے۔ اپنے آپ کو خدا تک پہنچانا ہے۔ اپنے آپ کو خدا کے قریب کرنا ہے۔ جو لوگ اس مقصد کی اہمیت کو سمجھیں اور صحیح معنوں میں اللہ کے طالب بن جائیں، ان کی نظر میں ہر دوسری چیز ہیچ ہو جائے گی۔ کڑوے بول کو سہنا، نقصان کو برداشت کرنا، وقار کھونے کو گوارا کرلینا، یہ سب ان کے لئے آسان ہو جائے گا۔ کیوں کہ وہ بہت بلند سطح پر جی رہے ہوں گے۔ اور جو شخص

اونچی سطح پر جئے وہ کبھی چھوٹی باتوں کی پروا نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ معلوم تاریخ میں پہلی بار آپ نے جنگ اور صلح کا صحیح انسانی اصول مقرر کیا اور اس پر خود عمل فرمایا۔

آپ نے جارحانہ جنگ کو مطلق طور پر ممنوع قرار دیا۔ آپ نے بتایا کہ جنگ صرف اس وقت کی جائے جب کہ دفاعی طور پر جنگ لڑنے کی ضرورت پیش آجائے۔ یعنی اپنی طرف سے کبھی جنگ میں پہل نہ کی جائے۔ البتہ اگر دوسرا فریق جارحیت کر دے تو اس سے بچاؤ کے لئے لڑا جاسکتا ہے۔

دوسرا ضروری اصول آپ نے یہ مقرر کیا کہ جنگ کے مقابلہ میں امن ہر حال میں بہتر اور مطلوب چیز ہے۔ اس لئے جنگ پیش آجانے کی صورت میں بھی مسلسل امن کی تلاش جاری رکھی جائے۔ اور اگر فریق ثانی صلح پر آمادہ ہو تو فوراً جنگ کو ختم کرکے اس سے صلح کر لی جائے، خواہ یہ صلح خود فریق ثانی کی یک طرفہ شرط پر کیوں نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام اصولوں کے نہ صرف داعی تھے بلکہ وہ ان کے عامل بھی تھے۔ آپ نے ان تمام اصولوں پر انتہائی اعلیٰ اور معیاری صورت میں عمل فرمایا، حتی کہ آپ کی زندگی ہمیشہ کے لئے ان تمام اصولوں کا معیاری عملی نمونہ قرار پائی۔ آپ کا کلام بھی سراسر رحمت تھا اور آپ کی زندگی بھی سراسر رحمت۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

نبیٔ رحمت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمۃ للعالمین (الانبیاء ، ۱۰۷) کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے رسول میں تمہارے لئے اسوۂ حسنہ (الاحزاب ۲۱) موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اپنی ذات میں رحمت ہیں۔ بلکہ وہ رحمت یا رحم دلانہ سلوک کے لئے بہترین نمونہ بھی ہیں۔

آپؐ نے قرآن اور حدیث کی صورت میں ہمارے لئے رحمت کا ہدایت نامہ بھی دیا۔ اسی کے ساتھ آپ نے رحمت والے طریقوں پر چل کر اس کا بہترین عملی نمونہ بھی قائم فرمایا۔ آپ قول کے اعتبار سے بھی نبی رحمت تھے اور عمل کے اعتبار سے بھی نبی رحمت۔

رحمت یا رحم دلانہ سلوک کے دو درجے ہیں۔ ایک ہے معتدل حالات میں لوگوں کے ساتھ رحم دلانہ سلوک کرنا۔ دوسرا ہے غیر معتدل حالات میں رحم دلانہ سلوک پر قائم رہنا۔ غیر معتدل حالات میں رحمدلی کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے مخالفانہ سلوک کا تجربہ ہو تب بھی آپ ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ ردعمل کی نفسیات سے بچ کر آپ اپنے مثبت رویہ پر قائم رہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں دونوں قسم کے رحیمانہ اخلاق کی مثالیں کمال درجہ میں پائی جاتی ہیں۔ آپ سے عام حالات میں بھی لوگوں کو رحمت و شفقت کا تجربہ ہوا اور غیر معمولی حالات میں بھی۔ یہاں ہم دونوں قسم کے اخلاق کی کچھ مثالیں بیان کریں گے۔

حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔ وہ دس سال تک آپ کی خدمت میں رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پوری مدت میں آپ نے کبھی مجھ کو نہ کسی پر جھڑکا اور نہ کسی بات کا حکم دیا۔ اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے فلاں کام کیوں نہیں کیا۔

آپ لوگوں کو نصیحت کرتے تو ایسا انداز اختیار فرماتے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ آپ کو جب کسی کے بارہ میں یہ اطلاع ملتی کہ اس نے فلاں کام غلط کیا ہے تو آپ اس کا نام لے کر برا نہ کہتے۔ بلکہ یہ فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا کہتے ہیں یا ایسا کرتے ہیں۔

آپ آدمی کے قول وفعل پر ملامت تو فرماتے مگر اس آدمی کا نام ظاہر نہ فرماتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ ایک بار دیہات کا ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا کہ میں اپنے خادم کو دن میں کتنی بار معاف کروں۔ اور کتنی بار اس کی غلطی سے درگزر کروں۔ آپ نے فرمایا کہ تم ستر مرتبہ درگذر کرو۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے ادا کر دو۔

رحمت کی صفت آپ کے اندر بے پناہ تھی۔ آپ کا رحیمانہ اخلاق اور آپ کا رحم دلانہ سلوک اس وقت بھی پوری طرح باقی رہتا تھا جبکہ دوسروں کی طرف سے آپ کو برائی اور زیادتی کا تجربہ ہوا ہو۔ آپ ردعمل کی نفسیات سے آخری حد تک بلند تھے۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ راستہ چل رہا تھا۔ اس وقت آپ ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے جس کے کنارے موٹے تھے۔ راستہ میں آپ کی ملاقات ایک دیہاتی آدمی سے ہوئی۔ اس آدمی کو کچھ ضرورت تھی۔ مگر اس نے شرافت کے ساتھ سوال کرنے کے بجائے برا انداز اختیار کیا۔ اس نے آپ کی چادر زور سے کھینچی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا تو چادر کھینچنے کی وجہ سے آپ کی گردن پر نشان پڑ گئے تھے۔

اس کے بعد دیہاتی نے کہا کہ اے محمد، اللہ کا مال جو تمہارے پاس ہے، اس میں سے کچھ مال مجھے دو۔ آپ نے دیہاتی کو کوئی تنبیہہ نہیں کی۔ آپ اس کو دیکھ کر مسکرائے اور پھر اس کو مال دینے کا حکم فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی تاجر سے کچھ قرض لیا تھا، وہ یہودی ایک روز آیا۔ اور نہایت برے انداز میں اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ اس نے نہ صرف آپ کے ساتھ سخت کلامی کی بلکہ یہ کہا کہ عبدالمطلب کے خاندان والے سب ایسے ہی نادہند ہوتے ہیں۔

حضرت عمر فاروق یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان کو غصہ آگیا۔ وہ یہودی کو ڈانٹنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو روکا اور کہا کہ اے عمر، میں اور یہ شخص تمہاری طرف سے دوسرے رویہ کے زیادہ مستحق تھے۔ تم مجھ کو جلد قرض ادا کرنے کا مشورہ دیتے اور اس آدمی کو نرم طریقہ سے تقاضا کرنے کو کہتے۔ اس وقت قرض کی ادائگی کی مدت میں ابھی تین دن

باقی تھے۔ پھر بھی آپ نے حضرت عمر کو حکم دیا کہ جاؤ، ان کا قرض ادا کر دو۔

ایک بار کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ مدینہ کی مسجد میں تھے جس کو مسجد نبوی کہا جاتا ہے۔ ایک دیہاتی شخص وہاں آیا۔ وہ مسجد کے ایک حصہ میں کھڑا ہو کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام نے دیکھا تو وہ سخت غصہ ہوئے اور اس آدمی کو مارنے کے لئے دوڑے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو منع کر دیا۔

آپ نے کہا کہ یہ ایک جاہل آدمی ہے۔ وہ مسجد کے آداب کو نہیں جانتا۔ تم اسے چھوڑ دو۔ البتہ جس مقام پر اس نے پیشاب کیا ہے وہاں پانی بہا کر اس کو پاک صاف کر دو۔ پھر آپ نے اپنے اصحاب کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: تمہارا کام لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنا ہے، لوگوں کو مشکل میں ڈالنا اور ان کے لئے دشواری پیدا کرنا تمہارا کام نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ لوگوں کی بدخواہی کے باوجود آپ ان کے خیر خواہ بنے رہے۔ آپ کے غصہ پر آپ کا تحمل ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ بڑی سے بڑی اشتعال انگیزی کے باوجود آپ کبھی مشتعل نہیں ہوتے تھے۔ لوگوں کی سخت کلامی کا جواب بھی آپ نرم الفاظ میں دیتے تھے۔ لوگ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھاتے مگر آپ ان کے حق میں ہمیشہ اچھی دعا کرتے۔

حضرت جریر بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جو آدمی نرمی کی صفت سے محروم ہو جائے وہ گویا سارے خیر سے محروم کر دیا گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق، آپ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فخر نہ کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہیں گے جن کے دلوں میں دوسرے انسانوں کے لئے رحم نہیں ہے۔ اور جو لوگ دوسرے انسانوں کے اوپر مہربانی نہیں کرتے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے رحم دلانہ کردار کا جو نمونہ پیش کیا وہ کوئی افسانوی کردار نہیں ہے بلکہ حقیقی کردار ہے۔ وہ تاریخ کا ایک ثابت شدہ واقعہ ہے۔ آپ کی زندگی کا

یہ پہلو آپ کے اسوہ حسنہ کو اتنا زیادہ بڑھا دیتا ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ آپ اعلیٰ اخلاق کا مثالی نمونہ بھی ہیں اور آخری نمونہ بھی۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

رسول اللہ کا حسن سلوک

مذہب کی اصل محبت ہے، خدا کے ساتھ بھی اور بندوں کے ساتھ بھی۔ انسان کے اندر سب سے اعلیٰ جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ اس جذبہ کو ایک آدمی ایک طرف خدا کے ساتھ اور دوسری طرف بندوں کے ساتھ خاص کر دے تو اسی کا نام مذہب ہوتا ہے۔ خدا کے ساتھ انسان کی محبت عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور بندوں کے ساتھ اس کی محبت اخلاق اور حسن سلوک کی صورت میں۔

اسلام میں اخلاقیات کو اتنی زیادہ اہمیت دی گئی ہے کہ حکم ہوا ہے کہ تم برتر اخلاق کو اختیار کرو۔ قرآن میں اس کو خُلق عظیم کہا گیا ہے۔ یعنی تم ایسے نہ بنو کہ دوسرا آدمی جب تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرے اس وقت تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو بلکہ تمہارا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ دوسرا آدمی برا سلوک کرے تب بھی تم اوپر اٹھ کر اس کے ساتھ اپنے اچھے سلوک جاری رکھو۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اخلاق کے اعتبار سے اچھا ہے (ان خیارکم احاسنکم اخلاقاً)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ رہو (خالق الناس بخُلقٍ حسنٍ) ایک قبیلہ نے اپنا آدمی مدینہ بھیجا کہ جاکر دیکھو کہ جو نئے پیغمبر ظاہر ہوئے ہیں وہ لوگوں کو کس بات کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ آدمی آیا اور آپ کے ساتھ کچھ دن رہ کر آپ کو دیکھا۔ پھر اپنے قبیلہ میں واپس جاکر لوگوں سے کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہ لوگوں کو اچھے اخلاق کی نصیحت کرتے ہیں (رأیتہ یأمر بمکارم الاخلاق)

پیغمبر اسلام پر غار حرا میں پہلی وحی آئی۔ آپ وہاں سے گھر آئے تو اس نئے تجربہ کی وجہ سے آپ کے اوپر دہشت طاری تھی۔ آپ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اس وقت آپ کی اہلیہ خدیجہ نے آپ سے کہا کہ آپ کو خدا ضائع نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ آپ غریبوں کی مدد کرتے ہیں اور یتیموں اور بیواؤں کے کام آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرنا آپ کی ایسی صفت ہے جو پیغمبر بننے سے پہلے آپ کی شخصیت کا امتیازی نشان بن چکی تھی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم غریبوں اور یتیموں کا اتنا زیادہ خیال کرتے تھے کہ آپ کی

پوری زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی غریب اور کمزور فرد آپ سے کسی قسم کی مدد چاہے اور آپ اس کی مدد نہ کریں۔ ایسے لوگوں کی عزت افزائی کے لئے آپ ہمیشہ ان کو اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ مسجد میں نماز کھڑی ہو رہی ہے۔ لوگ صف باندھ کر کھڑے ہو چکے ہیں۔ اتنے میں ایک غریب آدمی نے صف سے نکل کر کہا کہ میرا ایک کام تھا۔ کہیں میں اسے بھول جاؤں۔ اس لئے اگر آپ اجازت دیں تو میں جاؤں اور کام کر آؤں۔ آپ نے نماز روک دی۔ اس آدمی سے کہا کہ جاؤ۔ اپنا کام پورا کر کے آؤ۔ وہ آدمی جب کام پورا کر کے دوبارہ واپس آیا اس کے بعد آپ نے نماز شروع فرمائی۔ آپ کے اس مزاج کو مسدس حالی میں اس طرح نظم کیا گیا ہے :

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا　　مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

کمزور طبقات کے لئے آپ اتنا زیادہ نرم تھے کہ ان کی گستاخی کو نظرانداز کر کے ان کے ساتھ بہتر سلوک کرتے تھے۔ آپ کے رفیق انس بن مالک بتاتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ پر چل رہے تھے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ آپ اس وقت ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک غریب آدمی آیا۔ اس نے آپ کی چادر کا ایک سرا پکڑا۔ اس کو زور سے جھٹکا دیا اور کہا کہ تمہارے پاس جو مال ہے وہ تمہارا نہیں ہے۔ اس میں سے مجھے دو۔ اس غریب آدمی نے کھلی ہوئی گستاخی کی تھی۔ مگر آپ نے اس کو کچھ نہیں کہا بلکہ آپ مسکرا دئے اور حکم دیا کہ اس شخص کی ضرورت پوری کی جائے۔

ہمدردی اور محبت کے جذبہ کا سب سے بڑا امتحان اس وقت ہوتا ہے جبکہ دوسروں کی طرف سے دشمنی اور ایذا رسانی کا معاملہ کیا گیا ہو۔ مگر اسلام میں ایسے لوگوں کے ساتھ ردعمل کا سلوک کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ دشمن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔

پیغمبر اسلام کا وطن مکہ تھا۔ مکہ کے لوگوں نے آپ کے ساتھ اتنی دشمنی کی کہ آپ کو مکہ سے نکال دیا۔ اس کے بعد آپ تین سو میل دور جا کر مدینہ میں آباد ہو گئے۔ مگر مکہ والوں نے پھر بھی آپ کو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے آپ کے اوپر چڑھائی کی اور آپ پر مسلح حملہ کر کے آپ کو اور آپ کے مشن کو ختم کر دینا چاہا۔ مگر اللہ نے آپ کی مدد کی۔ اور آپ اپنے دشمنوں کے مقابلہ

میں کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جس مکہ سے آپ کو نکالا گیا تھا وہاں دوبارہ آپ فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے۔ اس وقت مکہ والے آپ کے سامنے لائے گئے۔ وہ لوگ نہ صرف دشمن تھے بلکہ جنگی مجرم کی حیثیت رکھتے تھے۔ عام رواج کے مطابق وہ اس قابل تھے کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ مگر آپ نے نہ ان کو گرفتار کیا۔ نہ کوئی سزا دی۔ حتی کہ زبان سے بھی ان کو برا بھلا نہیں کہا۔ بلکہ سادہ طور پر اعلان کر دیا کہ آج رحمت کا دن ہے۔ آج سب لوگوں کو آزاد کیا جاتا ہے۔

اسلام کی تاریخ میں ایک جنگ کو حنین کی جنگ کہا جاتا ہے۔ وہ اس طرح ہوئی کہ پیغمبر اسلام اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف جا رہے تھے۔ درمیان میں ایک قبیلہ کے لوگوں نے اچانک آپ پر حملہ کر دیا۔ آپ نے اپنے بچاؤ کے لئے جنگ کی۔ آخر کار آپ کو فتح حاصل ہوئی۔ جارح قبیلہ کے چھ ہزار آدمی گرفتار ہو کر آپ کے سامنے لائے گئے۔ ان سے بھی آپ نے کوئی انتقام نہیں لیا۔ بلکہ سب کو خوش اسلوبی کے ساتھ آزاد کر دیا۔

اسلام میں اخلاقی اصول سادہ طور پر محض ایک فلسفیانہ اصول نہیں ہے۔ بلکہ اس کی نہایت گہری بنیادیں ہیں۔ اس کی بنا پر اسلام میں اخلاقی سلوک صرف دوسروں کے ساتھ رعایت کا معاملہ نہیں رہتا۔ بلکہ وہ خود صاحب معاملہ کی اپنی ضرورت بن جاتا ہے۔ اسلام کے مطابق، موجودہ دنیا دار الامتحان ہے۔ یہاں آدمی کی پوری زندگی امتحان اور آزمائش کی زندگی ہے، یہ امتحان سب سے زیادہ جس چیز میں لیا جاتا ہے وہ معاملات ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ دین معاملہ کا نام ہے (الدین المعاملة)

ہر آدمی کے اوپر خدا کی نگرانی قائم ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ کوئی شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ اس اعتبار سے غریبوں اور یتیموں اور کمزور لوگوں کی خاص اہمیت ہے۔ غریب آدمی اپنی غربت کی وجہ سے لوگوں کی نظر میں غیر اہم بن جاتا ہے۔ لوگ ایسے آدمی کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ اچھا اخلاق برتنے کے لئے خصوصی کوشش درکار ہوتی ہے۔ اسی لئے ایسے لوگوں کے ساتھ اچھا اخلاق برتنے کا ثواب بھی

بہت بڑھ جاتا ہے۔

اسلام کے مطابق، کسی آدمی کی اصل جانچ غریبوں اور کمزوروں ہی کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں اپنی زندگی سے نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ جو شخص جتنا زیادہ غریب اور کمزور ہوتا، آپ ہمیشہ اتنا ہی زیادہ اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ فرماتے۔ اسی طرح دشمن کے معاملہ میں لوگوں کے اندر انتقام کا جذبہ آجاتا ہے اور اس بنا پر اس کے ساتھ حسن سلوک کرنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور اپنے عمل سے بتایا کہ دشمن سے بھی دوست جیسا سلوک کرو۔ دوست سے دوست جیسا سلوک کرنے میں اگر ایک درجہ کا ثواب ہے، تو دشمن سے دوست جیسا سلوک کرنے میں سو درجہ کا ثواب۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۸ جولائی ۱۹۹۶ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

باب دوم

روزہ کے بارہ میں

آل انڈیا ریڈیو (نئی دہلی) نے ۱۹ اگست ۱۹۷۸ کی شام کو ساڑھے نو بجے ایک پروگرام رکھا۔ اس کا عنوان تھا "روزہ کیا ہے"۔ یہ آدھ گھنٹہ کی ایک ریڈیائی بات چیت تھی جس میں تین مذاہب کے نمائندوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق روزہ کے تصورات بیان کریں۔

راقم الحروف نے اسلام کی نمائندگی کی۔ بقیہ دو صاحبان حسب ذیل تھے:

پنڈت سچیدانند شاستری (ہندو دھرم)

آرک بشپ ناصر (عیسائیت)

راقم الحروف کو اس ریڈیائی بات چیت کا کوآرڈینیٹر بنایا گیا تھا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے مذہب کی روشنی میں بتایا کہ اس کے نزدیک روزہ کیا ہے اور وہ اس کے مذہب میں کس لئے اور کس شکل میں فرض کیا گیا ہے۔

روزہ، جس کو عربی میں صوم، ہندی میں برت اور انگریزی میں فاسٹنگ کہتے ہیں، ہر مذہب میں کسی نہ کسی طور پر پایا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی مدت اور اس کی شکل میں ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان اختلاف ہے مگر وہ ایک یا دوسری صورت میں ہر جگہ موجود ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ نفس کو کنٹرول میں لانے کی تربیت ہے اور نفس پر کنٹرول (یا نفس کشی) کو ہر مذہب میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذہب جس قسم کے انسان بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کا نفس اس کی عقل کے قبضہ میں ہو اور روزہ آدمی کو اسی کے لئے تیار کرتا ہے۔

آدمی دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ جسم اور روح۔ جسم مادی اور کثیف ہے۔ روح غیر مادی اور لطیف۔ اگر ہم جسم کی ہر خواہش کو بے روک ٹوک پورا کرتے رہیں تو جسم زور آور بن جائے گا اور وہ روح کے اوپر غالب آجائے گا۔ روزہ اسی آزادی پر پابندی لگانے کا دوسرا نام ہے۔ روزہ آدمی کے جسم کو ایک حد کے اندر رکھ کر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ اس کی روح اس کے جسم کے

اوپر حکمرانی کرے۔ اس کا لطیف وجود اس کے کثیف وجود کو اپنے قبضہ میں رکھے۔

دونوں صاحبان نے اسی بات کو اپنے اپنے انداز اور اپنے اپنے لفظوں میں بیان کیا۔

راقم الحروف نے جو بات کہی وہ یہ تھی کہ روزہ محض اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ آدمی صبح سے شام تک کھانا پینا بند رکھے تو روزہ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ ظاہری صورت دراصل ایک علامت ہے اور اس کے ذریعہ ایک خاص روحانی اور اخلاقی تربیت دینا مقصود ہے۔

وہ سبق یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کو چاہئے کہ وہ صحیح اور غلط اور جائز اور ناجائز میں فرق کرے۔ وہ صحیح اور جائز کو لے لے اور غلط اور ناجائز سے اپنے آپ کو بچائے۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کی آخرت میں آنے والی مستقل زندگی کو کامیاب بناتی ہے۔

یہ روزہ دراصل زندگی کا ایک گہرا اصول ہے۔ دنیا میں ایک تاجر اپنے کو فضول خرچی سے بچاتا ہے۔ ایک طالب علم اپنے اوقات کو بیکار ضائع کرنے سے بچاتا ہے۔ ایک مزدور اپنے آپ کو کاہلی اور بددیانتی سے بچاتا ہے۔ اس طرح بچ بچاؤ کی زندگی گزارنے ہی کا نام موجودہ دنیا کی کامیابی ہے۔ کاہلی، فضول خرچی، عیاشی، ضیاع وقت سے آدمی اپنے آپ کو نہ بچائے تو وہ کسی طرح امتحان کی اس دنیا میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت کا بھی ہے۔ اسلام کے نزدیک آخرت کی کامیابی کا راز "روزہ دار زندگی" ہے۔ آدمی کو اپنی اگلی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ کرنا ہے کہ وہ موت سے پہلے والی زندگی میں متقیانہ روش اختیار کرے۔ وہ کچھ چیزوں سے اپنے آپ کو بچا کر رکھے۔

آخرت کو برباد کرنے والی چیزوں سے بچنا اور ان کو چھوڑ کر حلال دائرہ میں زندگی گزارنا، یہی وہ سبق ہے جس کو دینے کے لئے روزہ فرض کیا گیا ہے۔

پھر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو شخص دن بھر روزہ رکھتا ہے، اس کو شام کے وقت کھانے کی لذت ملتی ہے۔ اسی طرح جو شخص دنیا میں خدا کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچے گا وہی آخرت میں زندگی کی حقیقی لذتوں کو پائے گا ——— دن کا روزہ اگر موجودہ دنیا کی مشقتوں کی علامت ہے تو شام کا کھانا آخرت کی راحتوں کی علامت۔

روزہ کیا ہے

روزہ کیا ہے۔ روزہ اپنے آپ پر قابو پانے کی تربیت ہے۔ وہ سلف کنٹرول کی مشق ہے۔ سلف کنٹرول کی اس مشق کے لیے ایک ایسی چیز کو چنا گیا ہے جو انسان کی تمام ضرورتوں میں سب سے زیادہ اہم ضرورت ہے۔ یعنی کھانا اور پانی۔ رمضان کے مہینہ میں ۳۰ دن تک صبح سے شام تک کا کھانا اور پانی چھڑایا جاتا ہے تاکہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو کہ وہ چاہنے کے باوجود کسی چیز کو چھوڑ سکے۔ تاکہ وہ دنیا میں اس طرح رہے کہ جب وہ یہاں کسی چیز کو لے تو اصول کی بنیاد پر لے، اور جب کسی چیز کو چھوڑے تو اس کو بھی اصول کی بنیاد پر چھوڑے۔ اس کی چاہت اس کے شعوری فیصلہ کے تحت ہو نہ کہ شعوری فیصلہ سے آزاد۔

روزہ کے مہینہ میں کھانا اور پانی کا ترک حقیقۃً ایک علامتی ترک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خاص اوقات میں ایک خاص مدت تک بس کھانا اور پینا چھوڑ دینے سے روزہ کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد آدمی آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ نہیں۔ بلکہ روزہ میں کھانے اور پینے کا علامتی ترک زیادہ وسیع ترک کا آغاز ہے۔ روزہ کے مہینہ میں ایک چیز کو چھوڑنے کی تربیت دے کر آدمی کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ بقیہ مہینوں میں وہ زیادہ وسیع پیمانہ پر تمام غیر مطلوب چیزوں کو چھوڑ دے۔

آدمی ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ اس دنیا میں مختلف قسم کے مردوں اور عورتوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ ان سماجی تعلقات کے دوران طرح طرح کے ناموافق حالات پیش آتے ہیں۔ یہ حالات آدمی کے اندر اشتعال اور ردعمل کی نفسیات ابھارتے ہیں۔

ایسے اوقات میں آدمی کیا کرے اور کیا نہ کرے، اسی کو بتانے کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے۔ روزہ کا سبق یہ ہے کہ آدمی ایسے مواقع پر سلف کنٹرول کا طریقہ اختیار کرے۔ جب کبھی اس کے دل میں دوسروں کے خلاف غصہ آئے یا دوسروں کے خلاف اشتعال پیدا ہو تو وہ ایسے جذبات کو روکے، وہ ایسے جذبات کو اپنے اندر ہی اندر دبا لے۔ ایسے مواقع پر وہ اپنے مشتعل جذبات کو روکنے والا بنے نہ کہ ان کو ظاہر کر دینے والا۔

اسی طرح آدمی کے اندر طرح طرح کے جذبات ہیں۔ مثلاً حرص، طمع، حسد، گھمنڈ، فخر، خودغرضی وغیرہ۔ یہ جذبات بجائے خود برے نہیں ہیں۔ کیوں کہ یہی جذبات ہیں جو آدمی کے اندر حرکت اور عمل پیدا کرتے ہیں۔ ان جذبات کو اگر جائز حدود کے اندر استعمال کیا جائے تو وہ مفید ہیں۔ اور اگر جائز حدود کی پروا کیے بغیر ان جذبات کو بے قید طور پر استعمال کیا جانے لگے تو وہ سماج کے لیے مصیبت بن جاتے ہیں۔

روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی ان جذبات کو ان کی حد کے اندر رکھے۔ وہ اپنے ان جذبات کو ان کی واقعی حد کے اندر استعمال کرے۔ وہ اپنے ان جذبات کے استعمال کی ایک حد مقرر کرے۔ وہ حد یہ ہے کہ یہ جذبات جب تک اپنے جائز مفاد کے لیے استعمال ہوں تو ان کا استعمال ٹھیک ہے۔ اور جب وہ اپنے جائز مفاد سے گزر کر دوسروں کو نقصان پہنچانے والے بن جائیں تو وہاں آدمی اپنے ان جذبات کو روک لے۔

روزہ کو حدیث میں صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ پابند زندگی گزارنے کی مشق ہے۔ روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اس دنیا میں با اصول زندگی گزارے۔ وہ بے قید اور بے اصول زندگی گزارنے سے پرہیز کرے۔ رمضان کے مہینہ میں تربیتی روزہ رکھنا ہے اور بقیہ مہینوں میں اسی تربیت کے مطابق زندگی گزارنا۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص روزہ رکھ کر کھانا اور پینا چھوڑے مگر وہ جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا ظاہر تو کھانا اور پینا چھوڑنا ہے۔ مگر روزہ کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ آدمی جھوٹی باتوں کو اور دوسرے برے اعمال کو چھوڑ دے۔ روزہ دراصل برائیوں کو چھوڑنے کی تربیت ہے۔ کسی روزہ دار میں اگر روزہ کا ظاہری پہلو ہو مگر اس میں روزہ کا اندرونی اور اخلاقی پہلو نہ پایا جائے تو ایسے آدمی کا روزہ اسلام میں معتبر نہیں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۱ فروری ۱۹۹۳ کو نشر کیا گیا۔

رمضان کا روزہ

رمضان کے روزہ کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ روزہ تمہارے اوپر اس لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو (لعلکم تتقون ، البقرۃ ۱۸۲)
تقویٰ کا مطلب بچنا ہے۔ ایک خاردار راستہ ہو اور آپ اس سے بچتے ہوئے گزریں تو یہ تقویٰ ہوگا۔ مومن کو دنیا میں اسی طرح بری چیزوں سے بچتے ہوئے اپنا سفر حیات طے کرنا ہے۔ اسی پرہیزگارانہ روش کا نام تقویٰ ہے۔ اور رمضان کا مہینہ اسی تقویٰ کی ماہانہ تربیت کا مہینہ ہے۔

روزہ میں کھانا اور پانی چھوڑنا ایک علامتی ترک ہے۔ اصل میں جو چیز ترک کرنا ہے وہ تو خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔ غیر ممنوعات کا وقتی ترک اسی ممنوعات کے مستقل ترک کی مشق ہے۔ کیوں کہ جو آدمی اللہ کے لئے غیر ممنوع کو چھوڑنے پر راضی ہو جائے وہ ممنوع کو بدرجۂ اولیٰ چھوڑنے پر راضی ہو جائے گا۔

اس دنیا میں آدمی کا جو امتحان ہے وہ یہی ہے کہ وہ حرام اور حلال میں فرق کرے۔ وہ حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا بنے۔ وہ آزاد زندگی کے بجائے پابند زندگی گزارے۔ اسی ذمہ دارانہ زندگی کی تربیت کے لئے روزہ کا طریقہ اہل ایمان کے اوپر فرض کیا گیا ہے۔

روزہ محض اپنی ظاہری صورت کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ اپنی حقیقی اسپرٹ کے اعتبار سے مطلوب ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ جس آدمی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پانی چھوڑ دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے ایسا کیا کہ انھوں نے کھانے پینے کا روزہ رکھا۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے غیبت کا فعل کیا جو اسلام میں حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ انھوں نے اللہ کی جائز کی ہوئی چیز سے روزہ رکھا، اور پھر اللہ کی ناجائز کی ہوئی چیز سے افطار کر لیا۔

متقیانہ زندگی کو دوسرے لفظوں میں محتاط زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جو

احتیاط کے تصور سے خالی ہو۔ وہ بلاقید جو چاہے بولے اور جو چاہے کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو احتیاط کے طریقہ کو اختیار کئے ہوئے ہو۔ وہ ایک محکم اصول کے تحت کسی روش کو اختیار کرے، اور کسی دوسری روش کو اختیار نہ کرے۔ یہی معاملہ متقی انسان کا ہے۔ متقی انسان مکمل طور پر ایک محتاط انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول وعمل کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔

روزہ آدمی کے اندر تقویٰ اور احتیاط کا یہی مزاج پیدا کرتا ہے۔ رمضان کی ماہانہ تربیت آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ پورے سال تک اس طرح زندگی گزارے کہ وہ مباحات کے لئے مُفطِر ہو، اور ممنوعات کے لئے وہ صائم بن جائے۔

روزہ کے دوران آدمی کا صرف کھانا پینا نہیں چھوٹتا۔ اس کو اپنی بہت سی عادتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ اپنی خواہشوں پر روک لگاتا ہے۔ اس طرح وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ کچھ چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ وہ کچھ چیزوں سے بچ کر دنیا میں زندگی گزارے روزہ اس پرہیزگاری کی انتہائی تربیت ہے۔ روزہ رکھ کر آدمی یہ عہد کرتا ہے کہ ناجائز چیزیں تو درکنار، اگر اللہ کی مرضی ہو تو وہ جائز چیزوں کو بھی اللہ کی خاطر چھوڑ دینے کے لئے تیار ہے۔

رمضان کا مہینہ قمری کیلنڈر کا نواں مہینہ ہے۔ اس مہینہ کو اسلام میں روزہ کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ رمضان کے مہینے کا روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ اور اس کی بہت فضیلت بتائی گئی ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے ہر نیک عمل کا اجر دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ مگر روزہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ خاص میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا انعام دوں گا۔ بندہ میرے لئے اپنی خواہش کو اور اپنے کھانے کو چھوڑتا ہے۔ روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت، اور دوسری خوشی اس وقت جب کہ وہ اپنے رب سے ملے گا۔ اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ اچھی ہے۔ اور روزہ ڈھال ہے۔ جب تم میں سے کسی شخص کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ گالی دے اور نہ شور کرے۔ اور اگر کوئی آدمی اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ کہہ دے: میں تو روزہ دار ہوں۔

رمضان کے مہینہ کو ایک حدیث میں صبر کا مہینہ (شھر الصبر) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کا اتنا بڑا درجہ کیوں ہے کہ اس پر بے حساب اجر کی خوش خبری دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ صبر کی عبادت ہے۔ روزہ صبر کا عمل ہے۔ روزہ میں کھانا اور پینا چھوڑ کر آدمی علامتی طور پر یہ عہد کرتا ہے کہ دنیا میں وہ صبر کا طریقہ اختیار کرے گا۔ وہ ہر حال میں اللہ کے حکموں پر عمل کرے گا، خواہ اس کے لئے اسے صبر و برداشت کے مرحلہ سے گزرنا پڑے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے صبر کرنے والے بے حساب اجر پائیں گے (انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب، الزمر ۱۰) یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام اعمال میں صبر کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ جس خدائی حکم کو انجام دینے کے لئے آدمی کو صبر کے مرحلہ سے گزرنا پڑے، وہ عمل اللہ کی نظر میں اتنا زیادہ محبوب ہو جاتا ہے کہ اس پر بے حساب انعام کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

روزہ کی خاص اہمیت اسی اعتبار سے ہے۔ روزہ دراصل صبر کی تربیت ہے۔ روزہ کی عبادت آدمی کو اس بات کے لئے تیار کرتی ہے کہ وہ اپنی خواہش کو دبا کر اللہ کے حکم پر عمل کرے۔ وہ اپنی ضرورتوں کو روک کر اللہ کی راہ میں چلے۔ وہ اپنے ذاتی تقاضوں کو نظر انداز کرکے اللہ کے دین کے تقاضے پورے کرے۔ روزہ چوں کہ صبر جیسی عظیم عبادت کی تربیت ہے، اس لئے روزہ کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

روزہ کے اسی خاص پہلو کی بنا پر حدیث میں فرمایا گیا کہ روزہ دار کو چاہئے کہ اگر کوئی آدمی اس کو برا کہے تو وہ خود بھی اس کو برا نہ کہنے لگے۔ بلکہ اس کے اندر یہ احساس جاگنا چاہئے کہ میں تو روزہ رکھے ہوئے ہوں۔ میں نے تو اپنے آپ کو صبر اور برداشت کے تربیتی کورس میں داخل کر رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اگر میں بے برداشت ہو کر جوابی کارروائی کروں تو گویا کہ میں نے اپنا روزہ توڑ دیا، میں نے روزہ کے اصل مقصد کو باطل کر دیا۔

روزہ کا بلاشبہ بہت بڑا ثواب ہے۔ مگر یہ بڑا ثواب اس شخص کے لئے ہے جس کا روزہ صبر کا روزہ بن جائے۔ جو روزے سے یہ سبق لے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مجھے ناخوشگوار باتوں کو برداشت کرنا ہے۔ لوگوں کے کڑوے بول کا جواب مجھے میٹھے بول سے دینا ہے۔

لوگوں کی طرف سے اشتعال انگیزی کے واقعات ہوں تب بھی مجھے اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے بچانا ہے۔ لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو اللہ کے خانہ میں ڈالتے ہوئے مجھے ہر ایک کے ساتھ ہر حال میں اچھا سلوک کرنا ہے۔

خدا کے حکم کی ایک تعمیل وہ ہے جو معمول کے حالات میں کی جائے۔ اس کی دوسری تعمیل وہ ہے جو غیر معمولی حالات میں کی جائے۔ معمول کے حالات کے مقابلہ میں غیر معمولی حالات میں کیا ہوا عمل ہمیشہ زیادہ عظیم ہوتا ہے۔ صبر یہی عظیم عمل ہے، اور روزہ اسی عظیم عمل کے لئے ایک ماہانہ تربیتی کورس۔

گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو خدا کا دین پورا کا پورا صبر کا دین ہے۔ پورا قرآن صبر کی کتاب ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات میں کسی نہ کسی اعتبار سے صبر کا پہلو شامل ہے۔

موجودہ دنیا میں اسلامی زندگی اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ غیر اسلامی زندگی کو چھوڑے گا اور اسلامی اصولوں پر اپنی زندگی کو چلائے گا۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس لئے یہاں ہر معاملہ میں آدمی کے سامنے دو امکانات ہوتے ہیں۔ کوئی شخص جب دینی زندگی اختیار کرتا ہے تو وہ درحقیقت ایک روش کو چھوڑ کر دوسری روش کو اختیار کرتا ہے۔ یہ ایک کو چھوڑنا اور دوسرے کو پکڑنا صبر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ہر اسلامی عمل میں صبر کا پہلو لازمی طور پر شامل ہوجاتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو شیطان کے راستہ سے ہٹ کر خدا کے راستہ پر چلنا ہے۔ اس کو نفس پرستی کی روش چھوڑ کر بے نفسی کی روش کو اختیار کرنا ہے۔ اس کو بے اصول زندگی کو ترک کرکے بااصول زندگی کو اپنانا ہے۔ اس کو بے قید طریقہ سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور پابند طریقہ پر قائم رہ کر زندگی گزارنا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرنے میں اس کو حرام کی ہوئی چیزوں سے دور رہنا ہے اور صرف حلال دائرہ میں لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔

ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو پکڑنے کے اس عمل کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔ روزہ کی اہمیت یہ ہے کہ وہ آدمی کے اندر یہی صبر والی صفت پیدا کرتا ہے۔

نوٹ: یہ تقریر ۷ افروری ۱۹۹۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

روزہ : اخلاقی ڈسپلن

روزہ ایک عبادت ہے۔اسی کے ساتھ وہ اخلاقی ڈسپلن کی تربیت ہے۔روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے ساتھ لوگوں کے درمیان زندگی گزارے۔لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک ذمہ دارانہ سلوک ہو نہ کہ بے قید سلوک۔روزہ بتاتا ہے کہ تم اپنی آزادی کو محدود طور پر استعمال کرو نہ کہ لامحدود طور پر۔روزہ خود عائد کردہ پابندی (self-restraint) کا سبق ہے۔یہ خود عائد کردہ پابند زندگی ہی تمام اصلاحات کی جان ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے۔پس جب تم میں سے کسی کے روزہ کا دن ہو تو وہ نہ فحش گوئی کرے اور نہ شور کرے۔اور اگر کوئی شخص اس کو گالی دے یا اس سے لڑائی کرے تو وہ کہہ دے کہ میں تو روزہ دار ہوں :

والصیامُ جُنّة ۔ فإذا کان یومُ صومِ احدِکم فلا یرفُث ولا یَصخَب۔
فإن سابَّه احدٌ او قاتَلَه فلیقُل إنّی صائمٌ (متفق علیہ)

روزہ بظاہر کھانا اور پانی چھوڑنے کا نام ہے۔مگر اسی کے ساتھ اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے۔روزہ جس طرح آدمی سے یہ کہتا ہے کہ تم کھانا اور پینا چھوڑ دو، اسی طرح روزہ اس سے یہ بھی کہتا ہے کہ اگر تم سچے روزہ دار ہو تو تم کو چاہیے کہ تم گندی بات منہ سے نہ نکالو۔تم شور وغل نہ کرو۔حتی کہ اگر کوئی شخص تم کو گالی دینے لگے تب بھی تم اس کے جواب میں گالی نہ دو بلکہ یک طرفہ طور پر اس کو نظر انداز کر دو۔

یہ حدیث روزہ کی اسپرٹ کو بتاتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں کھانے پینے کا ترک ایک علامتی ترک ہے۔کھانے کا وقتی روزہ ایک اور مستقل روزہ کی تربیت ہے۔یہ جزئی روزہ داری کے ذریعہ ایک وسیع تر روزہ داری کے لیے آدمی کو تیار کرنا ہے۔

اسلامی زندگی حقیقۃً ایک روزہ دارانہ زندگی ہے۔اسلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا میں بے قید بن کر نہ رہے۔بلکہ وہ حرام وحلال میں فرق کرے۔وہ میٹھا بول بولے اور کڑوا بول نہ بولے۔وہ لوگوں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے اور بے انصافی والے سلوک سے اپنے آپ کو بچائے۔وہ لوگوں کے حقوق ادا کرے اور حق تلفی سے اپنے آپ کو دور رکھے۔روزہ گویا ایک سالانہ کورس

ہے جس کے ذریعہ آدمی کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ وہ سماج میں دوسروں کے ساتھ اخلاقی ڈسپلن کے ساتھ رہ سکے۔

اخلاقی ڈسپلن کی زندگی یک طرفہ برداشت کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ دوسروں کی طرف سے ناخوش گوار تجربہ پیش آنے کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ دوسروں کی زیادتی کو بھلا کر آپ ان سے معتدل انداز میں معاملہ کرسکیں۔ یہ ایک کڑی آزمائش ہے اس لیے آدمی کو رمضان میں کھانے پینے جیسی ناگزیر ضرورت کے معاملہ میں برداشت کی روش پر چلایا جاتا ہے۔ کیوں کہ جو شخص زیادہ بڑی چیز کو برداشت کرلے اس کے لیے چھوٹی چیز کو برداشت کرنا آسان ہو جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے کھونٹی کے ساتھ رسّی میں بندھا ہوا گھوڑا۔ وہ گھومتا ہے پھر وہ کھونٹی کی طرف واپس آجاتا ہے۔ روزہ بھی گویا اسی قسم کا ایک روک ہے۔ آپ روزہ رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ایک شخص آپ کو کوئی بری بات کہہ دیتا ہے، آپ کو غصہ آجاتا ہے۔ مگر فوراً ہی پیاس کی وجہ سے سوکھا ہوا حلق آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ روزہ سے ہیں۔ آپ اپنے غصہ کو ضبط کرلیتے ہیں۔ اور کڑوا بول بولنے والے کو نرم انداز سے جواب دے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایک شخص آپ کو جسمانی تکلیف پہنچاتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس کو تکلیف پہنچا کر اس سے انتقام لیں۔ عین اسی وقت بھوک کی وجہ سے نڈھال جسم آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ نے خدا کے لیے روزہ رکھا ہے۔ اس کے بعد آپ کے ہاتھ اور پاؤں رک جاتے ہیں۔ جس آدمی سے آپ انتقام لینا چاہتے تھے اس کے لیے دعا کر کے بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں۔

شیطان مختلف مواقع پر آپ کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت روزہ آپ کا مددگار بن جاتا ہے۔ روزہ کی تربیت اور روزہ کی عبادت سے آپ کے دل میں جو نرمی اور روح میں جو صفائی پیدا ہوتی ہے وہ آپ کے لیے شیطان کے حملوں کے مقابلہ میں ڈھال کا کام کرتی ہے۔ اور آپ کو شیطان کے فتنہ کا شکار ہونے سے بچالیتی ہے۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (نیشنل چینل) سے ۴ مارچ ۱۹۹۴ کو نشر کی گئی۔

جمعہ اور رمضان

جمعۃ الوداع کے معنی ہیں رخصت کا دن، آخری جمعہ۔ رمضان کے مہینہ کے آخری جمعہ کو جمعۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اسلام کے عبادتی نظام میں جمعہ خصوصی اہمیت کا دن ہے۔ اسی طرح اسلام میں رمضان کو خصوصی اہمیت کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ جمعۃ الوداع چونکہ رمضان کے مہینہ کا آخری جمعہ ہوتا ہے اس لئے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ تمہارے دنوں میں سب سے زیادہ افضل دن جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ کے دن لوگ زیادہ بڑی تعداد میں اکٹھا ہو کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اجتماعی نماز ادا کرتے ہیں اور دوسری خیر والی سرگرمیاں کرتے ہیں۔ رمضان کے مہینہ میں جو فضا تیار ہوتی ہے اس کی وجہ سے جمعۃ الوداع کی اہمیت عام جمعہ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

رمضان کے مہینہ کا آغاز نیا چاند دیکھنے سے ہوتا ہے۔ شعبان کے مہینہ کی آخری رات کو جب لوگ رمضان کا نیا چاند دیکھتے ہیں تو ان کی زبان پر یہ دعا آجاتی ہے کہ اے اللہ، اس چاند کو ہمارے اوپر امن اور امان کے ساتھ نکال۔ اور اس کو سلامتی اور اسلام کا چاند بنا دے۔ اس طرح کے اعلیٰ انسانی جذبات کے ساتھ لوگ رمضان کے مہینہ میں داخل ہوتے ہیں۔

رمضان کے مہینہ میں صبح سے شام تک ہر آدمی کھانا اور پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک طرف اللہ کے حکم کی تابعداری کا مزاج اپنے اندر بناتا ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس بات کا تجربہ کرتا ہے کہ بھوک کیا چیز ہے۔ یہ تجربہ اس کے اندر غریبوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں عبادتی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ قرآن کی تلاوت، اللہ کا ذکر اور تراویح کی سنتیں وغیرہ سے مہینہ بھر عبادتی ماحول قائم رہتا ہے۔

رمضان کی پہلی تاریخ سے اس طرح کی سرگرمیاں معاشرہ میں جاری ہو جاتی ھیں۔ یہاں تک کہ مہینہ کے چوتھے ہفتہ میں وہ جمعہ آتا ہے جس کو جمعۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ رمضان کی

ان برکتوں سے گزر کر جب لوگ جمعۃ الوداع کی نماز کے لئے مسجدوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو ان کے اندر ایک نیا دینی احساس جاگ رہا ہوتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مساوات اور خیر خواہی اور اخوت کے جذبات سے سرشار ہوتے ہیں۔ ان اسباب سے جمعۃ الوداع کی نماز عام نمازوں سے زیادہ موثر نماز بن جاتی ہے۔

جمعہ کے دن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ اس میں ایک ساعت ایسی ہے کہ اس وقت جو شخص اللہ سے دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعہ کے دن نمازی عام دنوں سے زیادہ جذبات وکیفیات سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے جمعہ کے دن اس کی دعا بھی عام دنوں سے زیادہ گہری کیفیات کے ساتھ نکلتی ہے اور جو دعا گہری ربانی کیفیات کے ساتھ آدمی کے دل سے نکلے وہ ضرور قبول کر لی جاتی ہے۔

جمعہ کے دن آدمی نہا کر صاف کپڑے پہنتا ہے۔ وہ وضو کرتا ہے پھر وہ سرگرمی کے ساتھ گھر سے چل کر مسجد میں پہنچتا ہے۔ وہاں وہ سنتیں ادا کر کے سکون کے ساتھ بیٹھتا ہے تا کہ امام کی زبان سے خطبہ کا وعظ سن سکے۔ یہ ساری چیزیں اگر سچے جذبہ کے ساتھ کی جائیں تو وہ بہت زیادہ ثواب کا باعث ہوتی ہیں، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

وہ تمام چیزیں جو جمعہ کی اسپرٹ کے خلاف ہیں ان سے اسلام میں سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں نصیحت کی گئی ہے اور حدیث میں بھی۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ جب نماز کے لئے لوگ مسجد میں جمع ہوں تو اس وقت کسی غیر متعلق مشغولیت کی طرف دھیان نہیں جانا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک بار نماز کے دوران کچھ لوگ خرید وفروخت جیسے کاموں میں مشغول ہو گئے تو قرآن میں اس کے خلاف سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی۔ اور کہا گیا کہ نماز کے دوران ہر قسم کی غیر متعلق مشغولیت سے دور رہنا چاہئے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ایسا کرے کہ وہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد لوگوں کی گردنیں پھاندتے ہوئے اگلی صف میں جانے کی کوشش کرے تو وہ بہت گناہ کا کام کرتا ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد جہاں جگہ پائیں وہیں بیٹھ جائیں۔ کوئی نمازی دوسرے

نمازیوں کو ہرگز تکلیف نہ دے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے کہ امام جب خطبہ دے رہا ہو تو چپ ہو کر دھیان کے ساتھ اس کو سنا جائے۔ خطبہ کے وقت اگر کوئی شخص بول پڑے تو دوسرے شخص کو اس کو چپ کرانے کے لئے دوبارہ بولنا نہیں چاہئے بلکہ اشارہ کے ساتھ اس کو چپ کرانا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کوئی غلطی کر بیٹھے تو دوسرے شخص کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے نہ کہ وہ بھی وہی کرنے لگے۔

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس فعل کا نتیجہ مفید نہ نکلے وہ بہرحال غلط ہے۔ خواہ وہ فعل بظاہر غلط نہ دکھائی دے۔ خواہ اس کو اچھی نیت کے ساتھ کیوں نہ کیا گیا ہو۔ مزید یہ کہ بولنا ہی کام نہیں ہے بلکہ چپ رہنا بھی کام ہے۔ بعض اوقات چپ رہنا زیادہ ضروری ہوتا ہے اور بولنا ایک غیر مطلوب فعل بن جاتا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھاتے تو آپ کا خطبہ بھی معتدل ہوتا اور آپ کی نماز بھی معتدل ہوتی۔ دونوں میں سے کسی چیز کو بھی آپ لمبا نہ کرتے۔ یہ اجتماعی عمل کے لئے اہم اسلامی ہدایت ہے۔ اجتماعی عمل میں امام کو چاہئے کہ وہ دوسروں کی رعایت کرے۔ وہ اس کو لمبا کر کے لوگوں کو امتحان میں نہ ڈالے۔ البتہ ذاتی عمل کے وقت آدمی کثرت پر عمل کرے تو کوئی ہرج نہیں۔

جمعہ کا دن ہفتہ بھر کے لئے اور جمعۃ الوداع سال بھر کے لئے خصوصی تربیت کا دن ہے۔ اس دن ہر آدمی کو صاف ستھرا رہنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیر خواہ بن کر رہنا سکھایا جاتا ہے۔ اس دن نظم وضبط کی تربیت دی جاتی ہے۔ اللہ کے ذکر سے آشنا کرایا جاتا ہے۔ اتحاد اور اجتماعیت کی مشق کرائی جاتی ہے۔ دوسرے کے دکھ میں شریک ہونے کی صلاحیت ابھاری جاتی ہے۔ وغیرہ

جمعہ کا دن ان چیزوں کو مشترک طور پر سیکھنے کا دن ہے جس کو دوسرے دنوں میں آدمی غیر مشترک طور پر سیکھتا ہے۔ جمعہ کا دن اس عمل کو مل کر کرنے کا دن ہے جس کو وہ دوسرے دنوں میں اکیلے اکیلے کرتا ہے۔ دوسرے دن اگر انفرادیت کے دن ہیں تو جمعہ کا دن اجتماعیت کا دن۔

نوٹ: ۱۹ مارچ ۱۹۹۳ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیا گیا۔

جمعۃ الوداع

رمضان کے مہینہ کے آخری جمعہ کو جمعۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ جمعہ کا دن اسلام میں خصوصی اہمیت کا دن ہے، اور رمضان کا مہینہ خصوصی اہمیت کا مہینہ، اس طرح جمعۃ الوداع گویا رمضان اور جمعہ دونوں کی خصوصیات کی یکجائی کا مہینہ ہے۔ اس دن مسلمانوں میں قدرتی طور پر زیادہ دینی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جمعۃ الوداع کا دن، عام دنوں سے زیادہ رحمتوں اور برکتوں کا دن بن جاتا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں عبادت کا ثواب عام مہینوں سے زیادہ ہے۔ اسی طرح جمعہ کے دن عبادت کا ثواب عام دنوں سے زیادہ ہے۔ اس لئے جمعۃ الوداع آتا ہے تو مسلمان زیادہ بڑھے ہوئے ذوق و شوق کے ساتھ عبادات انجام دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہوتا ہے کہ آج کے دن انھیں اپنے عمل کا زیادہ ثواب ملے گا۔

جمعۃ الوداع کے دن زیادہ سے زیادہ لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ حتی کہ وہ بچے بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں جن کے اوپر روزہ ابھی فرض نہیں ہوا۔ اس دن عام دنوں سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے۔ عام دنوں سے زیادہ لوگوں کو صدقہ کیا جاتا ہے۔ عام دنوں سے زیادہ نیکی کا کام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جمعۃ الوداع کے دن تمام مسجدیں آخری حد تک بھری ہوتی ہیں۔ کیوں کہ اس دن نمازیوں کی تعداد عام دنوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔

جمعۃ الوداع اصلاً عبادت کا دن ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ سماجی قدروں کے فروغ کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ ملنا جلنا بڑھنے سے باہمی تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مسجدوں میں بڑی بڑی جماعتوں کے قیام سے لوگوں کے ایمان اور یقین میں ترقی ہوتی ہے۔ صدقات کی کثرت سے باہمی خیر خواہی کی فضا بنانے میں مدد ملتی ہے۔ غسل اور صفائی اور نئے کپڑوں کے اہتمام سے عمومی طور پر صحت و صفائی کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

جمعۃ الوداع کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دن روزہ رکھ کر جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے اندر خصوصی روحانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ روزہ کی وجہ سے پہلے ہی سے وہ لوگ مادیات سے اوپر اٹھ کر روحانیت سے رشتہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جمعۃ

الوداع نے لوگوں کو موقع دیا کہ وہ اپنی روحانیت میں مزید اضافہ کریں۔ وہ زیادہ کیفیت والی عبادت انجام دے سکیں۔

جمعہ کا دن اسلام میں اجتماعی عبادت کا دن ہے۔ اجتماعی عبادت کے اس عمل سے بہت سی چیزیں وابستہ ہیں۔ مثلاً صفائی ستھرائی، کیوں کہ اس دن ہر مسلمان صفائی ستھرائی کا زیادہ اہتمام کرتا ہے۔ وقت کی پابندی، کیونکہ صبح سے ہی اگر اپنے اوقات کو منظم نہ کیا جائے تو مقرر وقت پر مسجد پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ سماجی بہبود، کیوں کہ لوگ جب اپنے گھروں اور دفتروں سے نکل کر مسجد آتے ہیں تو راستہ میں وہ غریبوں اور محتاجوں کی اعانت بھی ضرور کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ جمعہ کی نماز اجتماعی اوصاف کی تربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس دن تمام لوگ صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک امام کی پیروی میں نماز کے ارکان ادا کرتے ہیں۔ خاموش ہو کر خطبہ سنتے ہیں۔ یہ چیزیں ایک اعتبار سے عبادتی افعال ہیں۔ دوسرے اعتبار سے وہ اجتماعی اوصاف پیدا کرنے کی تربیت ہیں۔ وہ پوری قوم میں اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس کی وجہ سے انفرادی زندگی وسیع ہو کر اجتماعی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

یہ تمام چیزیں جو جمعہ کی خصوصیات ہیں وہ مزید اضافہ کے ساتھ جمعۃ الوداع کی خصوصیات ہیں۔ جمعۃ الوداع ان میں سے ہر خصوصیت کو دگنا چوگنا حد تک بڑھا دیتا ہے۔

جمعۃ الوداع کی یہ اہمیت اس لئے ہے کہ وہ روزہ کے دنوں میں ہوتا ہے۔ روزہ لوگوں کی حساسیت کو ابھار کر ان کے اندر سنجیدگی اور ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔ وہ لوگوں کی شخصیت کے مادی پہلو کو دباتا ہے اور اس کے روحانی پہلو کو ابھارتا ہے۔ روزہ کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر حرص، خود غرضی، سرکشی، انانیت جیسے جذبات کم ہوتے ہیں اور اس کی جگہ نرمی، تواضع، انسانی ہمدردی جیسے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ ان بڑھے ہوئے انسانی جذبات کو اپنے سینہ میں لے کر جب بہت سے لوگ جمعۃ الوداع کے دن مسجد میں اکٹھا ہوتے ہیں تو وہ اپنے انفرادی اوصاف کو گویا اجتماعی اوصاف کی صورت دیتے ہیں۔ وہ نجی دائرہ کے عمل کو اجتماعی دائرہ کا عمل بنا دیتے ہیں۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ فروری ۱۹۹۵ کو نشر کی گئی۔

عید کا تیوہار

اسلام میں عید الفطر کا طریقہ ہجرت کے بعد مقرر کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں سال میں دو تیوہاروں کا رواج ہے۔ اس دن وہ لوگ تفریح کرتے ہیں اور کھیل کود کے اکھاڑے قائم کرتے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے اس سے بہتر دو دن مقرر کئے ہیں۔ اور وہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں۔ اس طرح اہل اسلام کے درمیان ان دونوں تیوہاروں کا رواج پڑا۔

عید الفطر رمضان کے خاتمہ کے فوراً بعد آتی ہے۔ اسی لئے اس کو انعام کا دن کہا گیا ہے۔ رمضان میں اللہ کے بندوں نے ایک مہینہ تک کھانے اور پینے پر پابندی لگائی تھی۔ اب عید کے دن ان کو کھانے اور پینے کی مکمل آزادی دے دی گئی۔ گویا کہ رمضان کا مہینہ ان کے لئے عمل کرنے کا مہینہ تھا اور عید کا دن ان کے لئے عمل کا انعام پانے کا دن۔

عید کا آغاز ہلال عید دیکھنے سے ہوتا ہے۔ رمضان کے مہینہ کے آخری دن تمام لوگوں کی نظریں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ جیسے ہی شوال کا نیا چاند دکھائی دیتا ہے وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ اے اللہ، تو اس نکلنے والے چاند کو ہمارے لئے امن کا اور سلامتی کا اور اپنی اطاعت کا چاند بنا دے۔ تو اس مہینہ کو اپنی خصوصی رحمت اتارنے کا مہینہ بنا دے۔

اس طرح عید کا چاند اہل اسلام کے لئے نہ صرف خوشی کا چاند ہوتا ہے بلکہ وہ انھیں رب کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ ان کو خدا کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اپنے لئے اور تمام انسانوں کے لئے دعا کرنے لگتے ہیں کہ خدایا، اس نئے چاند سے جو مہینہ شروع ہو رہا ہے اس مہینہ کو تو ہم سب کے لئے رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ بنا دے۔

ہلال عید کے بعد آنے والی رات کو اہل اسلام خصوصی عبادت کرتے ہیں۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ نفل نماز پڑھتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں۔ اس طرح نیا چاند ان کے لئے نئی دینی بیداری پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

صبح ہوتی ہے تو وہ نہا دھو کر اپنے آپ کو پاک کرتے ہیں نئے کپڑے پہنتے ہیں اور پھر

چھوٹے بڑے اپنے گھروں سے نکل کر عیدگاہ کی طرف یا مسجد کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ راستہ میں وہ بار بار ایسے کلمات اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے ــــــ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے، اور اللہ ہی کے لئے ہے ساری تعریف۔

اس طرح تمام چھوٹے اور بڑے ایک جگہ جمع ہوکر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ نماز کی صورت میں وہ عملی طور پر اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ایک اللہ سب کا مالک اور معبود ہے اور تمام انسان اس کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں۔ نماز کے بعد امام خطبہ کی صورت میں ایک تقریر کرتا ہے۔ اس میں خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ یہ بتایا جاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ سب کو چاہئے کہ اس کی عبادت کریں اور خدا کی زمین پر خدا کے بندے بن کر رہیں۔

نماز سے فراغت کے بعد لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عید کے دن کی مبارک باد دیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اِس کو عید ملن کہا جاتا ہے۔ عید ملن گویا باہمی محبت کو فروغ دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی صرف اکیلے خوشی نہ منائے بلکہ دوسرے کی خوشیوں میں شرکت کرکے پورے ماحول کو خوشی کا ماحول بنا دے۔

اس کے بعد لوگ اپنے رشتہ داروں اور اپنے دوستوں اور اپنے پڑوسیوں کے گھر جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے جذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ آپس میں میل ملاپ اور محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ اس طرح ملنا جلنا اور ایک دوسرے کے یہاں کھانا پینا باہمی اتحاد کو بڑھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور عید کے دن خاص طور پر ان سماجی قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

عید کے دن کو عمومی خوشی کا دن بنانے کے لئے جو چیزیں مقرر کی گئی ہیں ان میں سے ایک صدقہ فطر ہے۔ حکم ہے کہ خوش حال خاندان اپنے گھر کے ہر فرد کی طرف سے مقررہ مقدار میں غلہ یا رقم نکالیں اور اس کو غریب بھائیوں تک پہنچائیں۔ تاکہ وہ بھی اپنے بچوں کے لئے نئے کپڑے بنوائیں۔

وہ بھی عید کے دن اچھے کھانے تیار کریں اور دوسروں کی طرح وہ بھی عید کی خوشی میں شریک ہو جائیں۔

یہ تمام طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں تاکہ عید کا دن پورے سماج کے لئے خوشی کا دن بن جائے۔ وہ تمام لوگوں کے لئے نئی زندگی کا پیغام دینے والا ثابت ہو۔

عید کا دن کھیل تماشے کا دن نہیں ہے۔ بلکہ ایک سنجیدہ تیوہار کا دن ہے۔ عید کو شرافت اور اخلاق کے تقاضوں کے ساتھ منانے کا حکم ہے۔ عید کے دن خدا کی بڑائی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس لئے عید کے دن کو خدا کی مرضی کے مطابق گزارنا چاہئے۔ عید کے دن لوگوں کو مبارک باد دی جاتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ عید کے دن صرف ایسی باتیں کی جائیں جن میں عام انسانوں کے ساتھ محبت اور خیر خواہی کی کیفیت موجود ہو۔ عید کے دن تمام سرگرمیوں میں ایک طرف ربانیت کا پہلو ہونا چاہئے اور دوسری طرف انسانیت کا پہلو۔

ہندستان میں عید الفطر کے موقع پر سوئیاں کھانے کا رواج ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو میٹھی چیزیں کھلاتے ہیں اور ایک دوسرے کے درمیان شیرینی تقسیم کرتے ہیں۔ اسی لئے اس علاقہ میں عید الفطر کو میٹھی عید کہا جاتا ہے۔ مصر میں اس کو عید الکسوہ (لباس کی عید) کہتے ہیں۔ مصر کے فاطمی خلفاء کے دور میں عید الفطر کے دن غریبوں میں کپڑا تقسیم کرنے کا رواج بہت پھیلا۔ اس بنا پر عید الفطر کو عید الکسوہ (کپڑوں کی عید) کہا جانے لگا۔

اسی طرح ہر مسلم ملک میں عید الفطر کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جیرار دی تروال ایک فرانسیسی سیاح ہے۔ وہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں ترکی آیا تھا۔ جب وہاں سلطان عبد المجید کی حکومت تھی۔ وہ عید کے دن استانبول میں موجود تھا۔ چنانچہ اس نے تفصیل کے ساتھ استانبول کی عید کا حال بیان کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ استانبول کے ہر گھر میں کھانے اور میٹھی چیزوں کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا۔ کوئی بھی شخص کسی بھی گھر میں داخل ہو کر کھانے میں شریک ہو سکتا تھا جو ہر وقت وہاں تیار رہتا تھا۔ امیر یا غریب ہر مسلمان کا حال اس معاملہ میں یکساں تھا۔ ظاہری حالات سے قطع نظر، ہر ایک اپنے یہاں آنے والوں کی تواضع، اپنی استطاعت کے مطابق نہایت خوشی کے ساتھ

کرتا تھا۔

تیوہار کا طریقہ ہر قوم اور ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ تیوہار کا مقصد ہمیشہ اجتماعی خوشی ہوتا ہے۔ تیوہار اس لئے مقرر کئے جاتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان باہمی محبت کو بڑھایا جائے۔ باہمی تعلقات کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنایا جائے۔

یہی مقصد عید الفطر کے تیوہار کا بھی ہے۔ تاہم عید الفطر ایک سنجیدہ تیوہار ہے۔ عید الفطر کو اس طرح منانا چاہئے کہ وہ کسی کو تکلیف دینے کا سبب نہ بنے۔ عید الفطر کے دن ہر شخص کو یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ دوسروں کو اس سے خوشی کا تحفہ ملے۔ عید الفطر کو اس طرح منانا چاہئے کہ اس کے ذریعہ باہمی خوشگواری میں اضافہ ہو۔ سچی عید وہی ہے جو ساری انسانیت کے لئے عید کا دن بن جائے۔

نوٹ: یہ تقریر ۵ اپریل ۱۹۹۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عید الفطر

عید الفطر کا مطلب ہے افطار کی عید، کھانے پینے کی عید۔ اس کو عید الفطر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رمضان کے مہینہ کے فوراً بعد آتی ہے۔ رمضان کا مہینہ کھانے پینے پر پابندی لگانے کا مہینہ ہے۔ اور عید الفطر کا دن ان پابندیوں سے آزاد ہونے کا دن ہے۔

روزہ اور عید کے درمیان اس ترتیب کا ایک پہلو یہ ہے کہ بندہ نے رمضان میں ایک مہینہ تک اللہ کے حکم کی تعمیل کی، تو اب اللہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے اپنے انعام کے طور پر بندہ کو یہ موقع دیا کہ وہ پابندیوں سے آزاد ہو کر جو چاہے کھائے اور جو چاہے پئے۔ روزہ اگر اس کے لئے عمل کا مہینہ تھا تو عید الفطر اس کے لئے انعام کا دن ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھئے تو روزہ اور عید اس قانون فطرت کو بتا رہے ہیں جس کے مطابق موجودہ دنیا کا نظام بنایا گیا ہے۔ اس دنیا میں آسانی کے ساتھ مشقت جڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہر کامیابی سے پہلے محنت کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ یہاں پہلے "بھوک" کو برداشت کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد آدمی کے لئے کھانے اور پینے کا دسترخوان لگایا جاتا ہے۔

روزہ اور عید انھیں دونوں حقیقتوں کی علامت ہیں۔ روزہ پہلے مرحلہ کی علامت ہے، اور عید دوسرے مرحلہ کی علامت۔ روزہ اور عید کا یہ نظام انسان کو یہ سبق دے رہا ہے کہ اس دنیا میں اگر تم خوشی اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس سے پہلے محنت اور مشقت کی وادیوں سے گزرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

رمضان کے مہینہ کا آخری روزہ جب ختم ہوتا ہے تو نئے مہینہ کا چاند ہلال کی صورت میں آسمان کے اوپر دکھائی دیتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی خدا کے بندے یہ کہتے ہیں کہ اے خدا، اس چاند کو تو ہمارے لئے امن و امان کے ساتھ نکال، اس کو تو ہمارے لئے سلامتی اور اسلام کا چاند بنا دے۔

یہ اس بات کا سبق ہے کہ عید کا مہینہ امن و سلامتی کا مہینہ ہے۔ اس دن خدا کے بندوں کو یہ عہد کرنا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے خیر خواہ بن کر رہیں گے۔ وہ امن والے بول بولیں گے

اور سلامتی والے عمل کریں گے۔

عید کے دن تمام چھوٹے اور بڑے اپنے گھروں سے "اللہ بڑا ہے ، اللہ بڑا ہے" کہتے ہوئے نکلتے ہیں۔ پھر وہ ایک جگہ جمع ہو کر دو رکعت اجتماعی نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا عہد ہے کہ وہ بڑائی کا درجہ صرف خدا کو دیں گے۔ اور خود اپنے لئے تواضع کی روش کو پسند کریں گے۔ وہ سرکشی کا طریقہ چھوڑ دیں گے ، اللہ کے مقابلہ میں بھی اور بندوں کے مقابلہ میں بھی۔

عید کی نماز سے واپسی کے بعد لوگ آپس میں ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ یہ بھی ایک علامتی عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اسی طرح پورا سال گزارنا ہے۔ انھیں علاحدگی پسندی کا طریقہ چھوڑ دینا ہے اور سب کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنا ہے۔ کسی آدمی کو دوسروں کے لئے بوجھ نہیں بننا ہے۔ ہر آدمی کو یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ دوسروں کو دے۔ آدمی کو اس دنیا میں دینے والا بن کر رہنا ہے نہ کہ دوسروں سے لینے والا بن کر۔

عید کے دن یہ کام اس انتظار کے بغیر کیا جاتا ہے کہ دوسرا ہم سے ملنے کے لئے آئے تب ہم اس سے ملیں ، یا دوسرا ہم کو تحفہ دے تو اس کے بعد ہم اسے تحفہ دیں۔ عید کے دن یہ سارے کام یکطرفہ جذبہ کے تحت کئے جاتے ہیں نہ کہ دو طرفہ جذبہ کے تحت۔

اس میں یہ سبق ہے کہ اس دنیا میں وہی شخص انسانیت اور اخلاق کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے جو یک طرفہ طور پر انسانیت اور اخلاق کا اصول اختیار کرنے پر راضی ہو جائے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں سے تعلق پیدا کرنا ہے ، خواہ دوسرے اس کے ساتھ تعلق نہ پیدا کر رہے ہوں۔ یہاں آدمی کو اپنے پڑوسی سے محبت کرنا ہے ، خواہ اس کا پڑوسی اس کے ساتھ محبت کا اظہار نہ کر رہا ہو۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے انسانوں کو دوست بنانا ہے ، خواہ دوسرے انسان اس کے ساتھ دوستی کا معاملہ کرنے پر راضی نہ ہوں۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسرے انسانوں کے لئے نفع بخش بننا ہے خواہ دوسرے انسانوں سے اس کو نفع بخشی کا تجربہ نہ ہو رہا ہو۔

روزہ اور عید سال میں ایک بار آتے ہیں ، مگر وہ پورے سال کے لئے ہماری زندگی کا کورس متعین کرتے ہیں۔ روزہ اور عید علامتی طور پر خدا کے بندوں کو یہ بتاتے ہیں کہ خدا

کی زمین پر انھیں کس طرح رہنا چاہئے۔ روزہ اگر آغاز حیات کی علامت ہے تو عید انجام حیات کی علامت۔

روزہ رکھنے کے بعد لوگ عید کے انعام کے مستحق بنتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں تاکہ اس کے بعد وہ اپنے حقوق کو پا سکیں۔ ان کو چاہئے کہ وہ پابندیوں کو نبھائیں تاکہ وہ انعامات کے مستحق ٹھہریں۔ ان کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے خیر خواہ بنیں تاکہ دوسرے بھی ان کے ساتھ خیر خواہی کریں۔ ان کو چاہئے کہ وہ سماج میں دینے والے بن کر رہیں تاکہ انھیں بھی سماج میں عزت کا مقام مل سکے۔ ان کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسیوں اور اپنے انسانی بھائیوں کے ساتھ یکطرفہ طور پر اچھا سلوک کریں۔ کیوں کہ جو لوگ اس طرح اچھا سلوک کریں۔ ان کے لئے ان کا دشمن بھی ان کا دوست بن جاتا ہے۔

روزہ اور عید کے درمیان ایک اور گہرا فرق پایا جاتا ہے۔ روزہ گویا نہ کرنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں کرنے کا دن۔ روزہ گویا رکنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں چلنے کا دن۔ روزہ گویا چپ رہنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں بولنے کا دن۔ روزہ گویا ٹھہرنے کا مہینہ ہے اور عید اس کے مقابلہ میں اقدام کا دن۔

اس فرق میں یہ سبق ہے کہ زندگی میں دونوں ہی قسم کی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی میں کبھی کرنا ہوتا ہے اور کبھی نہ کرنا۔ کبھی چلنا ہوتا ہے اور کبھی ٹھہر جانا۔ کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی چپ ہو جانا۔ کبھی اقدام کرنا ہوتا ہے اور کبھی پیچھے رک جانا۔

روزہ اور عید دونوں ایک اعتبار سے عبادت ہیں اور دوسرے اعتبار سے تربیت۔ روزہ اور عید میں ایک طرف خدا کو راضی کرنے کے پہلو موجود ہیں۔ اور دوسری طرف ان کا عملی نقشہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ وسیع تر زندگی کے لئے تربیت کا کورس بن جائیں۔ وہ علامتی طور پر پورے سال کے لئے رہنمائے حیات کا کام دیں۔

نوٹ : یہ تقریر ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عیدالفطر

عیدالفطر کے لفظی معنی ہیں افطار کی عید، یعنی روزہ ختم کرنے اور کھانے پینے کی عید۔ یہ اسلام کا سالانہ تیوہار ہے جو رمضان کے مہینے کے فوراً بعد شوال کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ عیدالفطر ایک سادہ تیوہار ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی بطور فرض یا لازم کے نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ سنت یا مستحب ہے۔ یہ تو لازم کیا گیا ہے کہ عیدالفطر کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے مگر یہ لازم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ فلاں فلاں عمل ضرور کرے۔ گویا کہ عیدالفطر مکمل آزادی کا دن ہے۔

عیدالفطر کے دن مسلمان صبح اٹھ کر نہاتے دھوتے ہیں۔ نیا کپڑا پہنتے ہیں۔ خوشبو لگاتے ہیں۔ اپنی پسند کی میٹھی چیز (مثلاً سوئیاں) کھاتے ہیں۔ اور پھر اجتماعی عبادت کے لئے مسجد کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں وہ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں۔ اس نماز میں اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کا لفظ عام نمازوں سے کچھ زیادہ بار دہرایا جاتا ہے۔ نماز کے بعد سب مل کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں۔ مسجد جاتے ہوئے اور مسجد سے واپس ہوتے ہوئے راستہ میں یہ کہتے جاتے ہیں: اللہ اکبر اللہ اکبر لاالٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد (اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے اور اسی کے لئے ہے ساری تعریف) یہ بات پسندیدہ ہے کہ بستی کے سارے مسلمان ایک مقام پر اکٹھا ہو کر نماز ادا کریں، مرد، عورت اور بچے سب وہاں حاضر ہوں اور گھر سے مسجد آنے اور جانے کا راستہ بدل دیں۔ یہ سب اس لئے ہے تاکہ خداپرست گروہ کی شوکت کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ ہو۔

نماز کے بعد آپس میں ملنے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کا پروگرام ہوتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے گھر جاتے ہیں۔ چھوٹے اپنے بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور بڑے اپنے چھوٹوں کو تحفے اور عیدی پیش کرتے ہیں۔ اس طرح سارا دن خوشیاں منانے اور کھانے پینے میں گزر جاتا ہے۔

یہ عیدالفطر عام معنوں میں محض ایک قومی تیوہار نہیں ہے، اس کی ایک خاص معنویت ہے اور زندگی کے اسلامی تصور سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق عید اس دن کی علامت یا تمثیل ہے جب کہ ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لئے ہوگی۔ ہر قسم کی شان و شوکت صرف ان لوگوں کو ملے گی جو موجودہ امتحان کی دنیا میں خدا کے وفادار بن کر رہے تھے۔ جب خداپرستوں کے لئے مشکلوں اور مصیبتوں کے دن ختم ہو جائیں گے اور ان کا خدا ان کو خوشیوں اور راحتوں کی ابدی دنیا میں داخل کر دے گا جہاں سے کبھی نکلنا نہ ہوگا۔

اسلام کے نزدیک آدمی کی زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ ایک موت سے پہلے اور دوسرا موت کے بعد۔ موت سے پہلے کا مرحلہ عمل کرنے کا مرحلہ ہے اور موت کے بعد کا مرحلہ اپنے عمل کا انجام پانے کا مرحلہ۔ موت سے پہلے پابند اور ذمہ دار زندگی گزارنا ہے اور موت کے بعد اس کے انعام کے طور پر ایسی زندگی ملے گی جس میں آدمی ہر طرح آزاد اور خوش حال ہوگا ——— روزہ کا مہینہ موت سے پہلے کی زندگی کی علامت ہے اور عیدالفطر کا دن موت کے بعد کی زندگی کی علامت۔

موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی کو جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کہ وہ خدا کی مرضی کا پابند ہو کر زندگی گزارے۔ وہ جو کچھ کرے جائز دائرہ میں کرے، خدا کے منع کئے ہوئے دائرہ میں داخل نہ ہو۔ مثلاً وہ سچ بولے اور جھوٹ نہ بولے۔ وہ محنت کی کمائی کھائے اور لوٹ کھسوٹ کے طریقوں سے بچے۔ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ ہمیشہ انصاف برتے اور بے انصافی کا طریقہ کبھی اختیار نہ کرے۔ اس کے دل میں لوگوں کے لئے محبت اور خیر خواہی ہو نہ کہ بغض اور حسد۔

روزہ اسی پابند زندگی کی مشق ہے، وہ آدمی کو یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں اس کو ذمہ دارانہ زندگی گزارنا ہے نہ کہ غیر ذمہ دارانہ زندگی۔ روزہ میں آدمی خدا کے حکم سے کھانا پانی چھوڑ دیتا ہے۔ اپنے معمولات کو بدل دیتا ہے، اپنی خواہشوں پر روک لگاتا ہے۔ اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کا پابند بناتا ہے۔ اس طرح مسلسل ایک ماہ تک وہ اپنے آپ کو ایک پُرمشقت کورس سے گزارتا ہے۔ یہ روزہ کی صورت میں اس پابند زندگی کا ایک علامتی سبق ہے جو آدمی کو موجودہ دنیا میں اپنی زندگی میں نباہنا ہے۔ رمضان میں ایک مہینہ تک اس قسم کی پابند زندگی گزارنے کے بعد یکم شوال کو عیدالفطر کا دن آتا ہے جب کہ ساری پابندیاں ختم کر دی جاتی ہیں اور آدمی آزاد ہوتا ہے کہ وہ خوشیوں اور راحتوں کا دن منائے۔ روزہ کے مہینہ میں اگر اس کو موت سے پہلے کی زندگی کا سبق دیا گیا تھا تو عیدالفطر کے دن اس کو موت کے بعد کی زندگی کی جھلک دکھائی جاتی ہے۔ روزہ مسلمان کی دنیوی زندگی کی تمثیل ہے اور عیدالفطر مسلمان کی آخرت کی زندگی کی تمثیل۔

روزہ کا مہینہ اور اس کے فوراً بعد عیدالفطر آدمی کو یاد دلاتے ہیں کہ اگر اس نے موجودہ دنیا میں خدا کے حکموں کے مطابق پابند زندگی گزاری تو اگلی دنیا میں اس کو خوشی اور آزادی کی پر بہار جنتوں میں داخل کیا جائے گا۔ اس کے بعد نہ اس پر کوئی پابندی ہوگی اور نہ کسی قسم کی تکلیف۔

نوٹ: یہ تقریر ۳ اگست ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

اسلامی تیوہار

تیوہار اجتماعی خوشی کا دن ہے۔ یہ انسان کی اور انسانی سماج کی ایک فطری ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر سماج میں تیوہار کا رواج کسی نہ کسی صورت میں پایا جاتا ہے۔

عام حالات میں لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں میں اور اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے لئے بے تکلف انداز میں اجتماعی ملاقات کا ایک موقع ہو۔ تیوہار اسی قسم کا ایک موقع فراہم کرتے ہیں جب کہ کسی بستی یا کسی انسانی گروہ کے لوگ آپس میں کھلے طور پر ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں بے تکلف حصہ دار بنتے ہیں۔

اسی طرح موجودہ دنیا میں آدمی اکثر کسی نہ کسی سبب سے ذہنی تناؤ میں رہتا ہے۔ حتی کہ اگر کسی کو راحت و آرام کے سارے سامان حاصل ہوں تب بھی کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نفسیاتی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کو اکتاہٹ (بورڈم) کہا جاتا ہے۔ اس عمومی صورت حال نے بھی تیوہار کو ہر قوم اور ہر سماج کی فطری ضرورت بنا دیا ہے تاکہ لوگ اکٹھا ہو کر اپنے غموں کو بھلائیں، ایک دوسرے سے مل کر اپنے ذہنی بوجھ کو ہلکا کریں۔

یہ تیوہار اکثر کسی خاص قومی دن میں یا کسی یادگار تاریخ پر رکھے جاتے ہیں۔ ہر قوم اپنے تاریخی دنوں میں اپنا تیوہار مناتی ہے۔ چنانچہ سال کی اکثر تاریخوں میں کسی نہ کسی قوم کا تیوہار کسی نہ کسی مقام پر جاری رہتا ہے (تفصیلی فہرست کے لئے (مائیکروپیڈیا ۴/۳-۷۵)

ان تیوہاروں میں عام طور پر کھیل کود ہوتا ہے۔ تفریحی پروگرام کئے جاتے ہیں۔ عام سماجی روایات کی حدود کو توڑ کر لوگ خوشیاں مناتے ہیں۔ ان میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے ہیں، خواہ وہ سیاسی ہوں یا مذہبی یا سیکولر ہوں۔

مسلمانوں کے لئے اس قسم کے دو تیوہار مقرر کئے گئے ہیں —— عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ مسلمانوں کے لئے مذہبی اعتبار سے یہ دو سالانہ خوشی کے دن ہیں۔ عید الفطر شوال کی پہلی تاریخ کو آتی ہے اور عید الاضحیٰ ذوالحجہ کی ۱۰ تاریخ کو۔

مکی دور میں باقاعدہ اسلامی سماج نہیں بنا تھا۔ اس لئے مکی دور میں عیدین کے یہ تیوہار

بھی مقرر نہیں ہوئے تھے۔ منظم اسلامی معاشرہ ہجرت کے بعد مدینہ میں بنا۔ اس وقت جس طرح دوسرے اجتماعی نظام بنائے گئے، اسی طرح عیدین کا نظام بھی قائم کیا گیا۔

اس زمانہ میں مدینہ کے لوگوں میں دو قبائلی تیوہاروں کا رواج تھا۔ اس دن وہ لوگ کھیل کے مقابلے کرتے تھے۔ شعروشاعری کی محفلیں سجاتے تھے۔ تاریخی فخر والی چیزوں کی نمائش کرتے تھے۔ مجموعی اعتبار سے اس تیوہار کو ایک قسم کا قومی میلہ کہا جاسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مکہ سے مدینہ آئے اور آپ نے وہاں کے تیوہاروں کو دیکھا تو آپ نے ان کے بجائے عیدین کی صورت میں دو تیوہار مقرر کئے۔ ایک صحابی حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئے تو اس وقت اہل مدینہ کے دو سالانہ دن تھے۔ ان میں وہ کھیل کود کرتے تھے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ تمہارے دو دن کیا ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ یہ یہاں کا پرانا رواج ہے۔ ان دنوں میں ہم لوگ کھیل کود کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے ان دو دنوں کے بدلے تم کو زیادہ بہتر دو دن دئے ہیں۔ یہ دو دن یوم الاضحیٰ اور یوم الفطر ہیں (سنن ابی داؤد ۱/۲۹۴)

عیدین کے یہ تیوہار گویا تیوہار کے قدیم جاہلی طریقوں کا اسلامائزیشن ہیں۔ تیوہار کا اصل مقصد اجتماعی خوشی ہے۔ اس کو عیدین میں پوری طرح باقی رکھا گیا۔ البتہ اس میں غیر سنجیدہ قسم کے کھیل کود کو گھٹا کر اس کی جگہ مہذب خوشی اور سنجیدہ تفریح کا اضافہ کر دیا گیا۔

عیدین کے سلسلہ میں مختلف روایتیں جو حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ان کی بیشتر تعداد کو مشکاۃ المصابیح میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ ان کو صلاۃ العیدین میں اور بعض دوسرے ابواب کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔

پہلی بات یہ کہ عید کے تیوہار کو قمری کیلنڈر کے ہلال سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح نئے چاند کا ظہور تیوہار کی آمد کا ایک آسمانی اعلان بن جاتا ہے۔ تاہم اس خوشی کا رخ اعلیٰ انسانی قدروں کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہلال کو دیکھا تو یہ دعائیہ کلمات آپ کی زبان سے نکلے: اَللّٰھُمَّ اھلہ علینا بالامن والایمان والسلامۃ والاسلام، ربی وربک اللہ۔ (مشکاۃ المصابیح ۲/۷۵۱) یعنی اے اللہ، اس چاند کو ہمارے لئے

امن اور یقین کا چاند بنادے۔ اس کو سلامتی اور اطاعت کا چاند بنادے۔ میرا رب بھی اللہ ہے، اور اس چاند کا رب بھی اللہ۔

یہ دعا بتاتی ہے کہ عید کا چاند دیکھ کر لوگوں کے اندر کس قسم کے احساسات وجذبات پیدا ہونے چاہئیں۔ وہ یہ کہ ہمارے اندر یہ تمنا ابل پڑے کہ آنے والے دن ہمارے لئے اور ساری انسانیت کے لئے امن کے دن ہوں۔ جب کہ تمام لوگوں کو صحت وسلامتی کی نعمتیں حاصل ہوں۔ انسانی خوشیوں میں چاند کی شرکت کو دیکھ کر انسان کے اندر یہ احساس جاگ اٹھے کہ پوری کائنات ایک وسیع خدائی عیال ہے۔ اس میں انسان سے لے کر آسمانی اجرام تک سب شامل ہیں۔ سب ایک ہیں، اس لئے کہ سب کا خدا ایک ہے۔

پھر جب صبح آتی ہے تو تمام بڑے اور بچے، عورتیں اور مرد نہا دھو کر صاف کپڑے پہنتے ہیں۔ اپنی پسندیدہ خوراک کھا کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد گھر سے چل کر کسی کھلے میدان میں پہنچتے ہیں۔ اور وہاں دو رکعت شکر کی نماز پڑھتے ہیں۔ اس طرح گویا وہ اقرار کرتے ہیں کہ جس خدا نے خوشی کا موقع دیا ہے، وہی خدا اس قابل ہے کہ اس کے لئے اس کا شکر ادا کیا جائے۔ نماز کے بعد امام خطبہ دیتا ہے جس میں نصیحت کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس میں بتایا جاتا ہے کہ خوشی ہر انسان کا حق ہے۔ مگر خوشی کو ذمہ داری کے حدود میں رہ کر منانا چاہیئے۔

اس کے بعد لوگ آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں۔ سلامتی اور مبارکبادی کے کلمات کے ساتھ ایک دوسرے کا استقبال کرتے ہیں۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس طرح کہ ایک کی خوشی دوسرے کے لئے تکلیف کا باعث نہ ہو۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر ان کی خوشی میں شور وغل نہیں ہوتا۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ راستوں میں کوئی گندگی نہ پھیلے۔ ان کی خوشی پڑوسیوں کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔ وہ خوشی مناتے ہیں مگر اس طرح کہ مقصدیت کا عنصر کسی طرح اس سے حذف نہ ہونے پائے۔

اسلامی تیوہار کے دن جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سے ایک صدقہ ہے۔ نقد کی صورت میں بھی اور کھانے پینے کی چیزوں کی صورت میں بھی۔ یہ گویا انفرادی خوشی کی اجتماعی توسیع ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک کو خوشی منانے کے اسباب مہیا کئے جائیں۔ سماج میں کوئی ایسا نہ رہے

جو خوشی کے اسباب سے محروم ہو۔ جو اپنی خوشی کی مادی قیمت دینے سے عاجز ہو جائے۔

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر آئے۔ اس وقت دو لڑکیاں حضرت عائشہ کے پاس بیٹھی ہوئی دُف بجا رہی تھیں اور عربی گانے گا رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر نے ان کو ڈانٹا کہ رسول کے گھر میں تم لوگ گانے بجانے کا لغو کام کر رہی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے چہرہ سے چادر ہٹائی اور فرمایا کہ اے ابو بکر، انھیں چھوڑ دو، ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے (فتح الباری ۲/۵۱۶)

اسلام میں خوشی منانے کو تہذیب اور انسانیت کی حد میں رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ تاہم خوشی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ حد کی پابند نہیں رہتی۔ وفور شوق میں کبھی کبھی کوئی شخص تجاوز بھی کر جاتا ہے۔ اس لئے حد بندی کے ساتھ اسلام میں انسانی جذبات کی رعایت بھی رکھی گئی ہے۔ اور وہ رعایت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت یا مرد وقتی جذبہ کے تحت کچھ سادہ قسم کی بے ضرر تفریح کر لیں تو سماج کے بڑوں کو چاہئے کہ وہ اسے نظر انداز کریں۔ وہ اس قسم کی معصومانہ خوشی پر روک لگانے کی کوشش نہ کریں۔

ایک بزرگ نے کہا: لیس العید لمن تزیّن بزینة الدنیا، إنما العید لمن تزوّد بزاد التقوی۔ یعنی عید اس کی نہیں ہے جو دنیا کی زینت سے اپنے آپ کو سنوارے بلکہ عید اس کی ہے جو آخرت کے لئے تقویٰ کا زادراہ اکٹھا کر لے۔

اس قول سے اسلامی تیوہار کی اصل روح معلوم ہوتی ہے۔ اسلامی تیوہار وہ ہے جس میں خوشی کے ساتھ خدا کا شکر شامل ہو جس میں کھیل کے ساتھ اعتدال موجود ہو۔ جس میں بے تکلفی ہو مگر وہ ادب کے دائرہ میں ہو۔ جس میں کھانا پینا ہو مگر وہ اسراف سے پاک ہو۔ جس میں انسانی جذبات کی رعایت ہو مگر وہ خدائی احکام کے ماتحت ہو۔ جس میں تفریح ہو مگر اسی کے ساتھ اس میں مقصدیت بھی پوری طرح برقرار رہے۔

یہ ہے عید، اور یہ ہے تیوہار کا اسلامائزیشن۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۱ فروری ۱۹۹۶ کو نشر کیا گیا۔

عید : میل ملاپ کا تیوہار

تیوہار کا رواج تمام قوموں اور تمام دیشوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ ہر سماج میں کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ تیوہاروں کا سلسلہ پورے سال جاری رہتا ہے۔ سال کے ہر دن کہیں نہ کہیں کوئی تیوہار منایا جارہا ہوتا ہے۔ سال کا کوئی دن بھی ایسا نہیں جو تیوہار سے خالی ہو۔

ایسا اس لئے ہے کہ تیوہار ایک سماجی ضرورت ہے۔ وہ انسانی فطرت کی ایک مانگ ہے۔ لوگ سال بھر اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ بڑے پیمانہ پر میل ملاپ کے مواقع انھیں نہیں ملتے۔ ملنا جلنا ایک گہری سماجی مانگ ہے۔ مگر روزانہ کی مصروفیت میں یہ مانگ پوری نہیں ہوتی۔

اسی طرح یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ کسی ایک یا دوسرے سبب سے ہر آدمی تناؤ یا اکتاہٹ کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر آدمی اس طرح جیتا ہے جیسے اس کے کندھے پر کوئی دماغی بوجھ لدا ہوا ہو۔ ہر آدمی کم یا زیادہ ٹنشن کا کیس بنا ہوا ہے۔

تیوہار اسی کا ایک حل ہے۔ اسی حالت کو دور کرنے کے لئے ہر سماج میں تیوہار کا طریقہ رکھا گیا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے روزانہ کے کاموں سے نکل کر ایک دوسرے سے ملیں اور سب ایک ساتھ کھلے ماحول میں خوشیاں منائیں۔ وہ اپنے تنہائی کے دائرہ کو توڑ کر سماج کے بڑے دائرہ میں شامل ہو جائیں۔

تیوہار عام طور پر کسی خاص تاریخی دن رکھے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں کو اس کی طرف زیادہ سے زیادہ شوق پیدا ہو۔ یہی معاملہ عید کے تیوہار کا بھی ہے۔ عید کا دن روزہ کے مہینہ کے ختم ہوتے ہی اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ کو رکھا گیا ہے۔

روزہ کے مہینہ (رمضان) میں قرآن اترنا شروع ہوا۔ اسی لئے اس مہینہ میں تمام دنیا کے مسلمان روزہ رکھتے ہیں۔ یہ گویا شکر کا روزہ ہے۔ اس مہینہ میں روزہ رکھ کر مسلمان اپنے اندر روحانیت پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے اس مہینہ میں اپنا

سچا راستہ دکھایا۔

اسی کے ساتھ روزہ کو صبر وتقویٰ کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ ایک مسلمان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ قرآن کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارے۔ اس طرح روزہ کا مہینہ اسلام میں خاص اہمیت والا مہینہ بن گیا ہے۔ اس لئے روزہ (رمضان) کا مہینہ ختم ہوتے ہی اگلے مہینہ (شوال) کی پہلی تاریخ کو عید کا تیوہار رکھا گیا۔

گویا رمضان کا مہینہ اگر روزہ رکھنے کا مہینہ تھا تو شوال کا مہینہ کھانے پینے اور خوشیاں منانے کا مہینہ ہے۔ رمضان کے مہینہ کا آخری دن پابندیوں کے ختم ہونے کی علامت ہے، اور شوال کے مہینہ کی پہلی تاریخ دوبارہ پابندیوں کو نرم کرنے کی علامت۔

شوال کے مہینہ کا نیا چاند جب شام کو آسمان پر دکھائی دیتا ہے تو اس کو دیکھ کر مسلمان کہتے ہیں: اے خدا، اس چاند کو تو شانتی کا اور روحانیت کا چاند بنا دے۔ گویا نئے چاند کا سواگت اس جذبہ سے کیا جاتا ہے کہ دنیا میں ایک طرف شانتی اور سکھ کا ماحول بنے، اور دوسری طرف لوگ اپنے رب کی فرماں برداری والی زندگی گزاریں۔

حکم ہے کہ عید سے پہلے تمام مسلمان صدقہ کی رقم نکالیں اور اس کو سماج کے غریب لوگوں کو دیں تاکہ کوئی بھی عید کی خوشی میں شریک ہونے سے محروم نہ رہے۔ ہر ایک ضروری حد تک عید کا دن منانے کی تیاری کر سکے۔

صبح کو تمام مسلمان سویرے اٹھتے ہیں، غسل کر کے پاک صاف ہوتے ہیں۔ نئے کپڑے پہنتے ہیں۔ خوشبو لگاتے ہیں۔ کچھ میٹھی چیز کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ پھر تمام لوگ گھروں سے نکل کر عیدگاہ میں یا کسی میدان میں اکٹھا ہوتے ہیں۔

یہاں سب مل کر دو رکعت عید کی نماز پڑھتے ہیں۔ اس نماز میں بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بڑائی صرف ایک خدا کے لئے ہے۔ تمام انسان اس کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں انسانوں کے لئے ایک ہی رویہ درست ہے، اور وہ یہ کہ وہ تواضع اور ملنساری کے ساتھ لوگوں کے درمیان رہے۔ کوئی شخص اپنے کو دوسروں سے اونچا نہ سمجھے، کوئی کسی کے

اوپر اپنی بڑائی جتانے کی کوشش نہ کرے۔

عید کی نماز کے بعد امام خطبہ دیتا ہے۔ سب لوگ خاموش بیٹھ کر اسے سنتے ہیں۔ اس خطبہ میں بتایا جاتا ہے کہ انسان خدا کا بندہ ہے۔ تمام انسان برابر ہیں۔ ہر آدمی کو اپنے عمل کا حساب خدا کے یہاں دینا ہوگا۔ آدمی کو حق ہے کہ وہ دنیا میں اپنی خوشی کی زندگی بنائے، مگر کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کی خوشی اور سکون کو بھنگ کرے۔

نماز سے فراغت کے بعد تمام مسلمان آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ باہم مل کر کھاتے پیتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ دیتے ہیں۔ امن اور تہذیب کے دائرہ میں رہتے ہوئے خوشیوں کے اجتماعی پروگرام بناتے ہیں۔

رمضان کے مہینہ میں روزہ نہ رکھنا حرام تھا، عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عید کے دن اگر روزہ رکھنے کی اجازت ہو تو آدمی دوبارہ اپنی تنہائی میں چلا جائے گا۔ وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ مل جل کر لوگوں کے ساتھ تیوہار منائے، وہ سب کی خوشیوں میں شریک ہو۔

عید کا پورا دن خوشی منانے کے لئے ہوتا ہے۔ مگر روزانہ کی پانچ وقت کی نماز پھر بھی ہر ایک کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ حکم ہے کہ جب نماز کا وقت آئے تو وہ تفریحی پروگرام کو چھوڑ کر فوراً نماز کی طرف آئیں اور قاعدہ کے مطابق خدا کی عبادت کریں۔

یہ اس بات کا سبق ہے کہ خوشی میں بھی آدمی کو ایک حد پر قائم رہنا ہے۔ تفریح کے اوقات میں بھی اس کو ایسا نہیں کرنا ہے کہ وہ خدا کو بھول جائے۔ عید بے فکری کا دن ہے، مگر اسی کے ساتھ آدمی کو یہ فکر بھی لگی رہنا چاہئے کہ اس کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، اور یہ ذمہ داریاں کسی بھی حال میں اس سے اٹھائی نہیں جاتیں۔

اسلام سے پہلے عرب میں تیوہاروں کا رواج تھا۔ مگر ان میں خوشی اور تفریح کے غیر انسانی طریقے اختیار کئے جاتے تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس قسم کے تیوہاروں کو چھوڑ دو، اور زیادہ مہذب انداز میں تیوہار مناؤ۔ چنانچہ اسلام میں عید کی صورت میں اسلامی تیوہار مقرر کیا گیا۔ اس طرح عید گویا تیوہار کا اسلامائزیشن ہے۔

عید میں خوشی منانا ہے مگر شور کرنا نہیں ہے۔ عید میں تفریح کرنا ہے مگر کسی کو ستانا نہیں ہے۔ عید میں ملنا جلنا ہے مگر گالی گلوج نہیں کرنا ہے۔ عید میں کھانا پینا ہے مگر نشہ یا اسراف سے دور رہنا ہے۔ عید میں چلنا پھرنا ہے مگر راستوں کو گندا نہیں کرنا ہے۔ عید میں ملنا جلنا ہے مگر دوسروں کی زندگی میں خلل نہیں ڈالنا ہے۔

عید کا مطلب خالص مسلم تیوہار نہیں ہے، بلکہ وہ انسانی تیوہار ہے۔ وہ محدودیت یا سمٹاؤ کا پیغام نہیں ہے بلکہ آفاقیت یا پھیلاؤ کا پیغام ہے۔

عید کا آغاز آسمان میں نئے چاند کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ عید ایک آفاقی تیوہار ہے۔ اس کا تعلق تمام دنیا سے اور تمام دنیا کے انسانوں سے ہے۔ پھر عید میں تمام مسلمان چھوٹے اور بڑے، اپنے گھروں سے نکل کر باہر جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ دوسروں کے ساتھ مسلمانوں کا اختلاط (انٹرایکشن) ہوتا ہے۔ عید کا دن عملی طور پر لوگوں سے میل ملاپ کا عمومی دن بن جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان تحفے تحائف میں بھی دوسرے لوگوں کو شریک کرتے ہیں۔

اس طرح عید لوگوں کے اندر ایکتا کی اسپرٹ کو بڑھاتی ہے، وہ باہمی میل ملاپ کی فضا پیدا کرتی ہے۔ عید آپس کے تناؤ کو گھٹا کر لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتی ہے۔ ہر طرف محبت اور سلامتی کے الفاظ گونجنے لگتے ہیں۔

عید کا آغاز شوال کے نئے چاند سے ہوتا ہے۔ اس طرح عید گویا نئی امیدوں کا تیوہار ہے۔ عید کے ساتھ خدا کی عبادت جڑی ہوئی ہے، یہ چیز انسان کو اس کی اصل حیثیت یاد دلاتی ہے۔ عید میں دوسروں سے ملنا ملانا ہے، یہ بتاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی کنبہ کے افراد ہیں۔ عید میں صدقہ دینا اور کھلانا پلانا ہے، یہ اس بات کا پیغام ہے کہ اپنی خوشیوں میں دوسروں کو شریک کرو۔ عید سے پہلے روزہ رکھنا ہے، یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں پہلے ذمہ داریاں ادا کی جاتی ہیں، اس کے بعد حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ عید ایک اعتبار سے سالانہ تیوہار ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ روزانہ زندگی کے لئے مکمل سبق ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (ہندی وارتا) سے ۲۱ فروری ۱۹۹۶ کو نشر کی گئی۔

قربانی کیوں

روایات میں آتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ما ھٰذہ الاضاحی یا رسول اللہ (اے خدا کے رسول یہ قربانیاں کیا ہیں) آپ نے جواب دیا: سنۃ ابیکم ابراھیم (یہ تمھارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے) گویا عید اضحیٰ میں جانور کو ذبح کرنا اس عظیم تاریخی واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہے جو چار ہزار سال پہلے پیش آیا۔

قربانی، حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو اپنا آئیڈیل بنانے کا عزم ہے۔ یہ ایک وقتی قسم کی سالانہ رسم نہیں بلکہ مستقل زندگی کا ایک سالانہ مظاہرہ ہے۔ قربانی کی عبادت کو آدمی اگر اس کی اصلیت کے اعتبار سے سمجھ کر ادا کرے اسی وقت اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ وہ سال بھر تک اس کے پیغام کو اپنی زندگی میں دہرائے گا۔ اور اگر وہ قربانی کے دن اس کے اصلی مفہوم کو سامنے نہ رکھے تو سال کے بقیہ دنوں میں کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اس کا نمونہ بنائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ۲۱۶۰ ق م میں عراق کے ایک قدیم شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ تورات کے بیان کے مطابق آپ نے ۱۷۵ سال کی عمر پائی۔ آپ کی قوم اس زمانہ میں سورج کو پوجتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کو جو کچھ مل رہا ہے سورج سے مل رہا ہے۔ آپ نے کہنا شروع کیا کہ سورج اور ستارے سب ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ تم لوگ خالق کو پوجو اور اسی سے لو لگاؤ۔ آدمی جس چیز کو مقدس سمجھ لے اس کے بارے میں وہ بہت حساس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قوم آپ کی دشمن ہو گئی۔ توحید کا داعی بننے کی آپ کو یہ قیمت دینی پڑی کہ آپ کے لئے اپنے وطن میں رہنا مشکل ہو گیا۔ دوست اور رشتہ دار سب آپ کے مخالف ہو گئے۔ وقت کے حکمراں طبقہ نے آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ مگر خدا نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو بچا لیا۔ جب پوری قوم نے آپ کو رد کر دیا تو بالآخر آپ اپنے وطن سے نکل پڑے۔ صرف آپ کی بیوی اور آپ کے بھتیجے (حضرت لوطؑ) نے آپ کا ساتھ دیا۔ آپ شام، فلسطین، شرق اردن، مصر اور عرب کے ملکوں میں پھرتے رہے۔ کوئی انسانی بستی ایسی نہیں ملی جو آپ کی دعوتِ توحید کو قبول کرے۔ بالآخر آپ حجاز کے ایک غیر آباد مقام (موجودہ مکہ) پر پہنچے اور خدا کے بھروسہ پر وہاں ریگستان میں اپنے بیوی بچوں کو بسا دیا۔

اب حضرت ابراہیم بوڑھے ہو چکے تھے وہ خدا کی راہ میں اپنی ہر چیز لٹا چکے تھے۔ گھر، خاندان، جائداد، مال، وطن، کوئی چیز نہ تھی جس کو انھوں نے خدا کے حضور پیش نہ کر دیا ہو۔ حتی کہ آگ میں ڈالے جانے والے واقعہ کی صورت میں گویا اپنی جان بھی آپ قربان کر چکے تھے۔ تاہم ایک آخری قربانی ابھی باقی تھی۔ یہ عزیز بیٹے کی قربانی تھی۔ چھیاسی سال کی عمر میں آپ کو پہلی اولاد ملی تھی۔ فطری طور پر اکلوتا ہونہار بیٹا آپ کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا۔ بوڑھے باپ کی تمناؤں کا یہ مرکز جب بڑا ہوا اور باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو خواب کی صورت میں خدا کا حکم آیا کہ اپنے بیٹے کو ہماری راہ میں قربان کر دو۔ تنہائی اور مشقت کی ایک پوری عمر گزارنے کے بعد جو ایک سہارا نصیب ہوا تھا اس کو بھی توڑ دینے کا حکم ہو گیا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ خود اپنے ہاتھ سے اس کو توڑا جائے۔ بوڑھے باپ نے خدا کے حکم کی تعمیل

میں اپنے عزیز بیٹے کی گردن پر چھری رکھ دی۔ عین اس وقت خدا کی طرف سے آواز آئی کہ بس تم نے اپنا خواب پورا کر دیا۔ اس کے بعد فرشتہ نے آپ کو ایک مینڈھا پیش کیا اور آپ نے اپنے بیٹے کے فدیہ میں مینڈھے کو خدا کی راہ میں ذبح کیا۔ یہ واقعہ ہجری ماہ ذی الحجہ کی دس تاریخ کو پیش آیا۔ اس لئے دنیا بھر کے مسلمان اس تاریخ کو جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ یہ قربانی گویا خود اپنی جان کا فدیہ ہے۔ اس طرح قربانی کرنے والا گویا عمل کی زبان میں کہتا ہے کہ خدایا ہماری جانیں تیرے لئے حاضر ہیں۔ آج ہم اپنی حوالگی کی علامت کے طور پر جانور کو پیش کر رہے ہیں اور ہر وقت اس کے لئے تیار ہیں کہ جب بھی تیرا حکم ہو اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو تیری خدمت میں پیش کر دیں۔

ہر بالغ مسلمان جو صاحب نصاب ہو اس کے اوپر قربانی واجب ہے۔ قربانی کے لئے تندرست اور فربہ جانور منتخب کرنا چاہئے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سمنوا ضحایاکم فانها علی الصراط مطایاکم (اپنی قربانی کے جانوروں کو فربہ کرو۔ کیوں کہ وہ پل صراط پر تمھاری سواری ہوں گے) یہ تمثیل کی زبان میں اس بات کی تلقین ہے کہ قربانی کے لئے آدمی کو پورا اہتمام کرنا چاہئے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے دنیا کے سفر میں آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ اچھی سے اچھی سواری کو اپنے لئے منتخب کرے۔ دنیا کی چیزوں میں آدمی جس طرح اہتمام کرتا ہے اسی طرح اس کو ان چیزوں میں بھی اہتمام کرنا چاہئے جو آخرت میں کام آنے والی ہیں۔ جس طرح دنیا کے سفر میں اچھی سواری بخیر و خوبی منزل تک پہنچنے کی ضمانت ہوتی ہے اسی طرح آخرت کے سفر میں بھی وہی شخص سلامتی کے ساتھ منزل تک پہنچے گا جس نے اس کے لئے اپنے امکان کے مطابق "اچھی سواری" کا انتظام کیا ہو۔ ناقص سواری کے ساتھ نہ دنیا کا سفر کامیابی کے ساتھ طے ہو سکتا ہے اور نہ آخرت کا۔

مستحب یہ ہے کہ جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ نذر یا تحفہ آپ کسی ہرکارہ کے ذریعہ بھی بھیج سکتے ہیں۔ مگر وہ نذر جو کسی بڑی ہستی کے پاس بھیجی جا رہی ہو اس کو آدمی خود لے کر حاضر ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کرتا کہ کسی کو چند روپے دے اور کہے کہ بازار سے خرید کر اس کو فلاں صاحب تک پہنچا دینا۔ قربانی محض جانور کا ہدیہ نہیں بلکہ جذبات کا ہدیہ ہے اور اپنے جذبات کا ہدیہ آدمی اپنی ذات ہی کے ذریعہ پیش کر سکتا ہے۔ قربانی کرتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۞ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ (میں نے اپنا رخ کر لیا اس ذات کی طرف جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے، بالکل یکسو ہو کر۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور میری قربانی، میری زندگی اور میری موت خدا ہی کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتا ہوں۔ خدایا تجھ ہی نے دیا ہے اور تیرے ہی لئے قربانی کر رہا ہوں) اس دعا کے الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قربانی کے وقت قربانی کرنے والے کی کیفیات کیا ہونی چاہئیں۔ یہ دعا دراصل مومن کی نفسیاتی حالت کی تصویر ہے۔ قربانی کرنے والا حقیقت میں وہ ہے جو خود اپنی جان کو لے کر مذبح میں پہنچ گیا ہو، جیسے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے

عزیز بیٹے کو ذبح کے لئے لٹا دیا تھا۔ اور جانور کو ذبح کرنا گویا یہ معنی رکھتا ہے کہ خدا نے ازراہ کرم ایک جانور بھیج دیا ہے کہ اس وقت تم اپنی جان کے بدلے اس کو ذبح کر دو۔ قربانی حضرت ابراہیم کے واقعہ کی تمثیل ہے۔ کسی کی قربانی اللہ کی نظر میں اسی وقت قربانی ہے جب کہ وہ ابراہیمی روح کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔

"میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز آدمی کی زندگی کی علامت ہے اور قربانی آدمی کی موت کی علامت۔ نماز میں آدمی اللہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ وہ اپنے جسم و خیال کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہی روح اس کی تمام سرگرمیوں میں مطلوب ہے۔ اس کو دنیا میں اس طرح رہنا ہے کہ اس کی زندگی خدا رخی زندگی بن گئی ہو، جس طرح اس کی نماز خدا رخی نماز ہوتی ہے۔ یہی معاملہ قربانی کا ہے آدمی پر موت اس طرح آنی ہے کہ اس کی موت قربانی کی موت بن گئی ہو۔ اس کا مرنا عام معنوں میں طبعی عمر پوری کر کے مر جانا نہ ہو بلکہ قربانیوں کی ایک مسلسل زندگی کی تکمیل ہو۔ جانور کی قربانی اس بات کا ایک علامتی عزم ہے کہ آدمی اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ کھپاتا رہے گا، یہاں تک کہ اسی حالت میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔

جانور کے ذبح کے فوراً بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے: اللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّی کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ خَلِیْلِکَ اِبْرَاھِیْمَ وَحَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ عَلَیْھِمَا الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ (خدایا میری طرف سے اس قربانی کو قبول فرما جس طرح تو نے اپنے خلیل ابراہیمؑ اور اپنے حبیب محمد سے قبول فرمایا تھا) اس طرح ہم کو بشکل دعا یہ بتایا گیا کہ قربانی کی قبولیت کے لئے اسی جذبہ فدائیت کی ضرورت ہے جو سیدنا ابراہیمؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پیدا ہوئی۔ قربانی کی قبولیت کا راز یہ ہے کہ اس کے پیچھے حقیقی فداکاری کی روح پائی جاتی ہو، وہ فداکاری جو اپنی کامل صورت میں خدا کے نبیوں نے پیش کی۔ قربانی اسی کی قربانی ہے جس نے روزانہ کی زندگی میں اپنے کو قربان کر رکھا ہو نہ کہ سال میں ایک دن جانور کو ذبح کر دینا۔ ابراہیمی قربانی یہ ہے کہ خدا کی راہ میں سب کچھ دے دینے کے بعد آدمی کے پاس صرف اس کی جان رہ گئی تھی جس کو لے کر وہ خدا کے یہاں حاضر ہو گیا۔ مگر خدا نے اپنی رحمت و شفقت کی بنا پر اس کی جان کے بدلے جانور کی قربانی قبول کر لی۔ قربانی کی حقیقت آخری متاع کو بھی اللہ کی راہ میں دے دینا ہے۔ نہ یہ کہ آدمی آخری متاع تک ہر چیز اپنے پاس بچائے رکھے اور سال میں صرف ایک جانور خدا کے نام پر ذبح کر دیا کرے۔

قربانی کی حقیقت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ خدا کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے) گویا خدا کے یہاں جس چیز کی قدر ہے وہ خدا سے ڈرنے والا دل ہے نہ کہ کوئی چوپایہ۔ چوپایہ کی قربانی تو محض دل کی اندرونی حالت کی ایک ظاہری علامت ہے۔ اگر دل کے اندر مطلوب حالت موجود نہ ہو تو اوپر اوپر جانور کو ذبح کر دینا ایسا ہی ہے جیسے دکان کے اندر سامان موجود نہ ہو اور اس کے باہر فرضی طور پر ایک سائن بورڈ لٹکا دیا جائے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۹ کو نشر کی گئی۔

قربانی کی حقیقت

قربانی کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ تم دو، تاکہ جو کچھ تمھارے باہر ہے وہ تم کو مل سکے۔ قربانی اس بات کا سبق ہے کہ اگر تم کچھ پانا چاہتے ہو تو کھونے کا حوصلہ پیدا کرو۔ اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو موت کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ قربانی ایک بے روح رسم نہیں، قربانی ایک زندہ حقیقت ہے جو زندگی سے اسی طرح گہرا تعلق رکھتی ہے جس طرح قدرت کے ابدی قوانین ہماری کائنات سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ قربانی عمل کا خاتمہ نہیں، عمل کا آغاز ہے۔ کبھی ایک چھوٹی سی چیز بھی بڑی چیز ہوتی ہے کیوں کہ وہ کسی بڑی چیز کی علامت ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ قربانی کا ہے۔ یہ بظاہر ایک معمولی جانور کو خدا کے نام پر پیش کرنا ہے۔ مگر وہ ایک عظیم چیز ہے کیوں کہ وہ ایک عظیم چیز کی علامت ہے نہ کہ محض ایک وقتی قسم کی بے روح اور بے معنی رسم۔ جانور کی قربانی آدمی کی طرف سے ایک عزم کی علامت ہے، یہ عزم کہ آدمی اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان بھی اعلیٰ تر مقصد کے لئے قربان کرے گا۔

ایک چھوٹی چیز کس طرح ایک بڑی چیز کی علامت بن جاتی ہے، اس کی وضاحت کے لئے میں قریبی تاریخ کی ایک مثال دوں گا۔ نومبر ۱۹۶۲ کا واقعہ ہے۔ ہندستان کی مشرقی سرحد پر ایک پڑوسی طاقت کی جارحیت کی وجہ سے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ سارے ملک میں سنسنی خیزی کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت قوم کی طرف سے جو مظاہرے ہوئے اس میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ احمد آباد کے ۲۵ ہزار نوجوانوں نے مشترکہ طور پر یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے بچاؤ کے لئے لڑیں گے اور ملک کے خلاف باہر کے حملہ کا مقابلہ کریں گے، خواہ اسی راہ میں ان کو اپنی جان دے دینی پڑے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد انھوں نے یہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص نے اپنے پاس سے ایک ایک پیسہ دیا اور اس طرح ۲۵ ہزار پیسے جمع کئے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے ان پیسوں کو اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسہ دیتے ہوئے انھوں نے ہندستانی وزیر اعظم سے کہا کہ یہ ۲۵ ہزار پیسے ہم ۲۵ ہزار نوجوانوں کی طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے (To give ourselves to you) کا نشان ہیں۔ ان نوجوانوں میں سے ہر ایک نے بظاہر صرف ایک پیسہ دیا تھا جس کی عام حالات میں کوئی قیمت نہیں۔ مگر ان کا پیسہ اس لئے انتہائی قیمتی ہو گیا کہ وہ ایک انتہائی بڑی حقیقت کی علامت تھا۔ ان کے ۲۵ ہزار پیسے ۲۵ ہزار زندگیوں کے نمائندہ تھے۔ پیسہ کی صورت میں گویا وہ خود اپنی زندگیاں اپنے ملک کے لئے دے رہے تھے۔ انھوں نے علامتی طور پر ایک پیسہ قربان کرکے درحقیقت اپنی زندگی کو قربان کرنے کا عزم کیا تھا۔ اسی طرح جانور کی قربانی بھی دراصل ایک عزم کی علامت ہے، اس عزم کی کہ آدمی اپنا سب کچھ حتیٰ کہ اپنی جان بھی اعلیٰ تر خدائی مقصد کے لئے قربان کر دے گا۔

یہ دنیا خدا نے اس ڈھنگ پر بنائی ہے کہ یہاں جو اپنے کو مٹاتا ہے وہی اس دنیا سے اپنے لئے پاتا ہے۔ قربانی اسی خدائی قانون کو یاد دلانے کا ایک سالانہ عمل ہے جو ہماری روزمرّہ کی زندگی میں شامل کرکے ہمیں دیا جاتا ہے۔ قربانی میں آدمی جانور کو خدا کے نام پر ذبح کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کے گوشت کو خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ خدا کے

دیے ہوئے رزق سے کھانا آدمی کی روزانہ کی ضرورت ہے۔ کوئی آدمی کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی عام ضرورت کی چیز کو ایک روز خصوصی طور پر خدا کے نام پر قربان کر کے اس کو ایک اہم سبق دینے کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ قربانی گویا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی وہ قیمت دینے کے لئے تیار ہے جو خدا کی اس زمین میں ایک حقیقی کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسے دینا چاہئے۔

یہ قربانی دنیا کے عمومی نظام سے الگ کوئی چیز نہیں۔ وہ قدرت کا عالم گیر قانون ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ درخت کے ایک بیج کو کولڈ اسٹوریج میں محفوظ کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ ایک بیج کی صورت میں پڑا رہے گا۔ مگر جب اس کو مٹی میں ڈال دیا جائے تو اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوتا ہے۔ اب اس معمولی بیج کے اندر سے ایک ایسا درخت نکلتا ہے جو مزید بے شمار بیج پیدا کرتا ہے اور پیدا کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنے ہرے بھرے وجود سے زمین کی رونق بن جاتا ہے۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں جس سے طرح طرح کے مختلف فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ کولڈ اسٹوریج میں رکھے ہوئے بیج اور مٹی میں ڈالے ہوئے بیج کے انجام میں اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔ مٹی کے بیج نے اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ اس لئے وہ ایک عظیم درخت بن کر زمین پر قائم ہو گیا۔ اس کے برعکس کولڈ اسٹوریج کے بیج نے اپنے کو فنا نہیں کیا۔ اس لئے وہ غیر اہم ہو کر رہ گیا ــــــ ایک بیج اپنے کو مٹاتا ہے تب وہ درخت بنتا ہے۔ درخت اپنے بہترین حاصل کو لٹاتا ہے تب وہ اپنی شاخ پر ایک پھول کھلانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ پھول اپنے حسین وجود کو فنا کرتا ہے۔ تب یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک قیمتی پھل نکلے۔ پھل اپنے وجود کو ختم کرنے پر راضی ہوتا ہے تب ایسا ہوتا ہے کہ وہ اس انسان کا گوشت اور خون بنے جو زمین کو آباد کرے اور خلا کے فاصلوں کو ناپے۔

دنیا میں انسان کے لئے جن کامیابیوں کے امکانات رکھے گئے ہیں ان سب کا زینہ صرف ایک ہے اور وہ قربانی ہے۔ علم میں کمال پیدا کرنا، تجارت میں اعلیٰ مقام پر پہنچنا، سیاست میں اونچا عہدہ حاصل کرنا، اخلاق اور انسانیت کے اعتبار سے ترقی کے درجات طے کرنا، ایک خاندان یا ایک قوم کو اونچا اٹھانا، سب قربانی کی راہ سے حاصل ہوتا ہے اس دنیا کے بنانے والے نے اس کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں کسی قسم کی کوئی کامیابی قربانی کی حد تک کوشش کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ بڑے بڑے الفاظ بول کر یا محض ادھر ادھر کی سرسری کارروائیاں کر کے کوئی بڑی ترقی حاصل کرلے تو یہ ایک ایسی خوش خیالی ہے جو خدا کی اس دنیا میں کبھی واقعہ نہیں بنتی۔

پھر ایک ایسی دنیا میں کیوں کر ممکن ہے کہ خدا قربانیوں کے بغیر کسی سے خوش ہو جائے۔ دنیا میں کسی چیز کو پانے یا نہ پانے کا ایک اصول مقرر کر کے گویا خدا نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انسان کے لئے خدا کو پانے یا نہ پانے کا اصول کیا ہے۔ وہ صرف قربانی ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو پانے کی جو شرط ہے وہی خدا کو پانے کی شرط بھی ہے۔ آدمی اگر اپنے رب کو خوش کرنا چاہتا ہے تو اس کو اپنے رب کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنا پڑے گا۔ خدا اسی کو اپنا سب کچھ دیتا ہے جس نے خدا کو اپنا سب کچھ دے دیا ہو۔ قربانی کی قیمت دیئے بغیر کسی کو خدا کے بنائے ہوئے اس نظام میں کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

پھر جو اصول دنیا میں کامیابی کا ہے وہی اصول آخرت میں کامیابی کا بھی ہے۔ اور آخرت کی دنیا چونکہ موجودہ دنیا سے بہت زیادہ قیمتی ہے اس لئے آخرت کی خاطر جو قربانی مطلوب ہے وہ بھی بہت زیادہ بڑی قربانی ہے۔ اسلام کے نزدیک ہماری زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کا چھوٹا، بہت چھوٹا حصہ موجودہ دنیا میں ہے۔ اور اس کا بڑا، زیادہ بڑا، اور مستقل حصہ آخرت میں، جو مرنے کے بعد ہمارے سامنے آئے گا۔ اگلی دنیا کی کامیابی کا سارا دارومدار بھی، موجودہ دنیا کی طرح، قربانی پر ہے۔ اگلی دنیا گویا بہترین چُنے ہوئے انسانوں کی کالونی ہے۔ آج جو لوگ اپنے فکر و عمل میں بہترین انسان ثابت ہوں گے وہ اگلی دنیا میں جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے اور جو لوگ آج اعلیٰ انسانیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ جہنم کے پُرعذاب ماحول میں دھکیل دئے جائیں گے۔

اچھا انسان بننا کیا ہے۔ اچھا انسان بننا یہ ہے کہ آدمی خدائی سطح پر جینے لگے۔ وہ اپنے اندر خدائی اوصاف پیدا کرے۔ اس مقصد کے لئے آدمی کو شیطان سے لڑنا پڑتا ہے۔ اپنی پوری زندگی کو شیطان کے اثرات سے پاک کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک مسلسل قربانیوں کا راستہ ہے۔ وہی شخص خدا کی جنتی دنیا میں اپنے لئے جگہ پاتا ہے جو اس قربانی کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرسکے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی تمام بے حقیقت خیالات کو اپنے ذہن سے نکالے اور صرف صحیح اور برحق خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دے خواہ یہ فکری آپریشن اس کے لئے اپنے محبوب تصورات کو ذبح کرنے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی اپنے کردار کو حق کی بنیاد پر قائم کرے خواہ اس کی خاطر دنیوی فائدوں اور مصلحتوں کو کچلنا پڑے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی سچائی کے آگے جھک جائے خواہ اس کی قیمت میں اس کو بڑائی کی گدی سے محروم ہوجانا پڑے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آدمی حقیقت پسندی اور اصول پرستی کو اپنی زندگی کا دستور بنائے خواہ اس کی وجہ سے وہ دنیا میں بے جگہ ہوجائے۔

ہر زمانہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں کچھ طریقے رائج ہوجاتے ہیں۔ تعلقات کی کچھ بنیادیں قائم ہوجاتی ہیں۔ کچھ محبوب خیالات آدمی کے ذہن میں جگہ پالیتے ہیں۔ انھیں چیزوں کے بل پر آدمی جی رہا ہوتا ہے۔ وہ خیال اور عمل کے ایک حلقہ سے اپنے کو جوڑ کر ناز کر رہا ہوتا ہے کہ میں نے بہترین حلقہ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرلی ہے۔ اب جب اس کے سامنے حق کی دعوت آتی ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ دعوت اس کی مصلحتوں پر ضرب لگا رہی ہے۔ اس کے تعلقات کو توڑنا چاہتی ہے۔ اس کے ان خیالات کو بے قیمت ثابت کررہی ہے جن کے سہارے وہ اپنے لئے ایک حسین مستقبل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ ان وجوہ سے حق کی دعوت کو قبول کرنا اس کے لئے ایک عظیم قربانی کا عمل بن جاتا ہے۔ یہ اپنی پوری زندگی کو حق کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ مگر یہی وہ قربانی ہے جو آدمی کو خدا کی نظر میں محبوب بناتی ہے۔ یہی وہ قربانی ہے جس سے آدمی کے اوپر ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ اپنے وجود کی قربانی ہی جنت کی واحد قیمت ہے۔ اس قربانی کے بغیر کسی کو خدا کی جنت نہیں ملتی۔

نوٹ: یہ تقریر یکم نومبر ۱۹۷۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

قربانی اسلام میں

حج ایک عالمی اور اجتماعی عبادت ہے۔ اس کی تاریخیں قمری مہینہ کے مطابق مقرر کی گئی ہیں ۔ حج کے مراسم مکہ اور اس کے آس پاس کے مقامات پر پانچ دن کے اندر ، ۸ ذی الحجہ سے ۱۲ ذی الحجہ تک ادا کئے جاتے ہیں۔ اس دوران دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کی جاتی ہے۔ جانور کو ذبح کرتے ہوئے جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے:

اِنّی وَجّھتُ وَجُھیَ لِلّذی فَطَرَ السماواتِ والارضَ حنیفاً وما انا مِن المشرکین اِنّ صَلاتی وَنُسُکی ومَحیایَ ومَماتِی لِلّٰہِ رَبّ العالمین۔ لاشَرِیکَ لَہ وبِذالِکَ اُمِرتُ وَاَنا مِنَ المُسلِمین اَللّٰھُمّ مِنکَ وَلَکَ۔ بِسمِ اللّٰہِ اللّٰہُ اَکبَر

میں نے یکسو ہو کر اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیر لیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ بےشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اے اللہ، یہ تیرا ہی دیا ہوا ہے اور تیرے ہی لئے ہے۔ اللہ کے نام سے، اللہ سب سے بڑا ہے۔

اس دعا میں وہ مقصد پوری طرح جھلک رہا ہے جس کے لئے قربانی کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنا محض ایک علامتی واقعہ ہے۔ اصل چیز جو حاجی سے یا صاحبِ قربانی سے مطلوب ہے وہ اس کی اپنی قربانی ہے۔ اصل مقصود ذاتی ذبیحہ ہے ، جانور کا ذبیحہ تو صرف ایک ظاہری علامت کے طور پر مقرر کیا گیا ہے۔

ذاتی ذبیحہ یا ذاتی قربانی سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد وہ انسان بننا ہے جس کو مذکورہ دعا میں حنیف اور مسلم کہا گیا ہے۔ یعنی سرکشی کا طریقہ چھوڑ کر پوری طرح تابع دار اور فرماں بردار بن جانا۔ اپنی خواہش کو رہنما بنانے کے بجائے خدا کے حکم کو اپنا رہنما بنانا۔ اپنی چیز کو اپنا کسب سمجھنے کے بجائے اس کو خدا کا عطیہ سمجھنا۔ یہی اسلام (حوالگی) قربانی کی اصل روح اور

اس کی اصل اسپرٹ ہے۔ کسی شخص کی قربانی اسی وقت قربانی ہے جب کہ قربانی سے اس کے اندر یہ روح پیدا ہو جائے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اللہ کو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷)

خوراک ہر آدمی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ آدمی اِس دنیا میں کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی خوراک کو قربانی کے ذریعہ ایک بہت بڑے سبق میں ڈھال دیا گیا ہے۔ ذی الحجہ میں خدا کے نام پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، وہ گویا وہی جانور ہے جس کو عام حالات میں بھی ذبح کر کے آدمی اپنی خوراک بناتا ہے۔ مگر حج کی مقدس عبادت کے ساتھ اس کو جوڑ کر اس بات کے سبق کا ذریعہ بنا دیا گیا کہ جس طرح تم جانور کو قربان کرتے ہو، اسی طرح تمہیں اپنے آپ کو قربان کرنا ہے۔ قربانی کے جانور کے گوشت کو صاحبِ قربانی خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ اور اگر وہ مقدار میں زیادہ ہو تو اجازت ہے کہ اس کو آئندہ استعمال کے لئے محفوظ کر لیا جائے۔

قربانی کی ظاہری صورت تو جانور کو ذبح کرنا ہے مگر اس کی روح اور اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ اعلیٰ انسانی تقاضوں کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا جائے۔ مقصد یا آدرش کی راہ میں اپنے آپ کو فنا کر دیا جائے۔ ہر چیز کی ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی اندرونی اسپرٹ ہوتی ہے۔ یہی معاملہ قربانی کا ہے۔ اس کی ظاہری صورت ذبیحہ ہے، اور اس کی اصل اسپرٹ قربانی ہے۔

غور کیجئے تو ایک صحت مند سماج کو بنانے کے لئے واحد سب سے بڑی چیز جو درکار ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے افراد کے اندر قربانی کی اسپرٹ زندہ ہو۔ افراد کی قربانی پر ہی سماج اور قوم کو زندگی ملتی ہے۔ یہی وہ سبق ہے جو قربانی کے ذریعہ صاحبِ قربانی کو دیا جاتا ہے۔

اس کی ایک مثال خود اس حکم کے اندر موجود ہے جو سفر حج کے دوران حاجی کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں حکم ہوا ہے کہ جب حج کے لئے نکلو تو جدال نہ کرو (البقرہ ۱۹۷) یعنی سفر کے دوران تمہارا سابقہ جن لوگوں سے پیش آتا ہے ان سے جھگڑا اور تکرار نہ کرو۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص خواہ مخواہ کسی سے جھگڑا اور تکرار نہیں کرتا۔ اس قسم کے ناخوشگوار واقعات ہمیشہ ردعمل کے طور پر پیش آتے ہیں۔ یعنی ایک ساتھی کی طرف سے کوئی قابلِ شکایت بات پیش آئی، اس پر دوسرا ساتھی بگڑ کر اس سے لڑنے لگا۔

اس حقیقت کو ذہن میں رکھئے تو مذکورہ حکم کا مطلب یہ ہے کہ قابل شکایت بات پیش آنے کے باوجود جھگڑا نہ کرو۔ یہ اعلیٰ اخلاق کی بات ہے، اور اس قسم کا اعلیٰ اخلاق قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ آدمی جب اپنے اندر اٹھنے والے جوابی اشتعال کو دباتا ہے، وہ اپنے منفی جذبات کو قربان کر دیتا ہے، تب جاکر یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھی کی قابل شکایت بات پر اس سے جدال نہ کرے۔ یہ قربانی ہی وہ زمین ہے جس پر وہ اخلاق قائم ہوتا ہے جو حاجی سے مطلوب ہے۔

فرد کے جذبات کی یہی قربانی صحت مند سماج بنانے کی واحد تدبیر ہے۔ جب بہت سے انسان مل کر رہتے ہیں تو لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکراتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر لوگ جواب اور ردعمل کا طریقہ اختیار کریں تو پورا سماج خلفشار کا شکار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی نظام کو بہتر حالت پر باقی رکھنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں برداشت سے کام لیں جس کا دوسرا نام جذبات کی قربانی ہے۔ یعنی آدمی شکایت کو نظر انداز کرے۔ وہ ناگواری کو بھول کے خانہ میں ڈال دے۔ وہ اس طرح کے معاملات میں صبر و ضبط کا طریقہ اختیار کرے نہ کہ جواب اور ردعمل کا۔

قربانی کا سلوک ہی بہتر سماج کے قیام کا واحد ضامن ہے۔ جس سماج کے افراد میں برداشت اور قربانی کا مادہ نہ ہو، اس سماج میں کبھی امن اور انصاف کا ماحول قائم نہیں ہو سکتا۔ افراد کی قربانی سماج کو زندگی عطا کرتی ہے۔ جس سماج کے افراد قربانی والی روش پر راضی نہ ہوں، اس سماج کو اس دنیا میں زندگی اور ترقی کی نعمت بھی نہیں مل سکتی۔

قربانی کا طریقہ ہر مذہب میں رائج رہا ہے۔ یہ ایک مذہبی رسم ہے جس میں کسی چیز کو خدا کی نذر کیا جاتا ہے تاکہ اس کا تقرب اور وسیلہ حاصل کیا جائے۔ یہ طریقہ ہر مذہب میں اور ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے۔ یہ خدائے کبیر کے سامنے انسانِ صغیر کا نذرانہ ہے۔ آخری چیز جو کسی کے سامنے پیش کی جائے وہ جان ہے۔ انسان جب خدا کی عظمت سے سرشار ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اپنی جان اس کے اوپر فدا کر دے۔ اس موقع پر گویا اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی عنایت سے آدمی کی جان کے فدیہ کے طور پر جانور کی قربانی کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انسان کو موقع دیتا ہے کہ وہ زندہ رہ کر دنیا میں اعلیٰ مقصد کے لئے کام کرے۔ وہ اپنی سرفروشی کے جذبات کو تعمیری راہوں کی طرف موڑ دے۔

حج میں ضبط و تحمل کا تعلق محض انسانوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ جانوروں تک کے بارہ میں حاجیوں کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے:

عن ابنِ عباسٍ اَنّہ دفع معَ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یومَ عرفۃَ فسمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم وراءَہ زَجراً شدیداً وضرباً لِلإبِلِ۔ فاشار بسوطہ الیہم وقال: یاایہا الناسُ، علیکم بالسَّکِینَۃِ فاِنَّ البرَّ لیسَ بالایضاع (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوچ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیچھے سخت ڈانٹ سنی اور اونٹ کو مارتے دیکھا۔ آپ نے اپنے کوڑے سے ان کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، تم پر سکون لازم ہے۔ کیوں کہ نیکی تیز چلنے کا نام نہیں۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۵ جولائی ۱۹۸۸ کو نشر کی گئی۔

ایثار اور قربانی کی تجدید

عیداضحیٰ کا تیوہار، دوسرے تاریخی تیوہاروں کی طرح ، ایک بڑے تعمیری اور انقلابی واقعہ کی یادگار ہے۔ ہر سال ہجری کلنڈر کے آخری مہینہ میں اس دن کو عیداضحیٰ کے طور پر اس لیے منایا جاتا ہے کہ لوگ اس دن پیش آنے والے عظیم واقعہ کو یاد کریں اور اس کو اپنی زندگیوں میں داخل کرنے کا عہد کریں۔ یہ دن، ایک لفظ میں، ایثار اور قربانی کی یادگار ہے، وہ ایثار اور قربانی کی تجدید کا دن ہے۔

عیداضحیٰ جس عظیم واقعہ کی یادگار ہے، وہ تقریباً چار ہزار سال پہلے پیش آیا۔ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام، جو عراق کے متمدن ملک میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے بیٹے اسماعیل کو قربان کر دیا۔ یہ قربانی حقیقۃً جسم پر لوہے کی چھری چلانا نہ تھا بلکہ اپنی پوری زندگی پر صبر کی چھری چلانے کے ہم معنی تھا۔ یہ حق کی خاطر اپنی ذات کو نظر انداز کرنا تھا۔ یہ ایک بڑے مقصد کی خاطر چھوٹے تقاضوں کو چھوڑ دینا تھا۔ یہ اپنی منزل کی طرف ہر حال میں آگے بڑھنا تھا، خواہ اس کے لیے اپنی عزیز ترین متاع سے دست بردار ہو جانا پڑے۔

عیداضحیٰ کی مناسبت (relevance) ہمارے لئے کیا ہے۔ اور یہ دن ہم سے کس قسم کے ایثار و قربانی کا تقاضا کرتا ہے، اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی حقیقت کیا تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی اہمیت کو جاننے کے بعد ہی ہم اپنی زندگیوں میں اس کی اہمیت کو جان سکتے ہیں۔ اور اس کو عملی طور پر اختیار کر سکتے ہیں۔

ابتدائی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خواب کے مطابق اپنے عزیز بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کر دینا چاہا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے روک دیا۔ اسماعیلؑ کی جان کے فدیہ کے طور پر انہیں مینڈھا ذبح کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اور حضرت اسماعیلؑ کے لیے یہ حکم ہوا کہ ان کو لے جاکر عرب کے صحرا میں بسا دیں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل منشا بیٹے کا وقتی جسمانی ذبیحہ نہ تھا بلکہ اس کا مستقل نفسیاتی ذبیحہ تھا۔ کیونکہ اس وقت عرب کے صحرا میں کسی ذی حیات کو بسانا اس کو مستقل طور پر ذبح کی حالت میں ڈال دینے کے ہم معنی تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ ایک وسیع اصلاحی انقلاب دنیا میں لایا جائے جو ساری انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے افراد کی ایک ٹیم درکار تھی۔ اسی طاقتور ٹیم کو تیار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کو استعمال فرمایا۔

اس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ ایک ایسا انسانی گروہ تیار کیا جائے جو تمدنی خرابیوں سے پاک ہو جس کے اندر فطری انسانی اوصاف زندہ ہوں۔ جو ان تمام اعلیٰ خصوصیتوں کا مجموعہ ہو جس کو المروۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی نسل شہر کی مصنوعی فضا میں نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے لئے فطرت کا سادہ ماحول درکار تھا۔ یہی منصوبہ ہے جس کی تکمیل ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے ذریعہ انجام پائی۔ حضرت ابراہیم نے اس اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو عراق کی تمدنی فضا سے نکالا اور ان کو لا کر عرب کے غیر آباد علاقہ میں ڈال دیا۔ اس وقت وہاں ریت اور پتھر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں زندگی کا کوئی سامان پایا نہ جاتا تھا۔ تاہم اس بے سامان ماحول میں سب سے بڑا سامان موجود تھا۔ — وہ سادہ ماحول جہاں انسان اپنی فطرت پر پرورش پائے، جہاں اس کے پیدائشی انسانی اوصاف کو آزادانہ ترقی کرنے کا موقع ملے۔

اللہ تعالیٰ نے اس خشک اور خالی علاقہ کو مطلوبہ نئی نسل تیار کرنے کے لئے منتخب کر لیا۔ یہ گویا ایک عظیم صحرائی تربیت گاہ تھی جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو لا کر بسا دیا۔ حضرت اسماعیل جب بڑے ہوئے تو انہوں نے ایک صحرائی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح اس صحرائی ماحول میں وہ نسل بننا شروع ہوئی جو بعد کو بنو اسمٰعیل کہلائی۔

یہی بنو اسماعیل ہیں جن کے منتخب افراد کا نام اصحاب رسول ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اسی قوم (بنو اسماعیل) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ان کو توحید کے نظریہ پر جمع کیا اور پھر ان کو لے کر وہ عالمی اسلامی انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ یہ بنو اسماعیل تاریخ کے انوکھے لوگ تھے جو اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے بجا طور پر ان کو ہیروؤں کی نرسری کہا ہے۔

عید اضحیٰ کے دن جانور کی جو قربانی دی جاتی ہے وہی اصل قربانی نہیں ہے۔ وہ اصل قربانی کی صرف ایک علامت ہے۔ اصل میں تو ہمیں خود اپنے آپ کو قربان کرنا ہے۔ جانور کی قربانی علامتی قربانی ہے۔ وہ اس لئے کرائی جاتی ہے تاکہ لوگوں میں قربانی کی اعلیٰ روح زندہ رہے۔ تاکہ وہ ایک عملی واقعہ کے ذریعہ اس کو یاد کرتے رہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس مقصد کی طرف انہیں کس طرح آگے بڑھنا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو قربانی دی، اس کی حیثیت ایک اعلیٰ مثال کی ہے۔ تاہم اس کی پیروی ہمیں اس کی اصل روح کے اعتبار سے کرنا ہے نہ کہ اس کی ظاہری شکل کے اعتبار سے۔ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں قربانی کرنے والے لوگ اس کی ظاہری پیروی میں صحرا میں جا کر بس جائیں اور وہاں اس پُرمشقت تاریخ کو دہرانا شروع کر دیں جو حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کے ساتھ قدیم عرب میں پیش آئی تھی۔ بعد کے زمانہ کے لوگوں کو اس قربانی کی اسپرٹ کو اپنانا ہے۔ اس واقعہ کی شکل زمانی ہے۔ مگر اس کی جو اسپرٹ ہے وہ دوامی اہمیت رکھتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے انسانیت کے بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے یہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو متمدن دنیا سے نکال کر غیر آباد صحرا میں لے گئے۔ سرسبز و شاداب عراق کو چھوڑ کر وہ عرب کے خشک بیابان میں جا بسے۔ ظاہری فرق کے ساتھ یہی قربانی اپنے دائرہ میں ہر شخص سے مطلوب ہے۔ ہر ایک کا ایک ”سرسبز عراق“ ہے۔ اور

ہر ایک کو اپنے سرسبز وشاداب عراق کو چھوڑ کر ''صحرائے عرب'' میں جا کر آباد ہو جانا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آج کے حالات میں یہ ابراہیمی واقعہ کس پہلو سے مطلوب ہے اور خدا ہم سے کس قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ آج کے حالات میں بہتر دنیا کی تعمیر کے لیے افراد سے جو قربانی مطلوب ہے وہ اپنی شکل کے اعتبار سے خواہ جو بھی ہو، مگر اپنی روح کے اعتبار سے وہ ابراہیمی قربانی قرار پائے گی۔ اور اس میں فائیت کا ثبوت دینے والے کو وہی کریڈٹ ملے گا جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔

اب اس لحاظ سے سوچیئے کہ آج کے حالات میں سنت ابراہیمی کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ وہ کون سی قربانی ہے جو آج کے حالات میں ہم سے مطلوب ہے۔

ابراہیمؑ و اسماعیل علیہما السلام نے ایک بہت مخصوص اور منفرد قسم کی قربانی پیش کی تھی۔ یہ ایک انتہائی انداز کی قربانی تھی جیسی قربانی دوبارہ کوئی شخص پوری انسانی تاریخ میں پیش نہ کرسکا۔ اس طرح یہ تمام انسانوں کے لیے ایک ممتاز اور معیاری نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح آئندہ تمام لوگوں کو اپنے اپنے دائرہ میں اور اپنے اپنے امکان کے بقدر قربانی پیش کرنا ہے۔ عید اضحیٰ کا دن ہر شخص کو اسی ذمہ داری کا سبق دیتا ہے۔

اس ایثار و قربانی کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بھی ہوسکتی ہے اور بڑی سے بڑی بھی۔ بس میں سفر کرتے ہوئے جب آپ ایک خاتون یا ایک بوڑھے مسافر کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی سیٹ دوسرے انسان کے حوالے کر دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ ایک ادارہ میں عہدیدار ہیں۔ آپ کے سامنے ایک زیادہ بہتر شخص آتا ہے۔ آپ عہدہ کی کرسی اس کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ کے اندر ایک شخص کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکتی ہے۔ آپ اپنے غصہ اور نفرت کی آگ کو صبر و برداشت کے پانی سے بجھا دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ کے پاس مادی وسائل زیادہ ہیں اور آپ کے ایک بھائی کے پاس کم۔ آپ اپنے

مادی وسائل کا ایک حصہ اپنے بھائی کو دے دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ اس طرح قربانیوں کا یہ سلسلہ پوری زندگی میں اور ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس قربانی کے بغیر بہتر سماجی زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

زندگی میں کوئی بڑا کام کبھی قربانی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہر بڑا کام لازمی طور پر فنائیت مانگتا ہے۔ قوم کو اوپر اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو پیچھے کرلینا، ملک کی ترقی کے لیے ذاتی نقصان کو گوارا کرلینا، انسانیت کو اونچا کرنے کے لیے اپنے جھنڈے کو نیچا کرلینا، اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنی خواہشات کو دبانا، اصول کو قائم کرنے کی خاطر اپنی انا کو کچل دینا، پڑوسی کو امن دینے کی خاطر اپنے آپ پر پابندی لگانا، اس طرح کی تمام چیزیں قربانی کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی وہ قربانی ہے جس کی اہمیت کو بتانے کیلئے عید اضحیٰ کا تیوہار منایا جاتا ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء کو نشر کی گئی۔

قربانی کا تصور اور ہمارا معاشرہ

عید اضحیٰ کے موقع پر ہر سال جو قربانی کی جاتی ہے، اس کا تعلق انسانی زندگی سے بہت گہرا ہے۔ وہ صحت مند زندگی کی تعمیر کی علامت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں قربانی ایک سالانہ رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب وہ ایک بے روح مذہبی روایت کے طور پر زندہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ سال کے مخصوص دنوں میں رسمی طور پر جانور تو ذبح کر دیتے ہیں۔ مگر اس کا کوئی اثر ان کی زندگیوں میں نظر نہیں آتا۔ قربانی کا عمل اگر زندہ اسپرٹ کے ساتھ کیا جائے تو ہمارا پورا معاشرہ بالکل بدل جائے۔

قرآن میں قربانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو اس کا گوشت اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے (الحج ۳۷) گوشت اور خون جانور کے جسم میں ہوتا ہے جس کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اور تقویٰ اس آدمی کے دل کی چیز ہے جو ذبح کرنے والا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اگرچہ جانور کو خدا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، مگر یہ حقیقتہً اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں قربانی جانور کا ذبیحہ نہیں بلکہ خود اپنا ذبیحہ ہے۔ یہ ذبح ہونے والے سے زیادہ ذبح کرنے والے کی تصویر ہے۔ بظاہر وہ ایک خارجی عمل ہے مگر باعتبار حقیقت وہ ایک اندرونی عمل ہے۔ اسی شخص کی قربانی صحیح قربانی ہے جس کی ظاہری قربانی اس کی اندرونی قربانی میں ڈھل جائے۔

جانور کو ذبح کرکے آدمی اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خدا کی خاطر اپنی انا کو ذبح کرے گا۔ وہ اپنے مفادات کو قربان کرکے سچائی کے طریقہ پر قائم رہے گا۔ وہ مصلحتوں کو نظر انداز کرکے خدا کے حکم پر چلنے والا بنے گا۔ اس کا نفس اگر خدا کے راستہ میں چلنے میں رکاوٹ بنے گا تو وہ اپنے نفس پر چھری چلا دے گا مگر خدا کے راستہ سے ہٹنا گوارہ نہیں کرے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو (الکوثر) یہ آیت ایک اعتبار سے، دین کے دو پہلوؤں کو بتاتی ہے۔ ایک عجز و تواضع، اور دوسرے

ایثار وقربانی۔ نماز عجز کی علامت ہے اور جانور کا ذبیحہ قربانی کی علامت۔ یہ گویا دو بنیادیں ہیں جن کے اوپر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ایک اعتبار سے اس کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں عجز مطلوب ہے، اور بندوں کے مقابلہ میں قربانی درکار ہے۔ اللہ بڑا ہے، ہم چھوٹے ہیں۔ اللہ دینے والا ہے، ہم پانے والے ہیں۔ اللہ آقا ہے۔ ہم اس کے بندے ہیں۔ اس اعتبار سے اللہ کے مقابلہ میں واحد چیز جو مطلوب ہو سکتی ہے، وہ عجز و تواضع ہی ہے۔ یہاں بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے بے کمال ہونے کو مانے، وہ اللہ کے مقابلہ میں عاجزی اور فرماں برداری کا طریقہ اختیار کرے۔

قربانی کا عمل کئی اعتبار سے بندوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اس اخلاقی برتاؤ اور انسانی سلوک کا خلاصہ ہے جو قربانی کرنے والے کو اپنے معاشرہ کے اندر پیش آتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کے لئے لٹانا چاہا تو حضرت اسماعیل نے اپنے مقدس باپ سے کہا کہ آپ کو خدا کی طرف سے جو حکم ملا ہے، اس کو کر ڈالئے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والا پائیں گے (الصافات ۱۰۲) اس سے معلوم ہوا کہ قربانی کی حقیقت صبر ہے۔ قربانی اس کے بغیر انجام نہیں پا سکتی کہ آدمی پوری طرح صبر و برداشت کرنے والا بن جائے۔ قربانی کر کے آدمی علامتی طور پر اپنے اس ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں حضرت اسماعیل کی طرح صبر کرنے والا بنے گا۔

صبر اچھے معاشرہ کی واحد بنیاد ہے۔ صبر کے بغیر کبھی صالح اور صحت مند معاشرہ نہیں بن سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بہت سے آدمی مل کر رہتے ہیں تو ان میں بار بار ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو ایک دوسرے کے لئے ناخوشگواری کا باعث ہوتی ہیں۔ ایسا ایک گھر کے اندر بھی ہوتا ہے۔ ایک بستی میں بھی ہوتا ہے اور ایک پوری قوم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک کمرہ میں پتھر کے بہت سے اسٹیچو رکھے ہوئے ہوں تو ان کے درمیان آپس میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہوگا۔ مگر جہاں زندہ انسان بستے ہوں وہاں اختلاف اور شکایت کا پیش آنا ضروری ہے۔

ایسی حالت میں معاشرہ کو انتشار اور فساد سے بچانے کا واحد راز یہ ہے کہ اس کے افراد

کے اندر صبر کا مادہ ہو۔ لوگ ایک دوسرے کی طرف سے پیش آنے والی ناگواریوں کو برداشت کرلیا کریں۔ لوگ شکایتوں سے اوپر اٹھ کر ایک دوسرے سے معاملہ کریں۔

یہ صبر ہمیشہ قربانی مانگتا ہے۔ قربانی کے بغیر صبر و برداشت کا رویہ ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے رویہ سے کسی کے وقار کو ٹھیس لگتی ہے۔ کسی کا سلوک کسی کی انانیت کو بھڑکا دیتا ہے۔ کسی کی کوئی روش کسی کے لئے اشتعال پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ ایسے ہر موقع پر گویا آدمی کے اندر ایک حیوان جاگ اٹھتا ہے۔ اب آدمی کو اپنے اندر جاگنے والے اس حیوان کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اس اندرونی حیوان کی قربانی ہی در اصل حقیقی قربانی ہے۔ کیوں کہ اسی قربانی سے سچی حق پرست زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ صالح معاشرہ بنتا ہے جس کو حقیقی معنوں میں صالح اور صحت مند معاشرہ کہا جاسکے۔

اختلاف اور شکایت کے مواقع پر جاگنے والے اندرونی حیوان کو ذبح کرنا ہی وہ اصل قربانی ہے جو اللہ کو مطلوب ہے۔ اس قربانی کو پیش کرکے آدمی اس اعلیٰ عمل کا ثبوت دیتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ (الحج ۳۷) کہا گیا ہے۔

جب آدمی اس نفسیاتی حیوان کی قربانی دیتا ہے، اس کے بعد ہی اس کے اندر وہ مطلوب صفت پیدا ہوتی ہے جس کو صبر کہا گیا ہے۔ صبر و برداشت اور عفو و اعراض صالح معاشرہ کے قیام کے لئے ناگزیر طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ صفتیں اندرونی حیوان کو ذبح کرنے کے بعد ہی حقیقی طور پر کسی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن میں قربانی کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ لوگ حج کے لئے آئیں اور چند معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں دئے ہیں۔ پس تم اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ (الحج ۲۸)

اس آیت سے قربانی کے دو مزید پہلو معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، خواہ وہ ذبیحہ کا جانور ہو یا کوئی اور ضرورت کی چیز، ان سب کو استعمال کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ چیزوں کے استعمال پر اللہ کا نام لینا، در اصل اس واقعہ

کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ سب چیزیں براہ راست خدا کا عطیہ ہیں۔ اس نے انسانوں کی حاجت اور ضرورت کے لئے یہ تمام چیزیں پیدا کر رکھی ہیں۔ اب ہم سے یہ مطلوب ہے کہ ہم ان کو خدا کا عطیہ سمجھ کر انھیں استعمال کریں نہ کہ ان کو اپنی عقل یا اپنے دست و بازو کا کارنامہ سمجھ لیں۔

قربانی کے موقع پر جو جانور ذبح کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حکم ہے کہ اس کو کھاؤ اور کھلاؤ۔ اس طرح قربانی کا عمل آدمی کے اندر فیاضی اور باہمی ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کی اسپرٹ ابھارتا ہے۔ وہ سبق دیتا ہے کہ تم خود کھانے پر اکتفا نہ کرو بلکہ دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ تم اپنی کمائی کو صرف اپنی چیز نہ سمجھ لو بلکہ اس میں دوسروں کا بھی حصہ سمجھو۔ تم صرف اپنا معاملہ درست کر کے مطمئن نہ ہو جاؤ بلکہ دوسروں کے معاملات بھی درست کرنے کی کوشش کرو۔ تم ایک انفرادی انسان بن کر نہ رہو بلکہ معاشرہ کے ایک مفید فرد کی حیثیت سے زندگی گزارو۔ تم انسانیت کے کُل کا ایک صالح جزء بن جاؤ۔

ان پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ قربانی ایک زندہ عمل ہے، نہ کہ محض ایک بے روح قسم کی تاریخی رسم۔ قربانی کا پیغام یہ ہے کہ اپنے وجود کے حیوانی حصہ کو دباؤ اور اپنے وجود کے انسانی حصہ کو زندہ کرو۔ یہی قربانی کی اصل حقیقت ہے اور یہی قربانی کا اصل پیغام۔

نوٹ : یہ تقریر ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عید اضحیٰ

عید اضحیٰ کے معنی ہیں قربانی کی عید۔ اس سالانہ تیوہار کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر قربانی کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ تاہم اس قربانی کا اصل مطلب جانور کو ذبح کرنا نہیں ہے۔ جانور کا ذبیحہ اصل قربانی کی علامت ہے نہ کہ وہی اصل قربانی ہے۔

قربانی حضرت ابراہیم کی یادگار ہے۔ اسی کو ہر سال ہم اپنی زندگی میں دہراتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم سے اللہ تعالیٰ کو ایک خاص منصوبہ مکمل کرانا تھا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ آپ کے بیٹے اسماعیل کو عرب کے غیر آباد علاقہ میں بسا دیا جائے جہاں اس وقت صحرا اور پہاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں فطرت اور جفاکشی کے ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک تازہ دم اور جاندار نسل تیار ہو جس میں اعلیٰ انسانی اوصاف ہوں۔ جس کے اندر ہر قسم کی عملی صلاحیت پائی جائے۔ اس طرح کی ایک زندہ نسل تیار کر کے اس کو نیا انقلاب برپا کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ وہ آنے والے مصلح اعظم کو انسانوں کی ایک طاقت ور ٹیم دے سکے۔

قدیم عرب کے ماحول میں کسی بچہ کو بسانا اس کو گویا ذبح کر دینا تھا۔ یہی حقیقت حضرت ابراہیم کو خواب میں اس طرح دکھائی گئی کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔ یہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ مگر حضرت ابراہیم کمال اطاعت کے جذبہ کے تحت حقیقی طور پر اس کی تعمیل کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح آخری طور پر ثابت ہو گیا کہ آپ اپنی اولاد کو خدا کے مذکورہ منصوبہ میں دینے کے لئے بلا جھجک آمادہ ہیں۔

اس وقت اللہ کی طرف سے ایک دنبہ دیا گیا اور حضرت ابراہیم سے کہا گیا کہ اس دنبہ کو فدیہ کے طور پر ذبح کر کے اپنا خواب پورا کرو اور اپنے بیٹے کو اصل قربانی کے لئے صحرا میں بسا دو۔ وہاں کے پر مشقت ماحول میں ایک نئی نسل بنے گی۔ اور جب یہ نسل تیار ہو جائے گی تو وہ اپنی جد و جہد سے ایک عظیم انقلاب لائے گی اور دنیا کو ایک نئے دور میں داخل کرے گی۔ چنانچہ اسی نسل سے صحابۂ کرام نکلے جو اعلیٰ ترین انسانی کردار کے حامل تھے اور انھوں نے دنیا میں

اعلیٰ ترین انقلاب برپا کیا۔

عید اضحیٰ اسی ابراہیمی تاریخ کو تیوہار کی صورت میں دہرانے کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے وقت میں اس کو ایک خاص صورت میں دہرایا۔ آئندہ بھی یہ ابراہیمی عمل جاری رہے گا۔ البتہ اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

عید اضحیٰ کے موقع پر جب ایک شخص جانور کو ذبح کرتا ہے تو وہ اپنی زبان سے عربی کے وہ الفاظ کہتا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: بے شک میری عبادت اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ خدایا، تجھی نے دیا ہے اور تجھی کو میں اسے لوٹاتا ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی قربانی تو خود اپنی ذات کی ہے۔ اصل قربانی یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کو بچائے بغیر اس کو خدا کے حوالے کر دے۔ وہ اپنے وجود کی حوالگی کے لئے خدا سے عہد کرتے ہوئے بطور علامت ایک جانور کو ذبح کر رہا ہے، جس طرح حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو خدا کے منصوبہ کے حوالے کرتے ہوئے ایک جانور کو فدیہ کے طور پر ذبح کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے لئے دنبہ کو ذبح کرنا علامتی معنوں میں تھا۔ اسی طرح آج عید اضحیٰ کے موقع پر یا حج کے موقع پر جانور کو ذبح کرنا بھی ایک علامتی عمل ہے نہ کہ وہی اصل عمل۔

علامتی ذبیحہ کے لئے جانور کا انتخاب سب سے زیادہ فطری انتخاب ہے۔ یہ گویا معمول کے حالات کو ایک غیر معمولی سبق کے لئے استعمال کرنا ہے۔ خدائی شریعت کے مطابق، آدمی بار بار ایسا کرتا ہے کہ وہ جانور کو اپنی خوراک کے لئے ذبح کرتا ہے۔ اسی عمل کو ایک دن نیا عنوان دے دیا گیا۔ گویا کہ ایک ہونے والی بات میں مزید ایک سبق کا پہلو پیدا کر دیا گیا۔

عید اضحیٰ اسی ابراہیمی تاریخ کو تیوہار کی صورت میں دہرانے کا دن ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے وقت میں اس کو ایک خاص صورت میں دہرایا۔ آئندہ بھی یہ ابراہیمی عمل جاری رہے گا، البتہ اس کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کی علامتی صورت تو ہمیشہ ایک رہے گی۔ یعنی عید قرباں کے موقع پر جانور کو ذبح کرنا۔ مگر اسپرٹ کے اعتبار سے اس کی صورتیں ایک سے زیادہ ہوسکتی ہیں۔ جس وقت اسلام کو جس قسم کی مشقت اور قربانی مطلوب ہو، اس

وقت اس کی تعمیل کی جائے گی۔
مثلاً موجودہ زمانہ میں اسلام کا ایک بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مسلم قوم کے تقریباً تمام اعلیٰ صلاحیت والے لوگ حب عاجلہ میں مبتلا ہیں۔ وہ آجلہ کے لئے عمل کرنے پر راضی نہیں۔ وہ شہرت کے میدانوں میں اپنی ساری طاقت لگا رہے ہیں۔ وہ کام جو اخبار میں چھپے، جس سے فوراً لیڈری ملتی ہو۔ جو آدمی کو عمومی سطح پر باعظمت مقام دیتا ہو۔ آج تمام اعلیٰ صلاحیت کے لوگ اسی قسم کے کاموں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ وہ سنجیدہ اور خاموش تعمیری کام میں اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں۔
لوگ عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کی قربانی کرتے ہیں۔ مگر حقیقی قربانی کا میدان جہاں انھیں اپنی ذات کو اور اپنی صلاحیتوں کو وقف کرنا چاہئے، وہاں اپنے آپ کو وقف کرنے کے لئے تیار نہیں۔
آج اسلام کے لئے اسی قسم کی قربانی کی ضرورت ہے۔ آج ضرورت ہے کہ دنیا کی ترغیبات کو چھوڑ کر آخرت کی ابدی نعمتوں کے لئے قربانی دی جائے۔
اس مطلوب عمل کی علامت کے لئے جانور کی قربانی کا طریقہ اختیار کرنا گویا ہماری عام زندگی میں اس کو شامل کر دینا ہے۔ خدا کی شریعت کے مطابق، آدمی بار بار ایسا کرتا ہے کہ وہ جانور کو اپنی خوراک کے لئے ذبح کرتا ہے۔ عید اضحیٰ کے موقع پر جانور کے اسی ذبیحہ کو ابراہیمی یادگار کے طور پر بطور علامت انجام دینے کا حکم دیدیا گیا۔ اس طرح ایک ہونے والی بات کو مزید ایک اعلیٰ سبق کا ذریعہ بنا دیا گیا۔
عید اضحیٰ کے دن صبح کو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد جانور کی قربانی دی جاتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو اظہار ہیں۔ نماز بھی حوالگی اور سپردگی کا عہد ہے اور قربانی بھی حوالگی اور سپردگی کا عہد۔ نماز میں رکوع اور سجدہ کے ذریعہ اپنی حوالگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور قربانی میں جانور کے ذبیحہ کی صورت میں۔ گویا نماز کے ذریعہ آدمی یہ کہتا ہے کہ جہاں مجھ کو خدا کے آگے جھکنا ہوگا وہاں میں جھک جاؤں گا، اور قربانی کے ذریعہ وہ کہتا ہے کہ جہاں مجھے اپنی جان پیش کرنی ہوگی وہاں میں اپنی جان پیش کر دوں گا۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۸ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تبعیت میں آپ کی پوری امت کو قربانی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سورہ کا ترجمہ یہ ہے :

ہم نے تم کو کوثر دے دیا۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ بے شک تمہارا دشمن ہی بے نام ونشان ہے (الکوثر)

کوثر کے معنی خیر کثیر کے ہیں۔ یعنی بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔ پیغمبر اسلام کو یہ خیر کثیر اپنے کمال درجہ میں دیا گیا۔ بعد کے امتیوں کو وہ ان کے عملی استحقاق کے اعتبار سے دیا جائے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ اس قسم کا کام ہمیشہ قربانی کی سطح پر انجام دیا جاتا ہے۔ یہ کام بلاشبہ اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ یہ مشکل ترین کام آپ نے عظیم ترین قربانی کے ذریعہ انجام دیا۔ حتی کہ اس دعوت کی راہ میں آپ کو اپنی ہر چیز کھو دینی پڑی۔

آپ اپنی قوم سے کٹ گئے، آپ کی معاشی زندگی برباد ہوگئی۔ آپ کی اولاد کا مستقبل تاریک ہوگیا۔ تھوڑے لوگوں کے سوا کسی نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر آپ ہر قسم کی قربانی دیتے ہوئے اس پر قائم رہے، یہاں تک کہ اللہ کی طرف سے آپ پر یہ بشارت اتری کہ تم کو کوثر (خیر کثیر) دے دیا گیا۔ ہر قسم کی اعلیٰ ترین کامیابی دنیا اور آخرت میں تمہارے لئے ابدی طور پر لکھ دی گئی۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی بعد کے سالوں میں کامل طور پر آپ کے حق میں پوری ہوئی۔

عید اضحیٰ اسی قربانی کے عہد کا دن ہے جو تمام اعلیٰ کامیابیوں کا زینہ ہے۔ اس دنیا میں وہی لوگ بڑا درجہ حاصل کرتے ہیں جو اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ ہر حال میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔ وہ مشقتوں اور قربانیوں کی قیمت دے کر اپنے فرض منصبی کو ادا کریں گے۔

نوٹ : یہ تقریر ۲۳ جون ۱۹۹۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

فلسفۂ قربانی

قربانی اپنے ظاہر کے اعتبار سے یہ ہے کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ خود اپنے آپ کو ذبح کرنا ہے۔ قربانی کا مقصد ایک ظاہری واقعہ کے ذریعہ باطنی کیفیت پیدا کرنا ہے۔ قربانی بظاہر ایک خارجی عمل ہے مگر اپنی روح کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک داخلی عمل ہے۔

قرآن میں قربانی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ : اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کی نشانیوں میں سے بنایا ہے۔ ان میں تمہارے لئے بھلائی ہے۔ پس ان کو کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لو۔ پھر جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور بے سوال محتاج اور سائل کو کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تاکہ تم شکر ادا کرو۔ اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس طرح اللہ نے ان کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور نیکی کرنے والوں کو خوشخبری دے دو (الحج ۳۶۔ ۳۷)

قرآن کی اس آیت میں جانور کی قربانی کو نشانی (شعیرہ) کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کی قربانی بذات خود مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک نشانی یا علامت ہے۔ اس کے ذریعہ سے جو اصل چیز مطلوب ہے وہ تقویٰ ہے۔ قربانی کا مقصد یہ ہے کہ ایک علامتی عمل کے ذریعہ تقویٰ کی روح آدمی کے اندر پیدا کی جائے۔

اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ قربانی کا فلسفہ یا قربانی کی اصل حقیقت نفسیاتی قربانی ہے۔ جانور کا ذبیحہ اپنے جذبات اور اپنی خواہشوں کے ذبیحہ کی تربیت ہے۔ قرآن کا سبق یہ ہے کہ اپنے اندر ابھرنے والی بری خواہشوں کو کچلو، اپنی نفسیاتی برائیوں کو زیر کرو۔

انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کو نفس امّارہ کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا نفس امّارہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کے اندر غصہ ،

نفرت، انتقام، حسد، کینہ، خودغرضی جیسے برے جذبات ابھر آتے ہیں۔ یہ آدمی کا امتحان ہے۔ اس امتحان میں پورا اترنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے ان جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ وہ ہر ایسے جذبہ کو دبانے کے لئے مستعد رہے۔

اسی کا نام نفسیاتی قربانی ہے، اور اسی نفسیاتی قربانی کی عملی تربیت کے لئے جانور کی قربانی کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ مذکورہ آیت میں فرمایا کہ "اللہ کو جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا اللہ کو صرف تمہارے دل کا تقویٰ پہنچتا ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جانور کی قربانی اگر ذاتی نفسیات کی قربانی نہ بنے تو ایسی قربانی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہو سکتی۔

موجودہ دنیا میں انسان کی پوری زندگی قربانی کی زندگی ہے۔ آدمی اگر قربانی کے لئے تیار نہ ہو تو وہ اس دنیا میں کبھی صحیح اور سچی زندگی نہیں گزار سکتا۔

اس دنیا میں آدمی کو اپنے حق کی پروا کئے بغیر اپنی ذمہ داری کو ادا کرنا پڑتا ہے جو کہ سراسر قربانی کا معاملہ ہے۔ یہاں آدمی دیکھتا ہے کہ جھوٹ بولنے میں فائدہ ہے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سچ بولنے کے لئے تیار کرتا ہے، یہ بھی قربانی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہاں ملتے ہوئے فائدہ کو اس لئے چھوڑ دینا ہے کہ آدمی جائز طور پر اس کا حقدار نہیں۔ اس طرح کی مختلف قربانیاں دینے کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ آدمی اس دنیا میں ایک سچا انسان بن کر زندہ رہ سکے۔

جانور کا ذبیحہ انھیں قربانیوں کی تربیت ہے۔ جانور کے ذبیحہ کے ذریعہ آدمی کو یہ سبق دیا جاتا ہے کہ وہ ہر موڑ پر اپنی نفسیات کے ذبیحہ کے لئے آمادہ رہے۔ وہ اعلیٰ انسانیت کی خاطر ہر اس جذبہ کو قربان کر دے جو اس میں رکاوٹ بنتا ہوا دکھائی دے۔

جب بھی کسی فرد یا قوم میں گراوٹ آتی ہے تو وہ اسی وقت آتی ہے جب کہ افراد یا قوموں میں قربانی کی روح باقی نہ رہی۔ جب لوگ اپنی خواہشوں کے اوپر چلنے لگے۔ جب لوگ یہ بھول گئے کہ بڑے مقصد کو پانے کے لئے چھوٹے مفادات کو نظر انداز کرنا ضروری ہے۔

اس لئے قربانی کے طریقہ کو سالانہ طریقہ بنا دیا گیا ہے۔ تاکہ لوگ ہر سال کم از کم ایک بار اس ضروری قدر کو یاد کریں، تاکہ وہ بار بار اس کو اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہیں۔ وہ مسلسل تقویٰ کی خوراک حاصل کرتے رہیں۔

قربانی کے لئے آدمی جب جانور کو مال دے کر خرید تا ہے تو وہ اِس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے کہ یہ میرا مال نہیں ہے، وہ خدا کا ہے۔ جب وہ جانور کو ذبح کرتا ہے تو وہ خدا سے یہ عملی عہد کرتا ہے کہ اس طرح میں اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جب وہ قربانی کے گوشت کو تقسیم کرتا ہے تو وہ اپنے اندر اس احساس کو بٹھاتا ہے کہ میری کمائی میں دوسروں کا بھی حصہ ہے۔ جانور کا ذبیحہ اس واقعہ کی علامت ہے کہ آدمی قربانی کی حد کو جاکر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کے لئے تیار رہے۔

جانور کی قربانی آغاز ہے اور تقویٰ اس کا اختتام۔ جانور کا ذبیحہ اس کی علامت ہے اور خواہشات اور منفی جذبات کا ذبیحہ اس کی روح۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲ جون ۱۹۹۳ کو نشر کی گئی۔

حج میں کیا نہ کریں

حج کے دنوں میں جو کچھ کرنا منع ہے وہ وہی ہے جس کو بقیہ دنوں میں بھی کرنا منع ہے۔ حج کے دوران میں ان کی ممانعت بطور تربیت ہے۔ حج میں شریعت کی ان ممنوعات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرایا جاتا ہے تاکہ ان کے بارے میں آدمی کا احساس تیز ہو اور بقیہ دنوں میں ان سے بچنے کی خصوصی استعداد اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

انسان جب اپنے گھر اور کاروبار میں ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں الجھا رہتا ہے اور اس سے آگے کی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو روزانہ نماز کی ادائگی کے لئے مسجد میں لایا جاتا ہے تاکہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے ذاتی ماحول سے علیحدہ ہو اور اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے خالی کر کے یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ حج کے دنوں میں اسی مقصد کے لئے آدمی کو اس کے محدود ماحول سے نکال کر زیادہ لمبی مدت کے لئے حجاز (عرب) کے مختلف مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ حج کسی آدمی کے لئے اس کے دنیوی ماحول سے کامل علیحدگی کا نام ہے تاکہ وہ کامل یک سوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔

عرب کے ساتھ بہت سی عظیم دینی روایتیں وابستہ ہیں۔ اس بنا پر حج کے مراسم کی ادائگی کے لئے عرب کا جغرافیہ نہایت موزوں جغرافیہ ہے۔ یہاں کعبہ ہے جس کے بارے میں ہزاروں سال سے تقدس کی روایتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہاں پیغمبروں کی قربانی کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں خدا کے نیک بندوں پر خدا کے انعامات کی یادگاریں ہیں۔ یہ وہ زمین ہے جہاں خدا کے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اس قسم کی تاریخی نسبتوں نے حج کے مقامات کے ساتھ غیر معمولی تقدس اور احترام کی فضا وابستہ کر دی ہے۔ یہاں کے ماحول میں پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں ایک پوری دینی تاریخ جاگ اٹھتی ہے۔ یہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی دینی حس میں اضافہ ہو جائے۔ وہ زیادہ سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے فرائض کو ادا کرنے لگے۔ اسی مخصوص تاریخی اہمیت کی بنا پر اس علاقہ کو خدا نے اس کے لئے چنا کہ یہاں اسلامی زندگی کے بارے میں ایک علامتی مشق (ریہرسل) کرائی جائے اور پھر آدمی کو دوبارہ اس کے سابقہ ماحول میں واپس لایا جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

حج کے زمانہ میں مخصوص مراسم کی ادائگی کے دوران حاجی کے لئے جو چیزیں منع ہیں ان میں سے تین خاص چیزوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان سے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔

۲۔ کسی جانور کو نہ مارنا اور نہ اس کو زخمی کرنا۔

۳۔ لذت اور آرائش کی چیزوں سے پرہیز۔ مثلاً ناخن کاٹنا، بال سنوارنا، سلا ہوا کپڑا پہننا، خوشبو لگانا، ازدواجی تعلقات، وغیرہ

مل جل کر رہنے میں لوگوں کو ایک دوسرے کی جس چیز سے سب سے زیادہ سابقہ پیش آتا ہے وہ زبان ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے سب سے زیادہ تکلیف زبان ہی سے پہنچتی ہے۔ حج کے زمانہ میں بیک وقت بہت سے لوگوں کا ساتھ ہو جانے کی وجہ سے بار بار یہ موقع آتا ہے کہ آدمی کی زبان بے قابو ہو جائے اور ایک مسلمان سے دوسرے مسلمان کو ٹھیس پہنچے۔ چنانچہ حج کے موسم کو خصوصیت سے اس کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا عام دنوں میں اسلامی اخلاقیات کا ایک جزء ہے۔ مگر حج کے دنوں میں اس کو اسلامی عبادات کا لازمی جزء بنا دیا گیا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اہتمام کرکے اپنے کو اس سماجی برائی سے بچائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: حج کے چند معلوم مہینے (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) ہیں۔ جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہو اور نہ بد کلامی اور نہ جھگڑا اور نہ تکرار کیا جائے (بقرہ ۱۹۷) زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی یہی تین خاص صورتیں ہیں۔ آدمی فحش باتیں اپنی زبان سے نکالتا ہے جو دوسروں کے لئے دل خراشی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ دوسرے کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس کے بارے میں نازیبا کلمات بول کر اس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بات چیت کے دوران تکرار اور سخت کلامی پر اتر آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حج میں بالکل حرام کر دی گئیں۔ تاکہ ان کے بارے میں آدمی کی حساسیت بڑھ جائے اور جب وہ حج کے مقدس سفر سے لوٹے تو اس کے اثر سے اس کی زبان ہمیشہ کے لئے ان چیزوں سے محفوظ ہو چکی ہو۔

حج کے لئے احرام باندھنے کے بعد خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حاجی کے لئے حرام ہے۔ حتیٰ کہ شکار کئے ہوئے جانور کا گوشت بطور ہدیہ قبول کرنا، پرند کا پر اکھاڑنا، شکار میں مدد دینا، شکار کے جانور کو ذبح کرنے کے لئے چھری دینا، وغیرہ سب حاجی کے لئے حرام ہیں۔

حج کے دوران میں حاجی کسی موذی جانور مثلاً سانپ کو مار سکتا ہے۔ یا وہ قربانی کے جانور کو ذبح کرتا ہے جو حج کے مراسم کا ایک جزء ہے۔ اس کے علاوہ کسی جانور کو مارنا یا اسے تکلیف دینا حرام ہے۔ جانور کا شکار عام حالات میں بالکل جائز ہے مگر حج کے دوران شکار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ دراصل ایک شرعی حکم پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرانا ہے۔ آدمی پر یہ فرض ہے کہ وہ انسان کو نہ مارے، وہ کسی جان دار کو نہ ستائے۔ یہ شریعت کا ایک عام حکم ہے جو ہر آدمی سے ہر حال میں مطلوب ہے، مگر حج کے دوران اس کو شکار کے جانوروں تک وسیع کر کے اس حکم کے بارے میں آدمی کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ حج سے واپسی کے بعد وہ زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کی تعمیل کر سکے۔

اسلامی زندگی کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھ کر زندگی گزاری جائے۔ حج کے سفر کو اس قسم کی پابند زندگی کے لئے خصوصی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ حج کی یہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے: جس شخص نے حج کے مراسم اس طرح ادا کئے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے (مَن قضیٰ نسُکَہ وسَلِم المسلمون

من لسانه ويده كا غفر له ما تقدم من ذنبه، تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرہ) گویا حج کا فریضہ ادا کرتے ہوئے حاجی کو جس چیز سے خاص طور پر بچنا ہے وہ یہ کہ اس کی زبان سے کسی بندۂ خدا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کے ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو حج آدمی کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے وہ وہی حج ہے جس سے آدمی اس قسم کی زبان اور اس قسم کا ہاتھ لے کر واپس آیا ہو۔

حج کے دوران لذت اور آرائش کی چیزوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ حج کا عمل احرام سے شروع ہوتا ہے۔ احرام ایک سادہ لباس (ایک سفید تہمد اور ایک سفید چادر) ہے جو حرم کے حدود میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی اور زائر کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ احرام گویا ایک قسم کا فقیرانہ لباس ہے جو زیارت کعبہ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ یہ پہلی علامتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے خدا اپنے بندوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ سارے انسان برابر ہیں۔ جن ظاہری چیزوں کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں یا کسی کو اونچا یا کسی کو نیچا سمجھتے ہیں وہ سب خدا کی نظر میں سراسر باطل ہیں۔ خدا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے حج کے زمانہ میں لاکھوں حاجی ایک قسم کا لباس پہننے کی وجہ سے بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا حج کا احرام اسلام کے اس اصول کا ایک عملی مظاہرہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ جو لوگ خدا کے اچھے بندے بننا چاہتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے دوسرے "لباس" اپنے اوپر سے اتار دیں اور سب مل کر ایک ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حاجی کون ہے۔ آپ نے فرمایا "پراگندہ بال اور غبار آلود" ان الفاظ میں اصلی حاجی کی تعریف بتائی گئی ہے۔ الجھے ہوئے بال اور گرد سے اٹا ہوا جسم با مقصد آدمی کی پہچان ہے۔ جب کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو کسی خاص کام کے لئے وقف کر دے تو اس کو آرائش و زیبائش کی فرصت نہیں رہتی۔ حج میں بالقصد اس قسم کا حلیہ بنانے کا حکم گویا با مقصد زندگی گزارنے کا ایک تاکیدی سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدائی مقصد میں اپنے آپ کو اس حد تک مشغول کرے کہ اس کو اپنے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی سُدھ نہ رہے۔ وہ وقتی لذتوں کو بھول جائے۔ برتر مقصد کو پانے کی دھن میں اس کو اپنے ذاتی تقاضے یاد نہ رہیں۔

حج کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے: اور تم سفر حج میں تقویٰ کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقویٰ کا زاد راہ ہے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو (بقرہ ۱۹۷)

قدیم عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حج کے لئے زاد راہ لے کر نکلنا دنیا دارانہ فعل ہے، جو شخص حج کے لئے اس طرح نکلے کہ وہ دنیا کا سامان لئے بغیر حج کے سفر پر چل پڑا ہو وہ بڑا پارسا اور دین دار خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے بارے میں کہتے کہ ہم متوکل ہیں (نحن المتوکلون) ہم خدا کے سوا کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مگر قرآن میں یہ بتایا گیا کہ اس قسم کی ظاہری نمائش کا نام دین داری نہیں ہے۔ دین داری کا تعلق دل اور ذہن سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہرہ سے۔ آدمی کو جس چیز سے بچنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کا ذہن غیر اللہ کے ڈر سے خالی ہو، نہ یہ کہ اس کی جھولی میں کوئی کھانے پینے کا سامان نظر نہ آتا ہو۔ (نوٹ: یہ تقریر ۱۴ ستمبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی)

حج کا پیغام

۱۹۸۲ سے پہلے میں نے حج کے بارے میں صرف کتابوں میں پڑھا تھا۔ ۱۹۸۲ میں مجھے خود بھی حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس مطالعہ اور تجربہ کے بعد حج کا پیغام جو میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ ـــــــ انسان اپنے رب کی طرف دوڑے، انسان اپنے خالق کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنائے۔ حج کا عمل اگرچہ صرف چند دن کے لیے کیا جاتا ہے مگر وہ پوری زندگی کا ایک سبق ہے۔ وہ انسان کی پوری زندگی کے لیے ایک علامتی رہنما ہے۔

ایک آدمی جب اپنے وطن اور اپنے گھربار کو چھوڑ کر حج کے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ سفر کر کے اللہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی دنیا سے نکال کر خدا کی دنیا میں پہنچا رہا ہے۔ وہ وہاں جا رہا ہے جہاں اللہ کا گھر (بیت اللہ) ہے۔ جہاں اللہ کے رسول اور اس کے اصحاب کے کارنامے ثبت ہیں۔ جہاں ان لوگوں کی زندگیوں کے نشانات ہیں جو اللہ کے لیے جیے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان دیدی۔ اسی کے ساتھ حاجی کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس مقام کی زیارت کے لیے جا رہا ہے جس کو خدا نے اپنی آخری ہدایت کے اظہار کے لیے خصوصی طور پر چنا تھا۔

اس طرح حج کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے (یا یہ ہونا چاہیے) کہ حاجی کا ذہن خدارخی ذہن بن جاتا ہے۔ اس کو خدا کی یاد آنے لگتی ہے۔ اس کا دماغ خدا کی باتوں سے بھر جاتا ہے۔ اب تک اس کی سوچ اگر اپنی ذات کی طرف چل رہی تھی تو اب اس کی سوچ خدا کی طرف چل پڑتی ہے۔

آدمی جس چیز کے بارے سوچے اسی کے لحاظ سے اس کی نفسیات بنتی ہے۔ آپ اپنے ذاتی مقصد کے لیے اٹھیں تو آپ کا ذہن خود اپنی ذات کے گرد گھومے گا۔ مگر جب ایک شخص خدا کی طرف روانہ ہو رہا ہو تو اس کا ذہن خدا کی طرف لگ جاتا ہے۔ اس کو خدا والی باتیں یاد آنے لگتی ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ خدا نے مجھے پیدا کیا۔ اسی نے مجھے ہر قسم کے مواقع دیئے۔ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں دنیا میں کام کروں۔ اسی کی توفیق سے یہ ممکن ہوا کہ میں وہ وسائل جمع کروں جن کی مدد سے آج میں بیت اللہ کی طرف جا رہا ہوں۔ پھر آخر کار مجھ پر وہ دن آنے والا ہے جب کہ مجھ پر موت آئے۔

اور میں خدا کے دربار میں براہِ راست حاضر کر دیا جاؤں۔

یہ چیزیں حاجی کے سفر کو مکمل معنوں میں ایک روحانی سفر بنا دیتی ہیں۔ بظاہر وہ ایک مادی سفر میں ہوتا ہے مگر اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وہ ایک معنوی سفر کے اعلیٰ منازل طے کر رہا ہوتا ہے۔

جب حرم میں داخل ہونے کا وقت قریب آتا ہے تو تمام حاجی اپنے اپنے کپڑے اتار کر ایک نئے قسم کا "یونیفارم" پہن لیتے ہیں۔ ہر شخص ایک ہی قسم کا بغیر سِلا ہوا لباس اپنے جسم کے اوپر ڈال لیتا ہے۔ یہ اس بات کی ایک عملی یاد دہانی ہے کہ حاجی اب نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔ اپنے قومی لباس کو اتار کر وہ اپنے آپ کو گویا اس طرزِ زندگی سے الگ کر لیتا ہے جو اس کے ماحول نے اسے سکھایا تھا۔ وہ اس احساس کو اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے کہ آدمی اپنے اوپر طاری کرے۔ لاکھوں انسان اپنے اپنے رنگ کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگ لیتے ہیں۔

جسم پر احرام کا ربّانی لباس ڈالنے کے بعد حاجی کی زبان بھی ربانی کلام بولنا شروع کر دیتی ہے۔ اب حاجی لبیک لبیک کی صدا بلند کرنے لگتا ہے۔ گویا کہ خدا اس کو پکار رہا تھا اور وہ اس کی پکار پر دوڑ کر آگیا اور کہنے لگا کہ خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں۔ لبیک لبیک کہنے کا یہ عمل حاجی کی طرف سے برابر جاری رہتا ہے۔

"حاضر ہوں" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکّہ میں رہنے کے لیے حاضر ہوں۔ یہ وطن کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ نہیں بلکہ روش کو چھوڑ کر آنے کا کلمہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیری فرمانبرداری کے لیے حاضر ہوں۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ تو جو حکم دے اس پر میں دل و جان سے قائم ہو جاؤں۔ "لبیک" کا اقرار آدمی حج کے مقام پر کرتا ہے مگر اس کی عملی تصدیق وہاں سے لوٹ کر اس کو اپنے وطن میں کرنی پڑتی ہے جہاں کے روز و شب میں وہ اپنی زندگی گزار رہا ہے۔

مکّہ پہنچ کر آدمی پہلا کام یہ کرتا ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ بیت اللہ ایک وسیع مسجد ہے۔ اس کے کشادہ صحن کے بیچ میں کعبہ کی وہ تاریخی عمارت کھڑی ہوئی ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ حاجی بیت اللہ کے صحن میں اس کعبہ کے چاروں طرف گھومتا ہے۔ وہ سات

باراس کا چکر لگاتا ہے۔ اس طرح گویا وہ تمثیلی طور پر اس بات کا عملی مظاہرہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کے گرد گھومے گا۔ وہ خدا کو اپنی زندگی میں مرکزی مقام دے کر اس کے گرد اپنی پوری زندگی گزارے گا۔

طواف کے بعد حاجی صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ وہ صفا سے مروہ کی طرف جاتا ہے اور پھر مروہ سے صفا کی طرف جاتا ہے۔ اس طرح وہ تیز قدمی کے ساتھ سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ بھی گویا تمثیل کے روپ میں ایک عہد ہے۔ یہ اپنی سرگرمیوں کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے عزم کا اظہار ہے۔ اس عمل کے دوران بظاہر حاجی دو پہاڑیوں (صفا اور مروہ) کے درمیان سعی کرتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ سعی خدا کی راہ میں دوڑ دھوپ کا اظہار ہے، جو ایک تاریخی واقعہ کے اعادہ کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔

حج کے دوران کی سب سے اہم عبادت وہ ہے جس کو وقوف عرفہ کہا جاتا ہے۔ یعنی عرفات کے میدان میں پہنچ کر وہاں قیام کرنا۔ یہ ایک بڑا عجیب منظر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ "خدایا میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں" کہتے ہوئے اور ایک ہی سادہ لباس پہنے ہوئے عرفات کے وسیع اور کھلے ہوئے میدان میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ گویا حشر کے میدان میں خدا کے سامنے حاضری کا ایک دنیوی نقشہ ہوتا ہے۔ عرفات میں اس طرح جمع ہونا حاجی کو میدان حشر میں جمع ہونے کا منظر یاد دلاتا ہے وہ اس کو اس سب سے بڑی حقیقت کا احساس دلاتا ہے جس کا احساس اگر واقعی معنوں میں انسان کو ہو جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔ اس کے تمام معاملات اپنے آپ سنورتے چلے جائیں۔

حج کے دوران کا ایک عمل یہ ہے کہ جمرۂ عقبہ پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ یہ ایک علامتی عمل ہے۔ جمرہ پر کنکری مار کر حاجی اپنے اس عزم کو تازہ کرتا ہے کہ اسی طرح وہ شیطان کو مارے گا اور اس کو اپنے سے دور بھگائے گا۔ شیطان سے اس کا رشتہ دوستی کا رشتہ نہیں بلکہ دشمنی اور مقابلہ کا رشتہ ہے۔ اس علامتی عمل کو آدمی اگر حقیقی عمل بنا لے، وہ واقعۃً شیطان کو اپنے سے دور بھگائے تو اس کے اندر سے تمام خرابیاں نکل جائیں۔ کیوں کہ ہر قسم کی خرابیاں شیطان ہی کے سکھانے سے آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حاجی اللہ کی راہ میں جانور قربان کرتا ہے۔ یہ قربانی بھی ایک تمثیلی عمل ہے۔ چنانچہ اس کو قرآن میں شعائر اللہ (علاماتِ خداوندی) میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جانور کی قربانی خود اپنی قربانی

کی تمثیل ہے۔ جانور کو قربان کرکے حاجی عمل کی زبان میں اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں سب کچھ دینے کے لیے تیار رہے۔ حتی کہ اگر وہ وقت آجائے کہ اس کو اپنی جان خدا کی راہ میں دے دینا ہو تو وہ اپنی جان بھی خدا کی راہ میں دیدے گا۔ وہ اپنی آخری قیمتی پونجی بھی اللہ کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔

یہ تقریر ۱۸ جولائی ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

حج کی اجتماعی اہمیت

حج اسلام کی ایک نہایت اہم سالانہ عبادت ہے۔ وہ قمری کلنڈر کے آخری ماہ ذوالحجہ میں ادا کیا جاتا ہے۔ حج کی عبادت کے مراسم بیت اللہ (مکہ) میں یا اس کے آس پاس کے مقامات پر ادا کیے جاتے ہیں جو عرب میں واقع ہے۔ اس عبادت کو تمام عبادتوں کا جامع کہا جاتا ہے چنانچہ اس میں ہر قسم کے عبادتی پہلو پائے جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک اجتماعی پہلو بھی ہے حج کی عبادت میں اجتماعیت کا پہلو بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (۱۹۸۴) میں حج کی تفصیل دیتے ہوئے یہ جملہ لکھا گیا ہے:

> About 2,000,000 persons perform the Hajj each year, and the rite serves as a unifying force in Islam by bringing followers of diverse background together in religious celebration. (V.IV, p. 844)

تقریباً دو ملین آدمی ہر سال حج کرتے ہیں اور یہ عبادت مختلف ملکوں کے مسلمانوں کو ایک مذہبی تقریب میں یکجا کرکے اسلام میں اتحادی طاقت کا کام کرتی ہے۔

قرآن میں حج کا حکم دیتے ہوئے یہ الفاظ آئے ہیں: واذ جعلنا البیت مثابة للناس وامنا (البقرہ ۱۲۵) یعنی خدا نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مثابہ بنایا اور اس کو امن کی جگہ بنا دیا۔ مثابہ کے معنی عربی زبان میں تقریباً وہی ہیں جس کو آج کل کی زبان میں مرکز کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں لوگ جمع ہوں۔ جس کی طرف سب لوگ رجوع کریں جو سب کا مشترک مرجع اور شیرازہ ہو۔

حج کی عبادت کے لیے ساری دنیا سے ہر ہر ملک کے لوگ آتے ہیں، ہر ہر قوم کے لوگ آتے ہیں۔ ان کی تعداد سالانہ تقریباً ۲۰ لاکھ ہو جاتی ہے۔ حج کے موسم میں مکہ اور اس کے آس پاس ہر طرف آدمی ہی آدمی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ ان کے حلیے الگ الگ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں آنے کے بعد سب کی سوچ ایک ہو جاتی ہے۔ سب

عبادت کرتے ہیں۔ حج کے دوران وہ ان کی تمام توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ اس طرح حج ایک ایسی عبادت بن جاتا ہے جو اپنے تمام اعمال اور تقریبات کے ساتھ انسان کو اجتماعیت اور مرکزیت کا سبق دے رہا ہو۔

حج کی تاریخ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی زندگی سے وابستہ ہے۔ یہ دونوں ہستیاں وہ ہیں جن کو نہ صرف مسلمان خدا کا پیغمبر مانتے ہیں بلکہ دوسرے بڑے مذاہب کے لوگ بھی ان کو عظیم پیغمبر تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح حج کے عمل کو تاریخی طور پر تقدس اور عظمت کا وہ درجہ مل گیا ہے جو دنیا میں کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں۔

حضرت ابراہیم قدیم عراق میں پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل ان کے صاحبزادے تھے۔ اس وقت عراق ایک شاندار تمدن کا ملک تھا۔ آزر حضرت ابراہیم کے والد اور حضرت اسماعیل کے دادا تھے۔ ان کو عراق کے سرکاری نظام میں اعلیٰ عہدہ دار کی حیثیت حاصل تھی۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے لیے عراق میں شاندار ترقی کے اعلیٰ مواقع کھلے ہوئے تھے۔ مگر عراق کے مشرکانہ نظام سے وہ موافقت نہ کر سکے۔ ایک خدا کی پرستش کی خاطر انھوں نے اس علاقہ کو چھوڑ دیا جو کئی خداؤں کی پرستش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ عراق کے سرسبز ملک کو چھوڑ کر عرب کے خشک صحرا میں چلے گئے جہاں کی سنسان دنیا میں خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی اور چیز حائل نہ تھی۔ یہاں انھوں نے ایک خدا کے گھر کی تعمیر کی۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے اس عمل کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کئی خداؤں کو اپنا مرجع بنانے کے بجائے ایک خدا کو اپنا مرجع بنایا۔ اور اس مقصد کے لیے بیت اللہ (کعبہ) کی تعمیر کی جو خدائے واحد کی عبادت کا عالمی مرکز ہے۔ یہی مرکز توحید حج کے مراسم کی ادائیگی کا مرکز بھی ہے۔

حج کی عبادت میں جو مراسم ادا کیے جاتے ہیں ان کے بعض پہلوؤں کو دیکھیے۔ حج کے دوران حاجی سب سے زیادہ جو کلمہ بولتا ہے وہ یہ ہے:

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر
اللہ اکبر وللہ الحمد

اللہ سب سے بڑا ہے ، اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ اور اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اللہ سب سے بڑا ہے ۔ اور اسی کے لیے ہے ساری تعریف ۔

حاجی کی زبان سے بار بار یہ الفاظ کہلوا کر تمام لوگوں کے اندر یہ نفسیات پیدا کی جاتی ہے کہ بڑائی صرف ایک اللہ کی ہے ۔ اس کے سوا جتنی بڑائیاں ہیں سب اس لیے ہیں کہ اسی ایک عظیم تر بڑائی میں گم ہو جائیں ۔ یہ احساس اجتماعیت کا سب سے بڑا راز ہے ۔ اجتماعیت اور اتحاد ہمیشہ وہاں نہیں ہوتا جہاں ہر آدمی اپنے کو بڑا سمجھ لے ۔ اس کے برعکس جہاں تمام لوگ کسی ایک کے حق میں اپنی انفرادی بڑائی سے دست بردار ہو جائیں وہاں اتحاد اور اجتماعیت کے سوا کوئی اور چیز پائی نہیں جاتی ۔ بے اتحادی بڑائیوں کی تقسیم کا نام ہے اور اتحاد بڑائیوں کی وحدت کا ۔

اسی طرح حج کا ایک اہم رکن طواف ہے ۔ دنیا بھر کے لوگ جو حج کے موسم میں مکہ میں جمع ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے کعبہ کا طواف کرتے ہیں ۔ یہ اس بات کا عملی اقرار ہے کہ آدمی اپنی کوششوں کا مرکز و محور صرف ایک نقطہ کو بنائے گا ۔ وہ ایک ہی دائرہ میں حرکت کرے گا ۔ یہ عین وہی مرکزیت ہے جو مادی سطح پر نظامِ شمسی میں نظر آتی ہے ۔ نظامِ شمسی کے تمام سیارے ایک ہی سورج کو مرکزی نقطہ بنا کر اس کے گرد گھومتے ہیں ۔ اسی طرح حج یہ سبق دیتا ہے کہ انسان ایک خدا کو اپنا مرجع بنا کر اس کے دائرے میں گھومے ۔

اس کے بعد حاجی صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتا ہے ۔ وہ صفا سے مروہ کی طرف جاتا ہے اور پھر مروہ سے صفا کی طرف لوٹتا ہے ۔ اس طرح وہ سات چکر لگاتا ہے ۔ یہ عمل کی زبان میں اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کی دوڑ دھوپ ایک حد کے اندر بندھی ہوئی ہونی چاہیے ۔ اگر آدمی کی دوڑ دھوپ کی کوئی حد نہ ہو تو کوئی ایک طرف بھاگ کر نکل جائے گا اور کوئی دوسری طرف ۔ مگر جہاں دوڑ دھوپ کی حد بندی کر دی گئی ہو وہاں ہر آدمی بندھا رہتا ہے ۔ وہ بار بار وہیں لوٹ کر آتا ہے جہاں اس کے دوسرے بھائی اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوں ۔

یہی حج کے دوسرے تمام مراسم کا حال ہے ۔ حج کے تمام مراسم مختلف پہلوؤں سے

ایک ہی مشترک نشانہ پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ربانی مقناطیس ہے جو "لوہے" کے تمام ٹکڑوں کو ایک نقطہ پر کھینچے چلا جا رہا ہے۔

مختلف ملکوں کے یہ لوگ جب مقام حج کے قریب پہونچتے ہیں تو سب کے سب اپنا قومی لباس اتار دیتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی مشترک لباس پہن لیتے ہیں جس کو احرام کہا جاتا ہے۔ احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ بغیر سلی ہوئی ایک سفید چادر نیچے تہمد کی طرح پہن لی جائے اور اسی طرح ایک سفید چادر اوپر سے جسم پر ڈال لی جائے۔ اس طرح لاکھوں انسان ایک ہی وضع اور ایک ہی رنگ کے لباس میں ملبوس ہو جاتے ہیں۔

یہ سارے لوگ مختلف مراسم ادا کرتے ہوئے بالآخر عرفات کے وسیع میدان میں اکھٹا ہوتے ہیں۔ اس وقت ایک عجیب منظر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانوں کے تمام فرق اچانک مٹ گیے ہیں۔ انسان اپنے تمام اختلافات کو کھو کر خدائی وحدت میں گم ہو گیے ہیں۔ تمام انسان ایک ہو گیے ہیں جیسے ان کا خدا ایک ہے۔

عرفات کے وسیع میدان میں جب احرام باندھے ہوئے تمام حاجی جمع ہوتے ہیں اس وقت کسی بلندی سے دیکھا جائے تو ایسا نظر آئے گا کہ زبان، رنگ، حیثیت، جنسیت کے فرق کے باوجود سب کے سب انسان بالکل ایک ہو گیے ہیں۔ اس وقت مختلف قومیتیں ایک ہی بڑی قومیت میں ضم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حج اجتماعیت کا اتنا بڑا مظاہرہ ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال غالباً دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔

کعبہ مسلمانوں کا قبلۂ عبادت ہے۔ مسلمان ہر روز پانچ وقت اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ گویا ساری دنیا کے مسلمانوں کا عبادتی قبلہ ایک ہی ہے۔ عام حالت میں وہ ایک تصوراتی حقیقت ہوتا ہے۔ مگر حج کے دنوں میں مکہ پہونچ کر وہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت بن جاتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان یہاں پہونچ کر جب اس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں تو محسوس طور پر دکھائی دینے لگتا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا مشترک قبلہ ایک ہی ہے۔

کعبہ ایک چوکور قسم کی اونچی عمارت ہے۔ اس عمارت کے چاروں طرف گول دائرہ میں سارے لوگ گھومتے ہیں جس کو طواف کہا جاتا ہے۔ وہ صف بہ صف ہو کر اس کے گرد گول دائرہ میں

لوگوں کو ایک ہونے اور مل کر کام کرنے کا سبق دیتے ہیں۔ وہ ایک آواز پر حرکت کرنے کا عملی مظاہرہ ہیں۔

ایکتا کے اس عظیم تربیتی نظام ہی کا یہ بھی ایک ظاہری پہلو ہے کہ تمام لوگوں سے ان کے انفرادی لباس اُتروا کر سب کو ایک ہی سادہ لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ یہاں بادشاہ اور رعایا کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہاں مشرقی لباس اور مغربی لباس کے امتیازات فضا میں گم ہو جاتے ہیں۔ احرام کے مشترک لباس میں تمام لوگ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے کہ تمام لوگوں کی صرف ایک حیثیت ہے۔ تمام لوگ صرف ایک خدا کے بندے ہیں۔ اس کے سوا کسی کو کوئی اور حیثیت حاصل نہیں۔

حج کے مقررہ مراسم اگرچہ مکہ میں ختم ہو جاتے ہیں مگر بیشتر حاجی حج سے فارغ ہو کر مدینہ بھی جاتے ہیں۔ مدینہ کا قدیم نام یثرب تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس کو اپنا مرکز بنایا۔ اس وقت سے اس کا نام مدینۃ النبی (نبی کا شہر) پڑ گیا۔ مدینہ اسی کا اختصار ہے۔ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنائی ہوئی مسجد ہے۔ یہاں آپ کی قبر ہے۔ یہاں آپ کی پیغمبرانہ زندگی کے نشانات بکھرے ہوئے ہیں۔

ان حالات میں حاجی جب مدینہ پہونچتے ہیں تو یہ ان کے لیے مزید اتحاد اور اجتماعیت کا عظیم سبق بن جاتا ہے۔ یہاں کی مسجد نبوی میں وہ اس یاد کو تازہ کرتے ہیں کہ ان کا رہنما صرف ایک ہے۔ وہ یہاں سے یہ احساس لے کر لوٹتے ہیں کہ ان کے اندر خواہ کتنے ہی جغرافی اور قومی فرق پائے جاتے ہوں، انھیں ایک ہی پیغمبر کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے۔ انھیں ایک ہی مقدس ہستی کو اپنی زندگی کا رہنما بنانا ہے۔ وہ خواہ کتنے ہی زیادہ اور کتنے ہی مختلف ہوں مگر ان کا خدا بھی ایک ہے اور ان کا پیغمبر بھی ایک۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۷ اگست ۱۹۸۵ کو نشر کی گئی۔

میدان عرفات

عرفات، عرب کے ایک خشک پہاڑ کا نام ہے۔ اس پہاڑ سے ملی ہوئی وسیع وادی کو اسی نام پر عرفہ یا عرفات کہا جاتا ہے۔ یہ میدانِ عرفات حج کے مقامات میں سے ایک اہم مقام ہے۔ حج کی عبادت جو تقریباً ایک ہفتہ کے اندر ادا کی جاتی ہے، اس میں تمام حاجی حرم کے آس پاس کے مختلف مقامات سے گزرتے ہیں ——— مکہ، عرفات، مزدلفہ، منیٰ، وغیرہ۔ عرفات کے میدان میں تمام حاجی ۹ ذی الحجہ کو زوال آفتاب کے بعد داخل ہو جاتے ہیں اور غروب آفتاب تک یہاں عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے ہیں۔ امام کا خطبہ سنتے ہیں جو گویا پیغمبر اسلام کے مشہور خطبہ حجۃ الوداع کا قائم مقام ہوتا ہے جو آپ نے ۱۰ھ میں اسی مقام پر دیا تھا۔

عرفات میں قیام کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الحجُّ عرفة، فمن وقف ساعة من ليل او نهار تمّ حجُّه (عرفہ کا قیام حج ہے۔ جو شخص رات یا دن میں ایک گھڑی بھی یہاں ٹھہرا اس کا حج پورا ہو گیا) حج کے اعمال (واجبات و سنن) تقریباً ایک درجن ہیں جن میں احرام باندھنے سے لے کر سعی اور طواف اور قربانی اور رمی جمرات وغیرہ شامل ہیں۔ تاہم ان سب ارکان میں سب سے زیادہ اہم رکن وہی ہے جس کا تعلق میدان عرفات میں قیام سے ہے۔

مکہ سے جو راستہ پچھم کی طرف طائف کے لئے جاتا ہے، اس پر تقریباً پندرہ کیلومیٹر (۱۲ میل) کے فاصلہ پر ایک وسیع پتھریلا میدان ہے جو کئی میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی کا نام میدانِ عرفات ہے۔ یہ سطح زمین سے تقریباً ۲۰۰ گز بلند ہے۔ پورے سال یہ میدان بالکل سونا پڑا رہتا ہے۔ حتی کہ اگر کوئی شخص تنہا وہاں جائے تو اس وسیع ویرانہ میں اس کو عجیب دہشت معلوم ہوگی۔ سال میں ایک دن ۹ ذی الحجہ کو یہاں بیک وقت لاکھوں آدمی جمع ہو جاتے ہیں۔ پورا میدان انسانوں سے اور ان کی سواریوں سے بھر جاتا ہے۔ یہ گویا میدان حشر کی ایک تمثیل ہے۔ حشر کا میدان آج بظاہر خالی پڑا ہوا ہے۔ جب قیامت آئے گی تو اچانک تمام انسان وہاں جمع کر دئے جائیں گے اور تمام انسانی نسل ایک بڑے میدان میں اپنے رب کے سامنے کھڑی ہوئی اس کے فیصلہ کی منتظر دکھائی دے گی۔

مقررہ طریقہ کے مطابق، حاجی ۸ ذی الحجہ کی صبح کو مسجد حرام میں داخل ہوتا ہے۔ طوافِ قدوم کرکے وہ صبح ہی صبح منیٰ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس دن اور رات کو وہ وہیں قیام کرتا ہے۔ ۹ ذی الحجہ کی صبح کو حاجی مزدلفہ کی راہ سے عرفات کے لئے روانہ ہوتا ہے اور تقریباً ۱۴ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اسی دن دوپہر تک عرفات کے علاقہ میں پہنچ جاتا ہے۔ دوپہر بعد سے لے کر غروب آفتاب تک وہ اس میدان میں قیام کرتا ہے۔ اس کو شریعت کی زبان میں وقوفِ عرفہ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے قیام کے دوران حاجی اپنا تمام وقت دعا و عبادت اور توبہ و استغفار میں گزارتا ہے۔ شام کو یہاں سے مشعر الحرام (مزدلفہ) کے لئے کوچ کرتا ہے۔ عرفات میں ظہر اور عصر کی نماز تقدیم کے ساتھ ملاکر پڑھی گئی تھی، اسی طرح مزدلفہ میں مغرب اور عشا کی نماز تاخیر کے ساتھ ملاکر پڑھی جائے گی۔

"عرفات کی یہ خصوصیت ہے کہ خود قرآن میں صراحتاً یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ حج کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ جب تم عرفات سے چلو تو مشعر حرام (مزدلفہ) میں ٹھہر کر خدا کو یاد کرو (البقرہ ۱۹۸)

عرفات کے میدان سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں وہ عبادتی عمل کیا جس کو حاجی ہر سال اس مقام پر پہنچ کر دہراتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے بعد زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے حج کے طریقہ کو بدل دیا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اس کو ابراہیمی طریقہ پر قائم فرمایا۔

عرفات کے میدان میں پہنچ کر آدمی کو جو باتیں یاد آتی ہیں، ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ وہ تاریخی مقام ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اسلام کا سفر کس طرح نقطۂ آغاز سے چل کر نقطۂ تکمیل تک پہنچا۔ میدان عرفات وہ تاریخی مقام ہے جہاں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا آخری خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

اللہ کا پیغمبرؐ ۱ھ میں مکہ سے رخصت ہو کر مہاجر کے طور پر مدینہ پہنچا تھا۔ بظاہر یہ اسلام کی تاریخ کے ختم ہونے کا واقعہ تھا۔ مگر اللہ کی مدد سے وہ اسلام کی تاریخ کا نیا آغاز بن گیا۔ صرف دس سال بعد خدا کا پیغمبرؐ اس قابل ہو گیا کہ وہ عرفات کے میدان میں ملک کے حاکم کی حیثیت سے کھڑا ہو اور اپنے تقریباً ڈیڑھ لاکھ جاں نثار ساتھیوں کی موجودگی میں وہ خطبہ دے جو نہ

صرف عرب کے لئے بلکہ سارے عالم انسانی کے لئے انقلاب کا نقطۂ آغاز بن جائے۔

ایک مغربی سیرت نگار نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یاد رکھنا چاہئے کہ ایک مذہب کے بانی ہونے کی حیثیت سے بھی، پیغمبر اسلام نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ درحقیقت ۱۰ھ میں وہ اس قابل تھے کہ عرفات میں ۱۴۰،۰۰۰ مسلمانوں کے مجمع کو خطاب کر سکیں جو کہ فریضہ حج ادا کرنے کے لئے آئے تھے:

> In fact in the year 10 H., he was able to address at Arafat, a gathering of Muslims numbering about 140,000 Muslims who had come for pilgrimage. (p. 64)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری زمانہ میں حج ادا فرمایا جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس حج میں اصحاب رسول کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ تعداد جمع تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ ۹ ذی الحجہ کی صبح کو سورج نکلنے سے پہلے عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں آپ نے اونٹ پر بیٹھے بیٹھے دعا کی اور سورج ڈوبنے تک دعا کرتے رہے۔ آپ اونٹ پر اس لئے سوار تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کو دیکھیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کو سن سکیں۔

اس موقع پر آپ نے جو دعا کی وہ حدیث کی کتابوں میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ تاہم اس دعا کا مطلب یہ نہیں کہ ہر حاجی اس کو یاد کرلے اور اس کو لفظ بلفظ دہراتا رہے۔ یہ دعا دراصل احساسات کو بتاتی ہے نہ کہ محض الفاظ کو۔ اس معاملہ میں سنت کی پیروی یہ ہے کہ ہر حاجی اپنے سینہ میں وہی دینی جذبات اور وہی ربانی احساسات پیدا کرے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ میں موجزن تھے اور جو ان الفاظ کی صورت میں آپ کی زبان سے ظاہر ہوئے۔ اس دعا کا ترجمہ یہ ہے:

اے اللہ، تو میری بات سن رہا ہے اور تو میری جگہ کو دیکھ رہا ہے۔ تو میرے چھپے اور کھلے کو جانتا ہے۔ میری کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی نہیں۔ میں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں۔ تجھ سے فریادی ہوں۔ تیری پناہ چاہتا ہوں۔ پریشان ہوں۔ خوف زدہ ہوں۔ اپنے گناہوں کا اقرار کر رہا ہوں۔ تجھ سے بے کس آدمی کی طرح سوال کر رہا ہوں۔ اور گنہ گار اور حقیر انسان کی طرح تیرے سامنے گڑگڑا رہا ہوں۔ میں تجھ سے ڈرتا ہوں اور آفت رسیدہ کی مانند تجھ سے سوال

کرتا ہوں۔ جیسے وہ شخص جس کی گردن تیرے آگے جھکی ہوئی ہو اور اس کی آنکھیں تیرے لئے بہہ پڑی ہوں۔ اور اس کا جسم تیرے آگے عاجزی کئے ہوئے ہو۔ اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ، تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور تو میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا بن جا۔ اے تمام مانگے جانے والوں سے بہتر اور اے سب دینے والوں سے اچھا (حقیقت حج ۲۴-۲۵)

عرفات کے میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا ایک رہنما دعا اور نمونہ کی دعا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی مقام پر پہنچ کر حاجی کے دل میں اپنے رب کے لئے کس قسم کے جذبات امڈنے چاہئیں۔ اور اس کے اندرونی وجود کو کس قسم کی کیفیات سے بھرا ہوا ہونا چاہئے۔ یہ اس کی روحانی بیقراری کو بتاتی ہے نہ کہ محض لسانی حرکت کو۔

عرفات کا قیام گویا آدمی کے سفر ایمان کی تکمیل ہے۔ ایک شخص کو اللہ اور رسول کی معرفت نصیب ہوئی۔ اس نے اپنی زندگی کو خدا اور رسول کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق ڈھال لیا۔ پھر اس کے دل میں یہ تمنا جاگی کہ وہ بیت اللہ کا حج کرے اور اپنے جذباتِ عبودیت کو اپنے رب کے سامنے پیش کر دے۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر روانہ ہوا۔ سفر کے دوران اس کو خدا کی یاد آتی رہی۔ پھر مقاماتِ حج کو دیکھ کر اس کے دینی جذبات جاگتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ عرفات کے میدان میں گویا اپنے رب کے سامنے پہنچ گیا۔

حاجی کی ان ربانی کیفیات کو خدا نے دیکھا۔ اس کی رحمتیں حاجی کے بالکل قریب آ گئیں۔ اس نے اپنے بندہ کے لئے بخشش اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب عرفہ کا دن ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سب سے نیچے آسمان پر اتر کر فرشتوں سے فخر کے طور پر فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو دیکھو۔ وہ میرے پاس ایسی حالت میں آئے ہیں کہ سر کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ بدن پر اور کپڑوں پر سفر کی وجہ سے غبار پڑا ہوا ہے۔ لبیک لبیک کہہ رہے ہیں۔ دور دور سے چل کر آئے ہیں۔ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کے گناہ معاف کر دئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فخر کے طور پر فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو، میں نے ان بندوں کی طرف اپنا رسول بھیجا۔ وہ اس پر ایمان لائے۔ میں نے ان پر کتاب نازل کی تو انھوں نے اس کو مانا۔ تم گواہ رہو کہ میں نے ان کے سارے گناہ معاف کر دئے۔ (الکنز العمال)

میدانِ عرفات ایک اعتبار سے میدانِ اتحاد ہے۔ یہ حج کی عبادت کا ایک مزید پہلو ہے۔ مختلف ملکوں کے لوگ جب مقامِ حج کے قریب پہنچتے ہیں تو سب کے سب اپنا قومی لباس اتار دیتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی مشترک لباس پہن لیتے ہیں جس کو احرام کہا جاتا ہے۔ احرام باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ بغیر سلی ہوئی ایک سفید چادر نیچے تہمد کی طرح پہن لی جائے اور اسی طرح ایک سفید چادر اوپر سے جسم پر ڈال لی جائے۔ اس طرح لاکھوں انسان ایک ہی وضع اور ایک ہی رنگ کے لباس میں ملبوس ہو جاتے ہیں۔

یہ سارے لوگ مختلف مراسم ادا کرتے ہوئے بالآخر عرفات کے وسیع میدان میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس وقت ایک عجیب منظر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسانوں کے تمام فرق اچانک مٹ گئے ہیں۔ انسان اپنے تمام اختلافات کو کھو کر خدائی وحدت میں گم ہو گئے ہیں۔ تمام انسان ایک ہو گئے ہیں جیسے ان کا خدا ایک ہے۔

عرفات کے وسیع میدان میں جب احرام باندھے ہوئے تمام حاجی جمع ہوتے ہیں اس وقت کسی بلندی سے دیکھا جائے تو ایسا نظر آئے گا کہ زبان، رنگ، حیثیت، جنسیت کے فرق کے باوجود سب کے سب انسان بالکل ایک ہو گئے ہیں۔ اس وقت مختلف قومیتیں ایک ہی بڑی قومیت میں ضم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ حج کا اجتماعی پہلو ہے۔ حج اجتماعیت کا اتنا بڑا مظاہرہ ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال غالباً دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔

یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ جولائی ۱۹۸۸ کو نشر کی گئی۔

آداب مدینہ

قدیم عرب میں تین بڑے شہر تھے۔ مکہ، طائف اور یثرب۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے ہجرت کی اور مدینہ کو اپنی قیام گاہ بنایا، اس وقت سے یثرب شہر کا نام مدینت النبی (پیغمبر کا شہر) پڑگیا۔ بعد کو وہ مختصر ہوکر مدینہ کہا جانے لگا۔

مدینہ جانا حج کا ضروری رکن نہیں ہے۔ مدینہ جائے بغیر حاجی کا حج مکمل ہو جاتا ہے۔ لیکن جو لوگ حج کرنے کے لئے مکہ جاتے ہیں وہ عام طور پر مدینہ بھی ضرور جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام سے اور اسلامی تاریخ سے مدینہ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ مدینہ جانا شرعی طور پر ضروری نہ ہوتے ہوئے بھی عملاً ایک حاجی کے لئے ضروری ہوگیا ہے۔

مکہ سے مدینہ جانا، مسجد نبوی میں نماز پڑھنا اور روضۂ رسول پر درود پڑھنا، اگرچہ حج کے ارکان وفرائض میں داخل نہیں، تاہم اس کا بہت ثواب ہے۔ اور حاجی کو ضرور وہاں بھی حاضری دینا چاہئے۔ حاجی کو چاہئے کہ طوافِ وداع کے بعد مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہو۔

مدینہ کے سفر میں زبان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیادہ سے زیادہ درود وسلام جاری رہنا چاہئے۔ حاجی کو چاہئے کہ مدینہ پہنچ کر غسل کرے اور مسجد نبوی میں داخل ہوکر دو رکعت نماز پڑھے اور اس کے بعد دعا کرے۔ نماز کے بعد ادب کے ساتھ مواجہہ شریف کی جالیوں کے پاس آئے اور درود وسلام پڑھے۔ مدینہ کے قیام کے زمانہ میں نمازیں زیادہ سے زیادہ مسجد نبوی میں ادا کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔

مسجد نبوی میں نماز اور درود سے فارغ ہوکر مدینہ کے اندر اور اطراف کے ان مقامات کی زیارت کرنا چاہئے جن سے اسلام کی تاریخ وابستہ ہے۔ جن کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ مثلاً جنت البقیع، جہاں بہت سے صحابہ کرام دفن ہیں۔ مسجد قبا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر پہلی نماز ادا کی۔ جبل احد جہاں اسلام اور غیر اسلام کی دوسری بڑی جنگ پیش آئی۔ مسجد قبلتین جہاں عین حالت نماز میں تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ وغیرہ۔

مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے مغرب کی جانب تقریباً ۹ میل کے فاصلہ پر وہ مقام آتا ہے جس کو

بدر کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ رمضان ۲ھ میں اسی مقام پر اسلام اور غیر اسلام کا پہلا مقابلہ ہوا۔ اسلام کے مخالفین مدینہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے بڑھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکل کر مقابلہ کیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی تعداد اور قوت آپ کے دشمنوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مگر آپ کو اپنے دشمنوں پر غیر معمولی فتح حاصل ہوئی۔ بدر کا مقام حاجی کو یہ یاد دلاتا ہے کہ اس کو سب سے زیادہ فکر اس کی کرنی چاہئے کہ وہ حق پر قائم رہے۔ کیوں کہ اگر وہ حق پر قائم رہا تو ضرور اس کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ اور وہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح یاب ہوگا۔

جب مدینہ شہر کے چاروں طرف فصیل تھی، تو اس کے ایک دروازہ کا نام باب عنبریہ تھا۔ ترکی دور میں یہاں ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس کے کچھ باقیات اب بھی موجود ہیں۔ مکہ سے آنے والی سڑک اسی باب عنبریہ سے مدینہ میں داخل ہوتی ہے۔ جب یہ علاقہ شروع ہو تو دعاؤں کی کثرت کر دینا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے احترام کی تاکید ان لفظوں میں فرمائی ہے ــــــــ ابراہیم نے مکہ کو حرم قرار دینے کا اعلان کیا تھا اور میں مدینہ کے حرم ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ مدینہ کے دونوں دروں کے بیچ کا پورا رقبہ حرم ہے۔ اس میں خون نہ بہایا جائے۔ کسی پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے۔ درختوں کے پتے نہ جھاڑے جائیں۔ البتہ چارے کے لئے جھاڑے جا سکتے ہیں۔

مدینہ کی مسجد نبوی کی تعمیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھوں سے فرمائی۔ اور اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں اسی میں نماز پڑھی۔ اس مسجد کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے ــــــــ میری اس مسجد میں نماز پڑھنا دوسری مسجدوں میں ہزار نمازیں پڑھنے سے زیادہ افضل ہے، سوا مسجد حرام کے۔ ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں ــــــ میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نماز سے افضل ہے، مسجد حرام کے سوا۔ اور مسجد حرام کی ایک نماز دوسری مسجدوں کی ایک لاکھ نماز سے افضل ہے۔

مسجد نبوی کے بہت سے دروازے ہیں۔ بہتر ہے کہ حاجی باب جبریل سے داخل ہو۔ اگر یہاں بھیڑ ہو تو کسی بھی دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں۔ مدینہ میں یا مسجد نبوی میں کسی کو تکلیف پہنچانا یا کسی سے جھگڑا کرنا بالکل جائز نہیں۔ مسجد کے اندر ایک خاص مقام ہے جس کو روضۂ جنت

کہتے ہیں۔ اس مقام کی خاص فضیلت ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض کوثر پر ہے۔

مسجد نبوی میں داخل ہوکر دو رکعت نماز پڑھے۔ نماز کے بعد اللہ سے دنیا اور آخرت کی رحمتیں مانگے۔ اگر یہ دونوں رکعتیں ریاض الجنۃ میں پڑھے تو اور بہتر ہے تاہم اگر وہاں بھیڑ ہو تو مسجد کے کسی بھی حصے میں نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

نماز کے بعد اس مقام پر آئے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر ہے اور آپ کے دونوں خاص ساتھی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی قبریں ہیں۔ یہاں آکر قبروں کی زیارت کرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے سامنے ادب کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اس طرح آپ کو سلام کرے ــــــــ السلام علیک یا رسول اللہ و برکاتہ۔ روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ــــــــ جو شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجنے کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر سلام بھیجے اور ان دونوں کے لئے دعا کرے۔

حاجی کو چاہئے کہ مسجد نبوی میں پانچوں وقت کی نمازیں پڑھے اور اس میں کثرت سے ذکر، دعا اور نفلی نمازوں کا اہتمام کرے اور زیادہ ثواب کمانے کی اس فرصت کو پوری طرح استعمال کرے۔

مدینہ کی زیارت کرنے والے کے لئے مسجد قبا کی زیارت اور اس میں نماز پڑھنا بھی مستحب ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا کی زیارت سواری پر اور پیدل چل کر کرتے تھے اور اس میں دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح جنت البقیع اور شہداء کی قبروں اور حضرت حمزہ کی زیارت بھی مسنون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی زیارت کیا کرتے تھے اور ان کے لئے دعا فرماتے تھے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ــــــــ قبروں کی زیارت کرو وہ تمہیں آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبروں کی زیارت کا مقصد یہ ہے کہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہیں وہ جانے والوں کے انجام کی صورت میں رہنے والوں کے انجام کو بتاتی ہیں۔

مدینہ سے شمال کی جانب تین میل کے فاصلہ پر احد کا پہاڑ ہے۔ اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ـــــ احد ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم احد سے محبت کرتے ہیں۔ اب مدینہ کی آبادی احد کے قریب تک پہنچ گئی ہے۔ اس پہاڑ کے پاس اب بھی وہ جگہ موجود ہے جہاں ۳ھ میں غزوۂ احد پیش آیا۔ آپ کے چچا حضرت حمزہ اسی موقع پر شہید ہوئے۔ یہاں ایک احاطہ میں حضرت حمزہ کی سادہ قبر اب بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی کئی اصحاب کی قبریں ہیں۔ مدینہ کے آس پاس یا مدینہ کے اندر کئی مسجدیں ہیں اگر حاجی کو موقع ہو تو ان کی زیارت کرنا چاہئے اور وہاں نماز پڑھنا چاہئے۔ مثلاً مسجد قبا، مسجد جمعہ، مسجد غمامہ، مسجد سقیا، مسجد فتح، مسجد بنی حرام، مسجد ذباب، مسجد قبلتین، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی ظفر، مسجد الاجابۃ، مسجد سجدہ، مسجد ابی، مسجد ابوبکر، مسجد عمر، مسجد علی، مسجد ابراہیم وغیرہ۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۹ اکتوبر ۱۹۸۲ کو نشر کیا گیا۔

جنتُ المُعْلیٰ

مکہ جس زمین پر آباد ہے وہ ایک طرف نیچی اور دوسری طرف اونچی ہے۔ نچلے علاقہ کو مسفلہ اور اونچے علاقہ کو معلیٰ کہتے ہیں۔ اونچائی والے علاقہ میں ایک قدیم قبرستان ہے۔ اس کا نام جنت المعلیٰ ہے۔ یہ مکہ سے منی کے رخ پر واقع ہے۔ اس قبرستان میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم اور آپ کی والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر ہے۔ آپ کے چچا ابو طالب اور آپ کے دادا عبدالمطلب کی قبریں بھی یہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر جیسا صحابی اور ابوجعفر منصور جیسا حکمراں بھی یہیں مدفون ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے لوگوں کے مزارات ہیں جو ان شخصیتوں کی یاد دلاتے ہیں جو کبھی ہماری طرح زمین پر چلتے پھرتے تھے۔

زندہ آدمی کی علامت گھر ہوتے ہیں اور مردہ آدمی کی علامت قبرستان۔ قبرستان ہم کو یاد دلاتے ہیں کہ یہاں کچھ زندہ آدمی تھے جو اپنی عمر کی مدت پوری کرکے زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہو گئے۔ پھر وہ قبرستان جس کے باسیوں کا حال نام بنام معلوم ہو، اس کی اہمیت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایسے قبرستان تاریخ کا جزء ہوتے ہیں۔ وہ تاریخ کے زندہ صفحات ہوتے ہیں جن میں اگلی نسلیں اپنی پچھلی نسلوں کے احوال پڑھتی ہیں اور زندگی کے تسلسل کو یاد کرکے اپنے حال کو اپنے ماضی سے مربوط کرتی ہیں۔ قبرستان گویا ایک بیتا ہوا تجربہ ہے جو آج کے لوگوں کو کل کے لوگوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستان سناتا ہے۔ کوئی حاجی یا مکہ کی زیارت کرنے والا جب جنت المعلیٰ کے سامنے پہنچتا ہے تو یہ مقام اس کو یاد دلاتا ہے کہ زندگی کے جس راستہ پر وہ چل رہا ہے یہ وہی معلوم اور متعین راستہ ہے جس پر اس سے پہلے بہت سے لوگ چلے تھے۔ یہ ایک ایسے قافلہ کے گزرنے کے نشانات ہیں جو تاریخ میں اپنی واقعیت ثابت کر چکا ہے نہ کہ ایسا قافلہ جس کے نشانات ماضی کے دھندلے افسانوں میں گم ہو چکے ہوں۔

عرب میں قبوں اور پختہ تعمیرات والے قبرستان نہیں ہوتے۔ وہاں کی قبریں گویا ہموار میدان میں کچھ ابھرے ہوئے نشانات ہوتے ہیں، تقریباً ویسے ہی جیسے ہمارے یہاں کے کسی عام اور غیر پختہ قبرستان میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنت المعلیٰ عرب کا ایسا ہی ایک قبرستان ہے۔ جنت المعلیٰ ایک ایسا قبرستان ہے جو انسانی اضافوں سے پاک ہے۔ یہاں فطرت کا سادہ ماحول ہے نہ کہ انسان کا بنایا ہوا مصنوعی ماحول۔

ایک شخص جب جنت المعلیٰ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا ذہن تاریخ کے ان معلوم انسانوں کی طرف چلا جاتا ہے جو ہم سے پہلے عرب کی خاک میں پیدا ہوئے اور چلتے اور بولتے ہوئے بالآخر یہاں کی مٹی میں خاموش ہو کر لیٹ گئے۔

۱۔ جنت المعلیٰ میں خاموش ہو جانے والی روحوں میں سے ایک عبدالمطلب (۴۹۷ - ۵۷۹ء) ہیں۔ عبدالمطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے۔ انھیں نے آپ کا نام "محمد" تجویز کیا جو اس وقت عرب میں ایک نیا نام تھا۔ وہ آٹھ سال کی عمر تک آپ کے کفیل رہے۔ وہ بنو ہاشم کے سردار تھے اور نہایت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ عبدالمطلب کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ ابرہہ (شاہ حبش کی طرف سے صنعار کا حاکم) ہاتھیوں کی فوج لے کر

مکہ پر حملہ آور ہوا۔ ابرہہ نے مکہ کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اس نے عبدالمطلب کے دو سو اونٹ پکڑوا لیے۔ عبدالمطلب اس سلسلہ میں ابرہہ سے ملنے گئے۔ ابرہہ ان کی پُر وقار شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور ان کو اپنے پاس عزت کے ساتھ بٹھایا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے دو سو اونٹوں کے لئے آیا ہوں جو آپ کے آدمیوں نے پکڑ لیے ہیں: ابرہہ نے کہا: تم اپنے اونٹوں کے لئے مجھ سے سفارش کرنے آئے ہو اور اس محترم گھر (کعبہ) کے لئے کچھ نہیں کہتے جس کے اوپر تمھاری قومی عزت قائم ہے اور جس کو ڈھانے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ عبدالمطلب نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: میں اونٹ کا مالک ہوں۔ کعبہ کا مالک خدا ہے، وہ اس کی حفاظت کرے گا (انا رب الابل وان للبیت ربا سیمنعہ) چنانچہ خدا نے ابرہہ کے عظیم لشکر کو تباہ کر دیا اور وہ کعبہ پر حملہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

عبدالمطلب کا نام اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ کعبہ وہ مقدس گھر ہے جس کا پاسبان خود خدا ہے۔

۲۔ اسی طرح جنت المعلیٰ میں ابوطالب دفن ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ عام روایت کے مطابق وہ اگرچہ آپ پر ایمان نہیں لائے مگر انھوں نے اپنے بس بھر آپ کی پوری مدد کی۔ وہ آپ کے دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کی چٹان بن گئے۔ انھوں نے اپنے آبائی دین کو نہ چھوڑا۔ مگر انسانی حیثیت سے آخر وقت تک وہ آپ کا ساتھ دیتے رہے۔ حتیٰ کہ جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بائیکاٹ کیا اور آپ کو مع اپنے خاندان کے ایک خشک پہاڑ کے درہ (شعب ابی طالب) میں محصور ہونا پڑا، اس وقت بھی ابوطالب آپ کے ساتھ رہے۔ اگرچہ یہ تین سال کی مدت اتنی سخت تھی کہ وہ بیمار پڑ گئے اور بالآخر بعثت کے دسویں سال (۶۲۰ ء) ان کا انتقال ہو گیا۔ ابوطالب نے آپ کے مشن سے اتفاق نہ کرتے ہوئے بھی اپنے بھتیجے کے وہ سارے حقوق مکمل طور پر ادا کئے جو خاندان کے بڑے ہونے کی حیثیت سے ان پر آتے تھے۔

۳۔ آمنہ بنت وہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ تھیں۔ آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ آپ کے والد عبداللہ (۵۴۵ - ۵۷۰ ء) کا انتقال ہو گیا۔ عبداللہ کا ننہال مدینہ (یثرب) میں تھا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر چھ سال تھی کہ آپ کی والدہ آپ کو لے کر مدینہ گئیں تاکہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کر سکیں۔ ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام کر کے مکہ واپس آ رہی تھیں کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آمنہ کی عمر اس وقت قریب ۲۵ سال تھی۔ اس سفر میں آپ کی باندی ام ایمن حبشیہ آپ کے ساتھ تھیں۔ ام ایمن نے کچھ لوگوں کی مدد سے موجودہ جنت المعلیٰ میں ان کو دفن کیا اور آپ کے چھ سالہ بچہ کو ساتھ لا کر ان کے دادا عبدالمطلب کے حوالے کر دیا۔ آمنہ نے تاریخ کے سب سے بڑے انسان کو پیدا کیا، اگرچہ وہ اس کی عظمت کو دیکھنے کے لئے زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکیں۔

۴۔ حضرت خدیجہ بنت خُویلد مکہ کی ایک نہایت شریف اور مالدار خاتون تھیں۔ ان کے والد خُویلد بن اسد ایک اچھے تاجر تھے۔ وہ اپنی لڑکی کے لئے کافی سرمایہ چھوڑ کر مرے۔ پھر خدیجہ کی شادی مکہ کے دو تاجروں سے ہوئی۔

اولاً ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے، اور ان کے مرنے کے بعد عتیق بن عائذ مخزومی سے۔ یہ دونوں کچھ کچھ عرصہ کے بعد انتقال کر گئے اور حضرت خدیجہ کو دونوں کی دولت وراثت میں ملی۔ اس طرح حضرت خدیجہ بیوہ ہونے کے باوجود مکہ کی سب سے زیادہ مالدار خاتون بن گئیں۔ قریش کے شرفار اور دولت مند لوگ ان سے نکاح کی خواہش کرنے لگے۔ اسی درمیان میں ایک تجارتی تعلق کے ذیل میں ان کا تعارف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا۔ آپ دنیوی دولت سے خالی تھے مگر حضرت خدیجہ آپ کے کردار اور آپ کی شرافت سے متاثر ہوئیں اور خود ہی آپ سے نکاح کا پیغام بھجوایا۔ چنانچہ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۴۰ سال اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۵ سال تھی۔ جنت المعلیٰ میں حضرت خدیجہ کی قبر ہر آنے جانے والے کو یاد دلاتی ہے کہ تم کو دولت کے مقابلہ میں کردار کو اہمیت دینا چاہئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبری ملی تو وہ فوراً آپ پر ایمان لائیں۔ اس مشن میں آپ کو سخت ترین مصیبتیں پیش آئیں۔ حضرت خدیجہ کی ساری دولت اس مشن کی راہ میں خرچ ہو گئی مگر انھوں نے کبھی اُف نہ کیا۔ ہر سختی جو آپ پر پڑی اس کو سہنے میں وہ برابر کی شریک رہیں۔ وہ آپ کی صرف بیوی نہ تھیں بلکہ پورے معنوں میں آپ کی زندگی کی ساتھی تھیں۔ حضرت ابوہریرہ رضہ بتاتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر کسی مقام پر تھے کہ حضرت جبریل آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسول، یہ خدیجہ آپ کے لئے کھانا لئے ہوئے آ رہی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آئیں تو ان کے رب کی طرف سے اور پھر میری طرف سے ان کو سلام کہئے اور ان کو جنت کے ایک محل کی بشارت دے دیجئے جو موتیوں کا بنا ہوا ہوگا۔ اس محل میں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف (بخاری و مسلم) حضرت خدیجہ کا انتقال نبوت کے دسویں سال (۶۲۰ء) میں ہوا۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار فرمایا: خدیجہ مجھ پر ایمان لائیں جب کہ لوگوں نے میرا انکار کر دیا۔ انھوں نے میری تصدیق کی جب کہ لوگوں نے مجھ کو جھٹلایا۔ انھوں نے اپنے مال میں مجھ کو شریک کیا جب کہ لوگوں نے مجھ کو مال سے روکا۔ حضرت خدیجہ کی قبر تاریخ کی انتہائی معیاری خاتون کی یاد دلاتی ہے، ایسی خاتون جو اپنے رفیق زندگی کے لئے کبھی مسئلہ نہیں بنی۔ جس نے تکلیف کے دنوں میں بھی اپنے رفیق زندگی کا اسی طرح ساتھ دیا جس طرح آرام کے دنوں میں۔

۵۔ جنت المعلیٰ کے باسیوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر بھی ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ حالت اسلام میں پیدا ہوئے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں ان کا شمار نوعمر صحابہ میں ہوتا تھا۔ خدا ترس ہونے کے ساتھ وہ ایک بہادر اور مدبر انسان تھے۔ وہب بن کیسان کہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضہ نے مجھ کو نصیحت نامہ بھیجا اور اس میں لکھا: خدا سے ڈرنے والا وہ ہے جس نے بلاؤں پر صبر کیا اور اللہ کے فیصلہ پر راضی رہا اور نعمتوں کا شکر ادا کیا اور قرآن کے حکم کے آگے جھک گیا (من صبر علی البلاء ورضی بالقضاء وشکر النعماء وذل لحکم القرآن)

خلیفہ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضہ کے بعد خلافت کا بار سنبھالنے کے لئے پورے عالم اسلام میں جو چند شخصیتیں موزوں ترین تھیں ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن زبیر تھے۔ وہ بہادری اور دانش مندی اور تقوی

میں کمال درجہ رکھتے تھے۔ حجاز اور عراق کے لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ تاہم وہ عبد الملک بن مروان کے عامل حجاج بن یوسف سے جنگ کرتے ہوئے ۷۳ھ میں شہید ہو گئے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیر کی قبر ایک ایسے بلند انسان کی یاد دلاتی ہے جو حق کے آگے پوری طرح جھکا ہوا تھا مگر وہ ظلم اور بے انصافی کے آگے جھکنا نہیں جانتا تھا۔

۶۔ ابو جعفر منصور (۱۵۸ـ ۱۰۱ھ) عباسی خلفاء میں ایک نہایت قابل اور مدبر خلیفہ تھا۔ یہی خلیفہ ہے جس نے عراق کے شہر بغداد کی بنیاد رکھی اور اس کو اتنی ترقی دی کہ اپنے وقت میں وہ علم اور سیاست دونوں اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ اس کے زمانہ میں عجمی زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کثرت سے عربی زبان میں ہوئے۔ سنسکرت کی کتاب کا مشہور عربی ترجمہ کلیلہ و دمنہ بھی اسی کے زمانہ میں ہوا۔ تمام حکمرانوں کی طرح اگرچہ اس نے بھی اپنے سیاسی حریفوں پر مظالم کئے اور ان کو قتل کرایا۔ تاہم پر امن رعایا کے لئے وہ ایک بہترین حکمراں کی حیثیت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابو جعفر منصور موٹا کپڑا پہنتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اس کے کرتے میں پیوند دکھائی دیتے تھے۔ اسی بنا پر جعفر بن محمد صادق نے اس کے بارے میں کہا تھا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے منصور کو بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی ذات کے لئے فقر میں مبتلا کر دیا ہے۔

ابو جعفر منصور ذی قعدہ ۱۵۸ھ میں بغداد سے مکہ کے لئے حج کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ مگر وہ مکہ کے قریب پہنچا تھا کہ سخت بیمار ہو گیا اور وہیں حالت سفر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے بعد اس کو قریبی قبرستان جنت المعلیٰ میں دفن کر دیا گیا۔

۷۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ یہ چاروں صاحبزادیاں حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں۔ ان میں سے ابتدائی تین صاحبزادیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال کر گئیں۔ حضرت فاطمہ نے آپ کی وفات کے چھ ماہ بعد تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لڑکوں کی تعداد تین تھی۔ تینوں لڑکے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ ان میں سے قاسم اور عبد اللہ حضرت خدیجہ کے بطن سے پیدا ہوئے اور مکہ کے ابتدائی زمانہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ تیسرے صاحبزادہ ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ انھوں نے تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں ۱۰ھ میں وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والے آپ کے دونوں صاحبزادوں کی قبر بھی مکہ کے اسی قبرستان (جنت المعلیٰ) میں ہے۔ تاہم اب یہ صرف ایک زبانی روایت ہے۔ موجودہ قبرستان میں اس کا کوئی یقینی نشان موجود نہیں۔

نوٹ: یہ تقریر ۳ر نومبر ۱۹۸۰ء کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

پندرہ شعبان

قرآن کی سورہ نمبر ۴۴ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : قسم ہے اِس واضح کتاب کی۔ ہم نے اس کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے۔ بے شک ہم آگاہ کرنے والے تھے۔ اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے ہمارے حکم سے، بے شک ہم تھے بھیجنے والے، تیرے رب کی رحمت سے، وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارا رب اور تمہارے اگلے باپ دادا کا رب (الدخان ۱ – ۸)

قرآن کی اِن آیات میں جس مبارک رات (لیلۃ مبارکۃ) کا ذکر ہے، اُس کے سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ اِس سے مراد نصف شعبان کی رات ہے۔ اس رائے کے مطابق، ۱۵ شعبان کی رات اللہ تعالیٰ کے سالانہ فیصلوں کی رات ہے۔ اِس رات کو اگلے سال بھر کے تمام معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسانی دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہاں کثرت سے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ زمین کے اوپر خصوصی رحمتوں کا ماحول قائم ہو جاتا ہے۔

اِس تفسیر کے مطابق، ۱۵ شعبان کی تاریخ گویا رزق اور انعامات کی تاریخ ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ فرشتے لوگوں کی قسمتوں کے بارہ میں اندراجات کرتے ہیں۔ اِس تاریخ کی اِسی خصوصی اہمیت کی بنا پر اِس رات کو مسلمان ذکر وعبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ وہ آئندہ کے لئے صالح زندگی گذارنے کا اقرار کرتے ہیں۔ اِس طرح وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ اُن کے حق میں اچھے فیصلے فرمائے۔

۱۵ شعبان کے سلسلے میں کچھ روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ اگرچہ یہ روایتیں سند کے اعتبار سے زیادہ قوی نہیں ہیں۔ تاہم ان میں سے کچھ حدیثیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شعبان کی پندرھویں تاریخ آجائے تو تم لوگ اُس رات کو نماز میں کھڑے ہو کر اللہ کی عبادت کرو اور اُس

کے دن میں روزہ رکھو۔ کیوں کہ اللہ اس تاریخ کو آسمان دنیا کی طرف اترتا ہے۔ پھر وہ فرماتا ہے کہ کیا کوئی معافی مانگنے والا ہے تو میں اس کو معاف کر دوں۔ کیا کوئی رزق کا طالب ہے تو میں اُس کو رزق عطا کروں۔ کیا کوئی مصیبت زدہ اپنی مصیبت سے نجات چاہتا ہے تو میں اُس کی مصیبت سے اُس کو نجات دوں۔ اِسی طرح تمام حاجتوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکارا جاتا ہے اور یہ سلسلہ طلوع صبح تک جاری رہتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریل میرے پاس آئے۔ اور کہا کہ یہ رات نصف شعبان کی رات ہے۔ اور اللہ اِس رات کو اتنے آدمیوں کو آگ سے نجات دیتا ہے جتنا کہ قبیلۂ بنو کلب کی بکریوں کی تعداد ہے۔ مگر اللہ اِس رات کو شرک کرنے والے کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اور نہ کینہ والے آدمی کی طرف دیکھے گا۔ اور نہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی کرنے والے کی طرف دیکھے گا۔ اور نہ شراب پینے والے کی طرف دیکھے گا۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم مجھ کو اس رات میں قیام کرنے کی اجازت دیتی ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں، میرے باپ اور ماں آپ پر فدا ہوں۔ پھر آپ اٹھے۔ آپ نے نماز پڑھی اور طویل سجدہ کیا، یہاں تک کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ کی روح قبض کر لی گئی۔ پھر میں اٹھی اور آپ کو دیکھا۔ میں نے اپنا ہاتھ آپ کے قدموں پر رکھا۔ پھر قدموں میں حرکت ہوئی۔ پھر میں خوش ہوگئی۔ پھر میں نے سنا کہ آپ سجدہ میں دعا کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:

اے اللہ، میں تیری معافی کے ذریعہ تیری پکڑ سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری رضامندی کے ذریعہ تیری ناراضی سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری ہی ذات کے ذریعہ تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ تو بڑی شان والا ہے۔ میں تیری تعریف و توصیف بیان نہیں کر سکتا۔ تیری ذات ویسی ہی ہے جیسی تو نے خود اس کی توصیف بیان کی۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ پھر جب صبح ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس دعا کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ، تم بھی اس دعا کو سیکھ لو اور دوسروں کو بھی اُسے سکھاؤ۔ کیوں کہ جبریل نے مجھے تعلیم دی ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں اس کو سجدہ میں دہراؤں۔

ان آیتوں اور حدیثوں پر غور کرنے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ اور یہی وہ باتیں ہیں جن پر نصف شعبان کی تاریخ کو سب سے زیادہ دھیان دینا چاہئے۔

۱۔ شعبان کے مہینہ کی پندرہویں تاریخ اللہ تعالیٰ کے سالانہ فیصلوں کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو اللہ تعالیٰ خصوصی طور پر اپنے بندوں کی طرف توجہ فرماتا ہے۔ اس لئے اس تاریخ کو خصوصی طور پر اللہ کی یاد اور اس کی عبادت میں مشغول ہونا چاہئے۔

۲۔ اس تاریخ کا سب سے اہم عمل استغفار ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے معلوم ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تاریخ کو ہر آدمی اپنا احتساب کرے۔ اپنی پچھلی غلطیوں کا اقرار کرکے اس سے معافی مانگے۔ اور آئندہ کے لئے اللہ کے سامنے یہ عہد کرے کہ وہ اپنے آپ کو ایسی غلطیوں سے بچائے گا۔

۳۔ اس تاریخ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو رحمت اور انعام دیا جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ رحمت اور انعام فرماں برداروں کے لئے ہے۔ وہ سرکش اور نافرمان لوگوں کے لئے نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت اور انعام کا سچا امیدوار وہ ہے جو امیدوار بننے کے ساتھ اللہ کی نافرمانی کو بھی چھوڑ دے۔

۴۔ خاص طور پر کچھ گناہ ایسے ہیں جن سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اللہ کی رحمتوں کی تقسیم کے خصوصی دن بھی آدمی اس کی رحمت سے حصہ پانے میں ناکام رہے گا۔ مثلاً اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک کرنا، اپنے سینہ کو حسد اور انتقام سے گندا کرنا، رشتہ داروں کے ضروری حقوق ادا نہ کرنا۔ شراب جیسے برے کام میں مبتلا ہونا۔ وغیرہ۔

ہر چیز کے آداب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۱۵ شعبان کے بھی آداب ہیں۔ اور ۱۵ شعبان کا فائدہ وہی شخص پائے گا جو اس کے آداب اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۹ فروری ۱۹۹۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

باب سوم

قرآن کا رول

قرآن کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اوّل کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ کی دنیا آج کی دنیا سے بہت مختلف تھی۔ دونوں زمانوں کے اس فرق پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس فرق کو پیدا کرنے کا بہت زیادہ تعلق اس فکری انقلاب سے ہے جو قرآن اور قرآنی تحریک کے ذریعہ انسانی تاریخ میں ظہور میں آیا۔

اس وقت عرب میں ہر قسم کے سیاسی اور سماجی اور اقتصادی مسائل موجود تھے۔ مگر قرآن میں لوگوں کو جو پہلی تعلیم دی گئی وہ نہ سیاسی تھی اور نہ اقتصادی۔ بلکہ وہ یہ تھی کہ — پڑھو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن میں یہ بتایا گیا کہ اصلاحی عمل کا حقیقی آغاز کیا ہے۔ وہ علم ہے۔ علم یا شعور کی تعمیر وہ بنیادی عمل ہے جہاں سے اصلاحی کوششوں کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی واحد نتیجہ خیز طریقہ ہے۔ اس کے سوا کہیں اور سے آغاز کیا جائے تو وہ کبھی کوئی گہرا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔

قرآن کے بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہی صحیح ترین نقطۂ آغاز تھا۔ چنانچہ اوّلاً عرب میں اس کے نتیجہ میں ایک مکمل انقلاب آیا اور اس کے بعد ساری آباد دنیا تک اس کے اثرات پھیل گئے۔ علم سے آغاز کرنے کے نتیجہ میں بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ ملتی چلی گئیں۔

دوسری چیز جس پر قرآن میں زور دیا گیا وہ تھی فکری آزادی۔ اُس دور میں ہزاروں برس سے ساری دنیا میں شاہی جبر کا نظام چلا آرہا تھا۔ لوگ مجبور تھے کہ بادشاہ کی سوچ کے مطابق سوچیں اور بادشاہ کے طرز فکر کو آخری برحق چیز سمجھیں۔ جبر کے اس نظام نے ہزاروں سال سے انسان کی فکری ترقی کا راستہ بند کر رکھا تھا۔ ہر قسم کی علمی و فکری ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب کہ لوگوں کو آزادانہ طور پر سوچنے اور آزادانہ طور پر رائے بنانے کا موقع ہو۔ اور یہی چیز قدیم زمانہ میں لوگوں کو حاصل نہ تھی۔

قرآن میں اس فکری جبر کو فتنہ کہا گیا ہے۔ قرآن سے متاثر ہونے پر قرآن نے یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ فکری جبر کے نظام کے خلاف جدوجہد کر کے اس کو ہٹائیں۔ اور اس کی جگہ فکری آزادی کا نظام جاری کریں۔ یہ انقلاب بھی قرآن کے زیر اثر پوری طرح آیا۔ قرآن نے

ایسا ماحول پیدا کیا کہ آدمی آزادانہ طور پر اپنے ذہن کو استعمال کرسکتا تھا۔ ایک عام آدمی بھی خلیفہ یا حکمراں کے خلاف بلا جھجک بول سکتا تھا۔ اس طرح تاریخ میں ایک نیا فکری عمل شروع ہوا جو ترقی کرتے کرتے موجودہ فکری آزادی کے دور تک پہنچا۔

قرآن سے پہلے نیچر کو مقدس سمجھا جاتا تھا اور اس کو ایک قابل احترام چیز سمجھا جاتا تھا۔ اس ذہن نے نیچر کی تحقیق کرنے اور اس کو کنٹرول کرنے کا دروازہ بند کر دیا۔ قرآن نے لوگوں کو یہ ذہن دیا کہ نیچر (فطرت) خود انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ اس کی جانچ کرے اور اس کو بھرپور طور پر اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرے۔

قرآن کی اس تعلیم نے بھی لوگوں کو گہرائی کے ساتھ متاثر کیا۔ چنانچہ تاریخ میں پہلی بار نیچر (فطرت) کو مسخر کرنے کا ذہن پیدا ہوا۔ لوگ نیچر کی تحقیق کرنے لگے۔ یہاں تک کہ صدیوں کے عمل کے بعد وہ انقلاب ظہور میں آیا جس کو آج سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

قرآن سے پہلے انسان اونچے نیچے طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ قرآن نے نہایت طاقت کے ساتھ اعلان کیا کہ تمام انسان یکساں طور پر خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ تمام انسان خدا کی نظر میں ایک ہیں۔ انسانی برابری کے لئے قرآن کی اس آواز نے نہایت گہرائی کے ساتھ لوگوں کو متاثر کیا۔ لوگوں کی سوچ بدلنے لگی۔ یہ عمل صدیوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک نیا سماجی دور دنیا میں آگیا جب کہ تمام انسان برابر کی نظر سے دیکھے جائیں۔ تمام انسانوں کے لئے یکساں حقوق تسلیم کرلئے جائیں۔

قرآن سے پہلے ساری دنیا میں کسی مقصد کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ جنگ تھا۔ چنانچہ مستقل طور پر ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان جنگ جاری رہتی تھی۔ قرآن نے خدا کو خدائے رحمت بتایا۔ رسول کو رسول رحمت کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس طرح رحمت اور صلح اور صبر اور اعراض کو فروغ دے کر ثابت کیا کہ جنگ کی طاقت کے مقابلہ میں امن کی طاقت زیادہ ہے۔ اس طرح قرآن نے تاریخ میں پہلی بار پر امن جدوجہد کا دروازہ کھولا۔ پیغمبر اسلام نے اسی طریقہ کو استعمال کرکے ایک ایسا عظیم انقلاب برپا کیا جس میں خون اتنا کم بہایا گیا کہ عملاً اس کو غیر خونی انقلاب کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح تاریخ میں ایک نئی فکری تحریک چل پڑی جو تشدد کے بجائے عدم تشدد کی بنیاد پر بنی تھی۔ یہ تحریک تاریخ میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں پرامن جدوجہد کے اصول کو عالمی سطح پر تسلیم کر لیا گیا۔

قرآن میں کثرت سے ایسی آیتیں ہیں جن میں تفکر اور تدبر پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی انسانوں سے کہا گیا ہے کہ تم سوچو اور اپنی ذہنی صلاحیت کو کام میں لا کر زمین و آسمان کے رازوں کو دریافت کرو۔

قرآن نے لوگوں کے بند ذہن کو کھولا۔ ان کے اندر تقلیدی فکر کی جگہ اجتہادی فکر پیدا کی۔ اس طرح لوگوں کا ذہنی افق وسیع ہوا۔ ایک طرف ان کا ذہن جاگ اٹھا۔ دوسری طرف وہ کائنات کے چھپے ہوئے بھیدوں کو کھولنے اور ان کو استعمال کرنے لگے۔

یہ فکری انقلاب پہلے مکہ میں پیدا ہوا۔ پھر وہ مدینہ اور دمشق میں پہنچا۔ اس کے بعد اس کا مرکز بغداد بنا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اسپین میں اس نے زبردست ترقی کی۔ اس کے بعد وہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں داخل ہوا۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں اس کے اثرات پھیل گئے۔

عالمی فکری تاریخ پر قرآن کی گہری چھاپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کو شامل کیے بغیر انسانیت کے فکری سفر اور اس کے ارتقا کی تاریخ کو سمجھا نہیں جا سکتا۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ کو نشر کی گئی۔

سائنسی ترقیاں اور روحانی عقائد

موجودہ زمانہ میں سائنسی ترقیوں کے دو دور ہیں۔ ایک آئزک نیوٹن (۱۶۴۲-۱۷۲۷) سے لے کر البرٹ آئن سٹائن تک۔ اور دوسرا البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹-۱۹۵۵) کے بعد۔

سائنسی ترقی کا تعلق مادی ترقی سے ہے۔ یعنی ان چیزوں کی ترقی سے جو ہر دیکھنے والے کو نظر آتی ہیں۔ اس کے برعکس روحانیت ایک ایسی چیز ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ سائنس کی دنیا مرئی ہے اور روحانیت کی دنیا غیر مرئی۔ نیوٹن کے بعد سائنس کا جو دور شروع ہوا اس میں بے شمار سائنسی ترقیاں ظہور میں آئیں۔ مادہ نے تبدیل ہو کر ایک پر رونق تہذیب کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے مقابلہ میں روحانیت بدستور ایک غیر مرئی چیز بنی ہوئی تھی۔ ان حالات میں بہت سے لوگوں نے سمجھا کہ روحانیت ایک فرضی چیز ہے اور اس دنیا میں اصل وجود صرف مادہ کا ہے۔

مگر آئن سٹائن اور دوسرے سائنس دانوں کی تحقیقات نے اس نظریہ کو ختم کر دیا۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا کی تمام چیزیں آخری طور پر جس چیز سے بنی ہیں وہ ایٹم ہے اور ایٹم ایک ٹھوس مادی ذرہ ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ جدید تحقیقات نے ایٹم کو توڑ دیا۔ اب معلوم ہوا کہ مادہ کوئی ٹھوس چیز نہیں، وہ صرف ایک قسم کی منجمد توانائی ہے۔ مادہ کو جیسے ہی توڑا جاتا ہے وہ توانائی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کا دیکھنا ممکن نہیں۔

ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد اب مادہ خود بھی اسی طرح غیر مرئی ہو چکا ہے جس طرح اس سے پہلے روحانیت کو غیر مرئی سمجھا جا رہا تھا۔ چنانچہ جدید سائنس داں یہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ ہماری دنیا امکانات کی لہروں (waves of probabilities) کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس طرح جدید سائنسی ترقیوں نے ثابت کیا ہے کہ حقیقت اپنی آخری صورت میں غیر مرئی ہے۔ پہلے روحانیت اور مادیت دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔ اب مادہ خود روحانیت میں تبدیل ہو گیا۔ سائنس اپنے ابتدائی مرحلہ میں روحانیت کی تردید کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، مگر سائنس اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر روحانیت کی تصدیق کرنے والی بن گئی۔ اس نے روحانی حقیقت کو ہمیشہ سے زیادہ ثابت اور مضبوط بنا دیا۔

روحانی عقیدہ دراصل معنوی حقیقتوں میں یقین کرنے کا دوسرا نام ہے۔ روحانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ انسانی وجود میں جسم سے زیادہ اہمیت روح کو حاصل ہے۔ مادی

ترقیوں سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اخلاقی قدروں کو ترقی حاصل ہو۔ ظاہری رونقوں سے زیادہ بڑی چیز یہ ہے کہ انسان کو اندرونی سکون ملے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں اور سائنس کے پہلے دور میں نہ دکھائی دینے والی چیزیں غیر واقعی سمجھی جانے لگی تھیں۔ اس بنا پر یہ سمجھ لیا گیا کہ سائنس اور روحانیت میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔ مگر اب جب کہ سائنس خود بھی ایک قسم کا روحانی علم بن چکا ہے، روحانیت کے بارہ میں اس قسم کا خیال قائم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

یہ سائنس اور روحانیت کا نظریاتی پہلو تھا۔ اب اس موضوع کے عملی پہلو کو دیکھئے۔ یہاں بھی بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس اور روحانیت میں ٹکراؤ ہے۔ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ مگر یہ بات روحانیت کے غلط تصور کی پیدا کی ہوئی ہے۔ روحانیت کا صحیح تصور سامنے رکھا جائے تو سائنس اور روحانیت میں دوبارہ کوئی ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔

۱۹۶۱ میں نئی دہلی میں ایک بین اقوامی صنعتی نمائش ہوئی تھی۔ اس نمائش کو دیکھنے والوں میں میں بھی شامل تھا۔ اس موقع پر ہر ملک نے اپنی اپنی صنعتی ترقیاں دکھائی تھیں۔ امریکی پویلین سب سے زیادہ زائرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ وہ جدید طرز کی کار تھی جس کو "ہوائی موٹر کار" کہا جاتا تھا۔

میں اور دوسرے بہت سے لوگ ایک خاص میدان میں جمع تھے۔ اتنے میں ایک کار برآمد ہوئی۔ ڈرائیور نے پہلے اس کو زمین پر عام کار کی طرح چلایا۔ اس کے بعد کار اوپر اٹھی اور سطح زمین سے تقریباً چار فٹ بلند ہو کر چلنے لگی۔ اس طرح اس نے میدان کے چاروں طرف گول دائرہ میں چند چکر لگائے اور پھر نیچے آگئی۔

بتایا گیا کہ اس کار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اوپر سے ہوا لے کر تیزی سے نیچے کی طرف پھینکتی ہے۔ یہاں تک کہ کار اور سطح زمین کے درمیان ایک طاقت ور ہوائی گدا بن جاتا ہے۔ کار اس ہوائی گدے پر تیرتی ہوئی چلتی ہے جس طرح کشتی پانی میں تیرتی ہوئی چلتی ہے۔

اس انوکھی کار کو دیکھنے والوں میں ایک نوجوان سادھو بھی تھا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ نوجوان ۲۰ منٹ تک امریکی کار کو دیکھتا رہا۔ اس کی محویت کو دیکھ کر ایک اخباری نمائندہ نے اس سے اس کا تاثر پوچھا۔ اس کا جواب یہ تھا:

" اس کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا میں تیاگ

کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیوں کی دنیا میں اپنے حوصلے کی تسکین تلاش کروں۔ اس نمائش نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ روحانی اور مادی دونوں دنیاؤں میں سے کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھ کر اس کو اختیار کروں" (ہندستان ٹائمس ۲۰ فروری ۱۹۶۱)

اس طرح کے واقعات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سائنسی ترقی اور روحانیت کے درمیان ٹکراؤ ہے۔ ایک چیز کو لینا اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی دوسری چیز کو چھوڑ دے۔ مگر اس کا انحصار اس پر ہے کہ آپ روحانیت کے کیا معنی لیتے ہیں۔ اگر روحانیت کا مطلب یہ ہو کہ آدمی دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا جائے اور دنیا کی چیزوں سے کوئی مطلب نہ رکھے تو البتہ سائنس اور روحانیت دو متضاد چیزیں معلوم ہوں گی۔

لیکن اگر روحانیت کا دوسرا مطلب لیا جائے تو سائنس اور روحانیت کے درمیان کوئی ٹکراؤ باقی نہیں رہتا۔ روحانیت کا دوسرا مطلب ہے ـــــ روح اور نفس کی پاکیزگی۔ اس دوسرے اعتبار سے روحانیت حسن تعلق کا نام ہے نہ کہ ترک تعلق کا۔

روحانیت سائنس کا الٹا لفظ نہیں ہے بلکہ مادیت کا الٹا لفظ ہے۔ روحانی آدمی غیر مادی ہوتا ہے نہ کہ غیر سائنسی۔ روحانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مادی چیزوں میں نہ جیتا ہو بلکہ روحانی چیزوں میں جیتا ہو۔ اس کی ایک ذہنی زندگی ہو جس کو اس سے کوئی چھین نہ سکتا ہو۔ اس کو ایک قلبی سکون حاصل ہو جو ظاہری نفع یا نقصان سے بے نیاز ہو۔ اس نے فکر کی سطح پر کوئی ایسی چیز پائی ہو جو اس کو دوسری تمام چیزوں سے اعلیٰ نظر آئے۔ وہ اپنے آپ پر قائم ہو نہ کہ اپنے سے باہر کی مادی چیزوں پر۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک مادیت اور دوسرے روحانیت۔ کوئی بھی شخص ان دو چیزوں سے خالی نہیں۔ دونوں ہی چیزیں ہر آدمی کی لازمی ضرورت ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ دونوں میں سے کس چیز کو اولین اہمیت دی جائے اور کس کو ثانوی درجہ میں رکھا جائے۔ جو شخص مادی چیزوں کو دوسرا درجہ دے اور روحانیت کو پہلے درجہ میں رکھے اس کا نام روحانی آدمی ہے۔ اور جو شخص اس کے برعکس کرے وہ مادی آدمی۔

اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روحانیت کو آدمی کی زندگی میں مقصد کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور جو مادی چیزیں ہیں وہ ضرورت کے خانہ میں چلی جاتی ہیں۔ اس سے سائنسی ترقیاں رکتی نہیں۔ وہ بدستور جاری رہتی ہیں۔ البتہ سائنسی یا مادی ترقیوں کو بذات خود مقصد سمجھ لینے

سے سماج میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ روحانیت آدمی کو ذہنی اور اخلاقی صحت عطا کرتی ہے۔ مادی خوراک سے آدمی کا جسم تندرست ہوتا ہے اور روحانی خوراک سے آدمی کے ذہن و فکر کو تندرستی حاصل ہوتی ہے۔

عام آدمی کے لئے مادی چیزیں مقصد ہوتی ہیں اور روحانی آدمی کے لئے ضرورت۔ نقطۂ نظر کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں زبردست فرق پیدا کر دیتا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ روحانی آدمی کے اندر مادی نقصان کو برداشت کرنے کی بے پناہ طاقت آجاتی ہے۔ موجودہ دنیا مقابلہ اور حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں بار بار مختلف قسم کے نقصانات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اب جو شخص مادی چیزوں کو اپنا مقصد سمجھ رہا ہو وہ نقصان کو دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے اس کے اندر سخت جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وہ خودکشی کر لیتا ہے۔ مگر روحانی آدمی اس قسم کی ناخوشگواریوں کو آسانی سے جھیل لیتا ہے۔ کیوں کہ مادی نقصان کے بعد بھی اس کے پاس ایک اعلیٰ چیز موجود رہتی ہے جس کے سہارے وہ جی سکے۔

اس طرح روحانی آدمی اس سب سے بڑی برائی سے خالی ہوتا ہے جس کو گھمنڈ کہا جاتا ہے۔ گھمنڈ ہمیشہ مادی چیزوں کے بل پر پیدا ہوتا ہے۔ لوگ چوں کہ مادی چیزوں کو سب سے بڑی چیز سمجھتے ہیں اس لئے وہ ان کو پا کر گھمنڈ میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ انسانوں کو مادی ساز و سامان سے ناپتے ہیں۔ اس لئے جس شخص کے پاس مادی ساز و سامان کم ہو اس کو نیچا خیال کرتے ہیں اور جس شخص کے پاس مادی ساز و سامان زیادہ ہو اس کی بابت ان کا خیال ہو جاتا ہے کہ وہ اونچا آدمی ہے۔ اسی سے گھمنڈ کا جذبہ ابھرتا ہے اور انسانوں کے درمیان مصنوعی اونچ نیچ کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔

مگر روحانی آدمی مادی چیزوں کو دوسرے درجہ کی چیز سمجھتا ہے۔ وہ ان کو اپنا خادم سمجھتا ہے نہ کہ اپنا آقا۔ اس بنا پر وہ مذکورہ قسم کی نفسیات سے بچا رہتا ہے۔ نہ مادی سامان زیادہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے کو اونچا سمجھتا۔ اور نہ ایسا ہوتا کہ جس کے پاس مادی چیزوں کی کمی ہو اس کو وہ حقیر اور نیچا سمجھنے لگے۔ روحانیت آدمی کو اپنے لئے بھی بہتر بنا دیتی ہے اور دوسروں کے لئے بھی۔

نوٹ: ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیا گیا۔

اسلام کی آفاقیت

اسلام جب شروع ہوا اس وقت عرب کے شہر یثرب (مدینہ) میں دو قبیلے آباد تھے۔ ایک اوس اور دوسرے خزرج۔ یہ دونوں قبیلے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ مگر جب ان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین توحید کی حقیقت کھلی اور وہ اسلام کے دائرہ میں داخل ہوئے تو ان کی آپس کی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ دو دشمن گروہ ایک دوسرے کے دوست گروہ بن گئے۔ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لیے آپس میں لڑنے والے لوگ متحد ہوکر بلند تر انسانی مفاد کے مجاہد بن گئے۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے دونوں قبیلے صرف اپنی اپنی بڑائی کو جانتے تھے۔ اوس کا قبیلہ خزرج پر بڑا بننے کی کوشش کرتا اور خزرج کا قبیلہ اوس کے اوپر بڑا بننا چاہتا۔ اس طرح دو بڑائیاں آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہتی تھیں اور ان میں کبھی موافقت اور ہم آہنگی کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مگر جب انھوں نے اسلام کے ذریعہ ایک خدا کی بڑائی کو دریافت کیا تو ان کی اپنی الگ الگ بڑائیاں ختم ہوگئیں اور صرف ایک سب سے اونچی بڑائی باقی رہی۔ پہلے دونوں قبیلے غیر مشترک بڑائیوں میں جی رہے تھے، اب دونوں ایک ہی مشترک بڑائی میں جینے لگے۔ یعنی خدا کی بڑائی، جس سے بڑا اور کوئی نہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی آفاقیت جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے۔ اسلام انسان کو توحید کا عقیدہ دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ خدا ایک ہے۔ وہی سب کا خالق ہے۔ وہی سب کا مالک ہے۔ وہی سارے عالم کا نظام چلا رہا ہے۔ خدا ہی کے دیئے سے آدمی کو ملتا ہے۔ خدا نہ دے تو کوئی شخص کچھ بھی نہیں پاسکتا۔ یہ توحید اسلامی آفاقیت کی بنیاد ہے۔

جب آدمی اس کامل توحید کو اختیار کرتا ہے تو اس کی نظر میں ساری بڑائی صرف ایک خدا کے لیے ہو جاتی ہے۔ بقیہ تمام چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو طرح طرح کے اونچ نیچ ہیں وہ اس کو مصنوعی نظر آنے لگتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان جو مختلف قسم کی دیواریں اٹھا دی گئی ہیں وہ سب ڈھ جاتی ہیں۔ ذات اور رنگ اور نسل اور جغرافیہ اور اس قسم کی دوسری بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان میں جو فرق کیا گیا ہے وہ سب مٹ جاتا ہے۔ ہر انسان بندہ بن جاتا ہے اور ایک خدا سب کا معبود۔

توحید کا عقیدہ آدمی کے اندر یہی عالمی ذہن پیدا کرتا ہے۔ جس خدا کی طرف ایک انسان

دوڑتا ہے اسی خدا کی طرف تمام انسان دوڑنے لگتے ہیں۔ جس خدا کے سامنے ایک انسان اپنی بڑائی کو چھوڑتا ہے۔ اسی کے سامنے تمام انسان اپنی بڑائی کو چھوڑنے والے بن جاتے ہیں۔ توحید کے بغیر ہر انسان کی توجہ کا مرکز الگ ہوتا ہے، توحید کے تحت ہر آدمی کی توجہ کا مرکز ایک ہوجاتا ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی آفاقیت ہے، اس سے بڑی آفاقیت اس دنیا میں نہیں ہوسکتی۔

عرب قوم ہزاروں سال سے عرب کے جغرافیہ میں آباد تھی۔ مگر تاریخ میں اس کا کوئی کارنامہ لکھا نہ جاسکا۔ اسلام سے پہلے عربوں کا حال یہ تھا کہ وہ شاعری کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں لڑجاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ان کے درمیان ایک لڑائی چھڑتی تو وہ نسل در نسل سیکڑوں سال تک جاری رہتی۔

مگر یہی عرب تھے کہ جب اسلام کے زیر اثر ان کے اندر فکری انقلاب آیا تو انھوں نے ایک عالمی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہ اپنے محدود جغرافیہ سے نکل کر سارے عالم میں پھیل گیے۔ جو لوگ اس سے پہلے ناقابل ذکر سمجھے جاتے تھے انھوں نے تمام قابل ذکر علوم میں اپنے وقت کی سب سے بڑی ترقیاں کیں۔ عربی زبان جو اس سے پہلے صرف ایک مقامی بولی کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایک بین اقوامی زبان بن گئی۔

اس کی وجہ اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت تھی۔ اسلام نے ان کے بند ذہن کو کھول دیا۔ وہ نیچر کو پوجتے تھے، اسلام نے بتایا کہ نیچر تو مخلوق ہے اور بے بس ہے۔ پوجنے کے قابل تو صرف خدا کی ذات ہے جو تمہارا اور تمام دنیا کا مالک ہے۔ اس سے ان کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ نیچر جھکنے کی چیز نہیں ہے بلکہ ایسی چیز ہے جس کی تحقیق اور تسخیر کی جائے۔ وہ انسان کو عرب اور عجم، کالے اور گورے، آزاد اور غلام، اونچی نسل اور نیچی نسل میں بانٹے ہوئے تھے۔ اسلام نے ان پر کھولا کہ تمام انسان ایک آدم کی اولاد ہیں، ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے ان کے اندر وہ عالمی اور آفاقی ذہن پیدا ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنا وطن اور ساری انسانیت کو اپنا کنبہ سمجھ لیا۔ اسلام سے پہلے وہ دنیا سے الگ تھلگ ہورہے تھے۔ اسلام کے بعد وہ ساری دنیا کے شریک اور ساتھی بن گیے۔

اسلام سے پہلے عرب کے لوگ قبائلی دور میں جی رہے تھے، اسلام کی بنیاد پر جب فکری انقلاب آیا تو اس نے ان کو ایک بین اقوامی گروہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ان کی نظر چھوٹے چھوٹے مقاصد تک محدود تھی، اسلام کے بعد ان کی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ وہ خشکی اور تری کو

پار کر کے ساری دنیا تک وسیع ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی پہاڑ نہ رہا جو ان کی نظر کو روکے اور کوئی سمندر نہ رہا جو ان کے سفر میں حائل ہو۔

اسلام نے عربوں کے اندر جب آفاقیت پیدا کی تو ان کا یہ حال ہوا کہ قبیلہ کی سرداری پر فخر کرنے والے لوگ عالم کے امام بن گیے۔ ان کے اندر ابن سینا اور الرازی جیسے ماہرین طب پیدا ہوئے جن کی طبی کتابوں کے یورپ کی زبان (لاتینی) میں ترجمے ہوئے اور یورپ کے میڈیکل کالجوں میں وہ بطور نصاب داخل کی گئیں۔ ان میں الادریسی جیسا جغرافیہ داں پیدا ہوا جس نے سسلی کے بادشاہ راجر دوم کے لیے سب سے پہلا دنیا کا نقشہ بنایا، ان میں ایسے ماہرین صنعت پیدا ہوئے کہ انگلینڈ کے بادشاہ اوفا رکس نے اپنے یہاں سونے کا سکہ ڈھالنے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے۔

انھوں نے فن جہازرانی میں اتنی ترقی کی کہ ان کے یہاں احمد بن ماجد جیسا شخص پیدا ہوا جس نے واسکوڈی گاما کی بحری رہنمائی کی جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں یورپ اور ہندستان کے درمیان سمندری راستہ دریافت کرنے کے لیے نکلا تھا۔ ان کے یہاں ابو عبیدہ مسلم البلنسی جیسے زمینی علوم کے ماہر پیدا ہوئے جن کی تحقیقات کو پڑھ کر کولمبس کے اندر یہ خیال پیدا ہوا کہ یہاں کچھ اور بھی دنیائیں ہیں جن کو دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی شعور اور حوصلہ کے تحت وہ یورپ کے ساحل سے روانہ ہوا اور آخر کار نئی دنیا (امریکہ) کو دریافت کیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک کائناتی دین اور ایک آفاقی نظریہ ہے اور اسلام کی بنیاد پر بننے والی تاریخ اس کی تائید کرتی ہے۔ اسلام کی آفاقیت صرف نظریاتی چیز نہیں، وہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے۔

اسلام کے آفاقی اصولوں کا بہت اچھا اظہار اس واقعہ میں ہے جس کا تعلق ربعی بن عامرؓ اور رستم (ایرانی سردار) سے ہے۔ عرب جب قدیم ایران میں داخل ہوئے اور ایرانیوں کو ہر جگہ ان کے مقابلہ میں شکست کھانی پڑی، تو رستم نے ربعی بن عامر کو اپنے دربار میں بلایا۔ رستم اس وقت ایرانی افواج کا سپہ سالار تھا۔ رستم اپنے شاندار دربار میں سونے اور جواہرات کا تاج پہنے ہوئے عالی شان تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور ربعی بن عامرؓ بالکل معمولی کپڑے اور معمولی حالت میں تھے۔ رستم نے پوچھا کہ تم لوگ ہمارے ملک میں کیوں آئے۔ ربعی بن عامرؓ نے جواب دیا:

اللّٰہ ابتعثنا واللّٰہ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللّٰہ ومن ضیق الدنیا الی سعتھا ومن جور الادیان الی عدل الاسلام۔

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے اور اللہ ہم کو یہاں لے آیا ہے تاکہ جس کے بارہ میں وہ چاہے اس کو بندوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کریں اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کو اس کی وسعت میں پہونچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے چھٹکارا دے کر اس کو اسلام کے عدل و انصاف میں لے آئیں۔

ربعی بن عامرؓ نے اپنے اس قول میں نہایت مختصر طور پر مگر نہایت فصاحت کے ساتھ اسلام کے آفاقی اصولوں کو بیان کر دیا ہے۔

اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر جب ایک شخص کے اندر فکری انقلاب آتا ہے تو وہ مخلوقات سے گزر کر خالق کو پالیتا ہے۔ وہ کائنات کے مالک کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے جو تمام تنگیوں اور محدودیتوں سے بلند ہے۔ اس سے پہلے وہ بندوں کی سطح پر جی رہا تھا، اب وہ خدا کی سطح پر جینے لگتا ہے جو تمام آفاق سے اوپر ہے۔ اس سے پہلے اگر وہ ایک خول کے اندر تھا تو اب وہ خول کے باہر کی وسیع دنیا میں اپنے لیے زندگی کے مواقع پالیتا ہے۔

عام حالت میں آدمی بندوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ بس اپنے قدموں کے نیچے کی زمین کو جانتا ہے۔ مگر جب وہ خدا کو پاتا ہے اور خدا کا عبادت گزار بنتا ہے تو وہ انسانوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ انسانی دوستیاں اور دشمنیاں اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہیں۔ وہ انسانی شکایتوں اور انسانی محبتوں سے گزر جاتا ہے۔ اس کی روح لامحدود پنہائیوں میں سفر کرنے لگتی ہے جہاں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں الجھنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

خدا کو پانے سے پہلے آدمی دنیا کی محدودیتوں میں گم رہتا ہے۔ خدا کو پانے کے بعد وہ دنیا کی محدودیتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔ وہ اپنی آرزوؤں اور اپنے حوصلوں کی تسکین کے لیے بلند تر سطح پالیتا ہے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کھونا بھی پانا بن جاتا ہے۔ جہاں ناخوش گواریاں بھی خوش گواریوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ جہاں غم بھی اتنا ہی اہم بن جاتا ہے جتنا خوشی اور مسرت۔

پھر اسلام آدمی کو انسانی موشگافیوں والے دین سے نکالتا ہے۔ وہ آدمی کو جھوٹے رسم ورواج والے مصنوعی دین سے باہر لاتا ہے۔ وہ اس کو اس سچے دین سے آشنا کرتا ہے جہاں ایک طرف انسان ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا۔ جہاں خدا اور بندے کے درمیان کوئی دوسری چیز حائل نہیں، جہاں خدا سے ملنے کے لیے رسم ورواج کے بندھنوں میں اپنے کو باندھنے کی ضرورت نہیں۔

خدا ہر آن اپنے بندوں تک پہونچا ہوا ہے، اسی طرح خدا کے بندے بھی ہر آن خدا تک پہونچ سکتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں، اس لیے خدا اور بندے کے ملاپ کے لیے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت بھی نہیں۔ انسان جب اس ابدی دنیا میں پہونچتا ہے تو وہ خدا کو بھی عین اسی مقام پر پالیتا ہے جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔

اسلام توحید کا دین ہے۔ اسلام میں خدا ایک ہے اور ساری خدائی بھی اسی ایک ذات کو حاصل ہے۔ جو لوگ اس خالص توحید کو پالیں وہ ایسی لامحدود دنیا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں آفاقیت ہی آفاقیت ہے، اور جہاں ابدیت ہی ابدیت۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو (بمبئی) سے ۷ اکتوبر ۱۹۸۶ کو نشر کی گئی

اخلاقی سلوک

دنیا میں جب لوگ مل جل کر رہتے ہیں تو بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک کا سابقہ دوسرے سے پڑتا ہے۔ گھر کے اندر بھی اور گھر کے باہر بھی۔ ایسے مواقع پر دوسروں کے ساتھ شرافت اور انصاف کا معاملہ کرنا اچھا اخلاق ہے، اور پستی اور بے انصافی کے ساتھ معاملہ کرنا برا اخلاق۔

اچھے اخلاق کی سب سے پہلی پہچان یہ ہے کہ آپ اپنے دل سے دوسروں کے خیر خواہ ہوں۔ آپ ہمیشہ دوسروں کا بھلا چاہیں۔ دوسروں کے لیے آپ کے دل میں محبت ہو، نفرت نہ ہو۔ دوسروں کی ترقی کو دیکھ کر آپ کے اندر جلن نہ پیدا ہو اور دوسروں کو برے حال میں دیکھ کر آپ انھیں حقیر نہ سمجھیں۔ دوسروں کے بارے میں آپ کوئی بات سنیں تو آپ اس کو اچھے معنی میں لیں، اس کی وجہ سے آپ دوسروں کے بارے میں بدگمان نہ ہو جائیں۔

دوسروں کا خیر خواہ بننے کی پہچان کیا ہے۔ اس کی سادہ پہچان یہ ہے کہ دوسروں کے لیے آپ وہی پسند کرنے لگیں جو آپ خود اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔ آپ کو یہ پسند ہے کہ دوسرے لوگ آپ کا اعتراف کریں تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کا اعتراف کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کو بے عزت نہ کرے تو آپ بھی اسی طرح دوسروں کو کبھی بے عزت نہ کریں۔ آپ کو پسند ہے کہ کوئی آپ کا مال بے جا طور پر نہ لے تو آپ بھی دوسروں کا مال بے جا طور پر لینے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائیں۔

دنیا میں آدمی کا سابقہ جب دوسروں سے پیش آتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ کبھی دوسروں کے ساتھ اس کو شکایت ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر خوش اخلاقی کے رویہ پر قائم رہنے کی ایک ہی لازمی شرط ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے اندر اعراض کرنے اور بھلا دینے کی عادت ہو۔

دوسروں کی زبان سے آپ کے لیے کڑوا بول نکلے مگر آپ دوسروں کو اپنا کڑوا بول نہ سنائیں۔ دوسروں سے آپ کو کوئی چوٹ لگ جائے تو آپ ایسا نہ کریں کہ آپ بھی اس کے خلاف انتقامی جذبہ لے کر بیٹھ جائیں۔ دوسرا آپ کو نظرانداز کر رہا ہو، اس وقت بھی آپ ایسا نہ کریں کہ اپنے آپ کو اس سے کاٹ لیں۔ اس دنیا میں اچھے اخلاق پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی برے اخلاق والوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرے۔ اور برائی کے جواب میں بھی اچھائی کا نمونہ پیش کرے۔

اچھے اور برے اخلاق کا بہت زیادہ تعلق زبان سے ہوتا ہے۔ کڑوا بول بداخلاقی کی علامت ہے اور میٹھا بول خوش اخلاقی کی علامت۔ زبان سے نکلے ہوئے کچھ الفاظ ایک شخص کو آپ کا دشمن بنا سکتے ہیں۔ اور اسی زبان سے نکلے ہوئے کچھ اور الفاظ کا اثر یہ ہو سکتا ہے کہ ان کو سننے والا آپ کا قریبی دوست بن جائے۔

اخلاق کا ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ آپ کے اندر دوسروں کے لیے فیاضی اور اعلیٰ ظرفی کے جذبات ہوں۔ دوسروں کی سخت بات کو برداشت کر کے آپ ان کے ساتھ نرم بات بولیں۔ دوسرے سے آپ کو نقصان پہنچے تب بھی آپ اس کو نفع پہنچائیں۔ دوسرے سے آپ کو کچھ نہ ملنے والا ہو تب بھی آپ اس کو دینے کی کوشش کریں۔ دوسرا آپ کو اشتعال دلائے تب بھی آپ مشتعل ہوئے بغیر اس کے ساتھ شرافت کا معاملہ کریں۔

اخلاق اس بہتر سلوک کا نام ہے جس میں شرافت، خیر خواہی اور اعلیٰ ظرفی کی اسپرٹ پائی جائے۔ با اخلاق انسان وہ ہے جس کی زندگی میں سورج کی روشنی اور پھول کی مہک جیسی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔

اچھا سماج بنانے کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اچھا اخلاق ہے۔ جس سماج کے افراد اچھے اخلاق والے ہوں، جو ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق اور انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے زندگی گزاریں، وہ سماج یقیناً بہتر سماج ہوگا۔

بہتر اخلاقی سماج ہی کا دوسرا نام بہتر انسانی سماج ہے۔ سماج کو اونچا اٹھانا ہے تو اخلاق کو اونچا اٹھائیے۔ سماج کو درست کرنا ہے تو اس کے افراد کو اخلاقی اعتبار سے درست کیجئے۔ یہی بہتر سماج بنانے کا واحد یقینی راستہ ہے۔ اس کے سوا اُس کا اور کوئی راستہ نہیں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۴ فروری ۱۹۹۲ کو نشر کیا گیا۔

اسلامی تعلیمات کا انسانی پہلو

اسلام انسانیت کا مذہب ہے۔ اسلام میں جن باتوں کو بتایا گیا ہے۔ ان سب کے پیچھے ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے، اور وہ ہے انسان کے اندر سچی انسانیت لانا۔ انسانی نسلوں کو ایکتا کا سبق دینا۔ انسانی سماج کو سکھ اور شانتی اور ترقی والا سماج بنانا۔

اسلام کا مطلب ہے سلامتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا خلاصہ سلامتی ہے۔ اسلام وہ انسان تیار کرنا چاہتا ہے جس کے دل میں ہر ایک کے لئے سلامتی ہو۔ جو ہر ایک کا بھلا چاہے۔ جو ہر ایک کے ساتھ سلامتی والا سلوک کرے۔ جو ہر ایک کا سواگت مبارک سلامت کے کے جذبات کے ساتھ کرے۔

اسی طرح ایمان کی اصل امن ہے۔ ایمان کا لفظ امن سے بنا ہے۔ اس اعتبار سے مومن وہ ہے جو امن پسند ہو۔ جو خلاف امن باتوں کے مقابلہ میں امن کی باتوں کو پسند کرتا ہو۔ وہ اسی سمت میں بڑھے جدھر امن پایا جائے۔ وہ ان سرگرمیوں میں مشغول نہ ہو جو امن کو توڑنے کا سبب بن جائیں۔

اسلام میں سب سے اہم عبادت نماز ہے جو روزانہ پانچ وقت ادا کی جاتی ہے۔ نماز جب پوری ہو جاتی ہے تو آخر میں تمام نمازی اپنے دائیں اور بائیں منھ پھیر کر کہتے ہیں کہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ایک بڑے عالم نے اس کا مطلب بتاتے ہوئے کہا کہ نمازی ہر طرف کے تمام انسانوں سے کہتا ہے کہ تم مجھ سے سلامت ہو، تم مجھ سے سلامت ہو۔ یعنی تم مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرو۔ تمھارا جان، مال، عزت سب مجھ سے محفوظ ہے۔ نماز کی عبادت سے میں ایک ایسا سبق لیکر مسجد کے باہر نکل رہا ہوں کہ تمھارے لئے میرے پاس سلامتی کے سوا اور کچھ نہیں۔

پیغمبر اسلام نے بتایا کہ انّ العباد کلّھم اخوۃ۔ یعنی تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلام آدمی کے دماغ میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی باپ اور ماں (آدم اور حوا) کی اولاد ہیں۔ اس لئے سب کے جسم میں ایک ہی خون دوڑ رہا ہے۔ سب ایک دوسرے

کے لئے بھائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دو آدمیوں کے درمیان سب سے اونچا اور سب سے پیارا رشتہ بھائی کا رشتہ ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لئے سب سے زیادہ طاقت ور بات یہ ہے کہ ان کے اندر یہ سوچ پیدا کر دی جائے کہ تم ایک دوسرے کے بھائی ہو۔ اسلام لوگوں میں یہی برادرانہ سوچ پیدا کرتا ہے۔ اور بلاشبہ انسانیت کے پہلو سے اس سے بڑی کوئی اور سوچ نہیں۔

بہت سے انسان جب ایک سماج میں مل کر رہیں تو وہ کس طرح رہیں۔ اچھے انسانی سماج کا بنیادی اصول کیا ہے۔ اس بارے میں حدیث میں ایک ایسا جامع اصول بتایا گیا ہے جو اس سلسلہ کے تمام پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ حدیث یہ ہے: ان یحبَّ لِاَخِیہ مایحبُّ لنفسہ۔ یعنی آدمی اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں تمام انسانی باتیں آجاتی ہیں۔ ہر آدمی کو معلوم ہے کہ کون سی بات اس کو اچھی لگتی ہے اور کون سی بات اس کو اچھی نہیں لگتی۔ کون سا معاملہ اس کو پسند ہے اور کون سا معاملہ اس کی پسند کے خلاف ہے۔ کون سا سلوک وہ اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے اور کون سا سلوک اس کو اپنے لئے بہتر معلوم نہیں ہوتا۔

اس طرح ہر آدمی کے پاس ایک بہترین کسوٹی موجود ہے جس کے ذریعہ وہ ہر وقت جان سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے درمیان کس طرح رہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس کسوٹی کے مطابق ہر آدمی کو سماج میں اس طرح رہنا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ ہر موقع پر وہی برتاؤ کرے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ اور اس برتاؤ سے دور رہے جس کو وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتا۔ جب وہ بولے تو اسی کے مطابق بولے اور جب کچھ کرے تو اسی کے مطابق کرے۔

اس اصول کی تفصیل قرآن اور حدیث میں ہر پہلو سے موجود ہے۔ مثلاً بتایا گیا ہے کہ تم کسی انسان کو قتل نہ کرو۔ تم کسی کے خلاف براگمان نہ کرو۔ دوست اور دشمن ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرو۔ کوئی برائی کرے تب بھی اس کا جواب بھلائی سے دو۔ کوئی غصہ والی بات کہے تب بھی تم غصہ نہ ہو۔ اختلافی معاملات میں صلح کا طریقہ اختیار کرو۔ اپنی کمائی میں سے دوسروں کا حق نکالو۔ اپنے

پڑوسی کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچاؤ۔ اگر تم کسی سے وعدہ کرو تو اس کو ضرور پورا کرو۔ راستہ میں کوئی رکاوٹ ہو تو اس کو راستہ سے ہٹا دو۔ اسلام سلامتی کا مذہب ہے۔ جو سلامتی کی بات ہے وہ اسلام کی بات ہے، اور جس بات میں سلامتی نہیں وہ اسلام کی بات بھی نہیں۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی (نیشنل چینل) سے ۱۲ مئی ۱۹۹۴ کو نشر کی گئی۔

باب چہارم

انسانیت کی تعمیر میں اسلام کا حصّہ

چودہ سو سال پہلے اسلام جب آیا تو اس وقت انسانیت رنگ اور نسل کی بنیاد پر مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے یہ تصور دیا کہ سارے انسانوں کا خالق ایک ہے۔ اس نے ایک ہی مادہ سے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ مختلف انسانوں میں رنگ ونسل کا جو ظاہری فرق ہے وہ پہچان کے لئے ہے نہ کہ امتیاز کے لئے۔ اسی کو مولانا الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھدیٰ کا   کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

اسلام کی یہ آواز فطرت کی آواز تھی۔ چنانچہ وہ لوگوں کے دلوں میں اتر گئی۔ جو لوگ انسانوں کو اونچ نیچ میں بانٹ کر ان کے اوپر حکومت کر رہے تھے۔ انھوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کو دکھائی دیتا تھا کہ یہ نظریہ اگر پھیلا تو ان کی ہزاروں سال سے قائم شدہ بڑائی ختم ہو جائے گی۔

مگر اسلام کی آواز فطرت کی آواز تھی۔ وہ لوگوں میں نہایت تیزی سے پھیل گئی۔ دھیرے دھیرے اونچے طبقہ کے لوگ غیر مؤثر اقلیت بن گئے۔ یہاں تک کہ انسانی برابری کے نظریہ کی بنیاد پر اسلام ایک سماجی انقلاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ انقلاب پہلے عرب میں آیا۔ اس کے بعد وہ پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصوں میں چھا گیا۔

اسلام سے پہلے نچلے طبقہ کا کوئی آدمی اونچے طبقہ کے آدمی کے خلاف بول نہیں سکتا تھا۔ اسلام نے ایسا انقلاب برپا کیا کہ ایک معمولی آدمی کو بھی یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ خلیفۂ وقت کے اوپر تنقید کرے۔ ایک عام آدمی وقت کے حاکم کو عدالت میں کھڑا کر سکے۔ مسجد کے اندر ایک غریب آدمی امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ ایک صف میں شانہ بشانہ عبادت کر سکے۔ وغیرہ

اسی طرح اسلام نے محاسبہ (introspection) کا احساس لوگوں کے اندر پیدا کیا۔ یعنی انسان اس دنیا میں آزاد نہیں ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور اس کی کوئی پوچھ گچھ نہ ہو۔ بلکہ ہر آدمی خدا کی پکڑ میں ہے۔ ہر آدمی موت کے بعد خدا کی عدالت میں پیش ہونے والا ہے۔

اس کے بعد نیکیوں کے لئے خدا کا انعام ہوگا اور برائی کرنے والوں کے لئے سخت عذاب۔

یہ تصور جب لوگوں کے دماغ میں بیٹھا تو اس نے انھیں بالکل بدل ڈالا۔ اب انسان کسی کے خلاف بری بات سوچنے سے بھی ڈرنے لگا۔ کیوں کہ اس کو اندیشہ تھا کہ خدا تو دل کی بات بھی جانتا ہے۔ پھر میں کیسے اس کی پکڑ سے بچ سکوں گا۔

جن لوگوں نے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کیا تھا وہ انھوں نے اس کے مالک کو واپس کر دی۔ کیوں کہ پیغمبر اسلام نے بتایا کہ جو زمین تمہاری نہیں ہے اس کو آج اگر تم اپنی ملکیت بناؤ گے تو کل وہ تمہارے لئے آگ کا انگارہ بن جائے گی۔

اس نظریہ سے متاثر ہونے کے بعد لوگ احتیاط کی زندگی گزارنے لگے۔ انھوں نے دوسروں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیا۔ وہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچ بولنے لگے۔ وہ خیانت کو چھوڑ کر امانت دار بن گئے۔ وہ شر پسندی کو چھوڑ کر خیر پسند بن گئے۔ انھوں نے بے انصافی کو چھوڑ کر انصاف کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ حق تلفی سے باز آ گئے۔ اور انھوں نے حق کی ادائیگی کو اپنا طریقہ بنا لیا۔ جو لوگ اپنے کو عزت والا بتاتے تھے اور دوسروں کو حقیر سمجھتے تھے وہ سب کو ایک نظر سے دیکھنے لگے۔

یہ تمام اخلاقی تبدیلیاں اس لئے آئیں کہ اسلام نے ان کے ذہن میں بٹھایا کہ تم ہر لمحہ خدا کی نظر میں ہو۔ خدا کے فرشتے تمہارے عمل کا ریکارڈ تیار کر رہے ہیں۔ موت کے بعد آنے والی زندگی میں یہ سارا ریکارڈ پیش ہوگا اور اس کے مطابق سزا یا انعام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس اسلامی عقیدہ نے لوگوں کو اس طرح بدل دیا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ زندگی کو چھوڑ کر ذمہ دارانہ زندگی گزارنے لگے۔

اس سلسلہ میں اسلام کا مزید کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صرف اعلیٰ اصولوں کی تبلیغ نہیں کی۔ بلکہ اس کو اپنے مشن میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اس نے ایک پورا معاشرہ عملاً اسی نہج پر قائم کر دیا۔

عرب میں اور عرب کے باہر اسلام نے جو معاشرہ قائم کیا وہ ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں تمام لوگ برابر کے افراد کی حیثیت سے رہتے تھے۔ جہاں ہر آدمی کو یہ اعتماد ہوتا تھا کہ جس آدمی سے اس کا معاملہ پیش آئے گا وہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ وہ وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ وہ بدمعاملگی نہیں

کرے گا۔ وہ سازشی طریقہ اختیار نہیں کرے گا۔ ہر آدمی مطمئن تھا کہ دوسرے سے مجھے خود غرضی اور بدخواہی کا تجربہ نہیں ہوگا۔ کوئی کسی کا استحصال نہیں کرے گا۔ کوئی کسی کے ساتھ لوٹ مار پر نہیں اتر آئے گا۔

اسلام نے ایسا معاشرہ بنایا جو پیشین گوئی کی حد تک بااخلاق تھا۔ جہاں ہر آدمی قابل پیشین گوئی کردار کی صفت اپنے اندر رکھتا تھا۔ جہاں آدمی پیشگی طور پر جان سکتا تھا کہ اگر میرا معاملہ کسی کے ساتھ پھنس جائے تو وہ میرا استحصال نہیں کرے گا۔ اگر میں کسی پر تنقید کردوں تو وہ میرا دشمن نہیں ہو جائے گا۔ اگر کوئی غریب سے امیر یا محکوم سے حاکم بن جائے تو یہ چیز اس کو سرکش بنانے والی ثابت نہیں ہوگی۔ اگر کسی کے ساتھ میرا کوئی مال یا جائداد کا معاملہ ہو تو وہ بے انصافی پر نہیں اتر آئے گا۔

ایک اچھے انسانی معاشرہ کی تعریف یہ ہے کہ اس کے افراد سے ہمیشہ بہتر اخلاق کی امید کی جائے۔ وہ قابل پیشین گوئی کردار (predictable character) کے حامل ہوں۔ اور پیغمبر اسلام نے جو معاشرہ بنایا وہ ایسا ہی معاشرہ تھا۔ وہ انسانیت کے لئے ایک رحمت تھا۔ اور زمین والوں کے لئے ایک برکت۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۴ مئی ۱۹۹۶ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

معاشرت کی تعمیر و تشکیل میں مذاہب کا رول

جن لوگوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کا ہندستان دیکھا ہے، اور پھر وہ آج کا ہندستان دیکھ رہے ہیں، وہ دونوں زمانوں کے درمیان ایک نمایاں فرق پائیں گے۔ پہلے زمانہ میں اخلاقی قدروں کی اہمیت تھی، انسانی احترام تھا، لوگ ایک دوسرے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرتے تھے۔ اب ہمارے سماج میں یہ سب چیزیں ختم ہوگئیں۔ اب انسانیت کے بجائے خودغرضی کا رواج ہے۔ ذمہ داریوں کے بجائے حقوق کا شور سنائی دیتا ہے۔ میل ملاپ کے بجائے ٹکراؤ کا دور دورہ۔

یہ فرق کیوں ہوا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ پہلے سماج کے اوپر مذہب کا غلبہ تھا، اب سماج کے اوپر سیاست کا غلبہ ہوگیا ہے۔ پہلے مذہبی شخصیتیں لوگوں کی رہنما ہوا کرتی تھیں۔ اب نئے حالات میں غیر مذہبی شخصیتیں لوگوں کی رہنما بن گئی ہیں۔ اس تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کی تعمیر و تشکیل میں مذاہب کا رول کتنا زیادہ ہے۔

مذاہب کا کام کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ہے ـــــ آدمی کو مادیت کی سطح سے اٹھانا اور اس کو روحانی سطح پر جینے والا بنانا۔ اس طرح جب آدمی کے اندر روحانیت آتی ہے تو اپنے آپ وہ خودغرضی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے ایسے آدمی کے اندر نفرت کے بجائے محبت آجاتی ہے۔ وہ تمام انسانوں کو اپنا سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے اندر لینے سے زیادہ دینے کا مزاج آجاتا ہے۔ اور جس سماج میں ان قدروں کا رواج پیدا ہو جائے وہ سماج لازمی طور پر امن اور بھائی چارہ کا سماج بن جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ ہر اخبار اور ہر جلسہ سیاسی آوازوں سے گونجتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح پہلے زمانہ میں مذہبی اور روحانی تحریکوں کا زور تھا۔ ہر جگہ اور ہر طرف مذہبی شخصیتیں لوگوں کا مرکز اور لوگوں کی معلم بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح مذاہب کے اثر سے ساری دنیا میں مثبت انسانی روایات قائم ہوئیں۔ انھیں مثبت روایات کے زیر اثر ساری دنیا چلتی رہی۔ یہاں تک کہ نیا زمانہ آیا جس نے ان مذہبی روایتوں کو توڑ دیا۔

سیاست ہمیشہ ٹکراؤ پر چلتی ہے۔ جب کہ مذہب کی بنیاد محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب سماج پر سیاست کا غلبہ ہوا تو اس کے فطری نتیجہ کے طور پر سماج میں باہمی تناؤ اور ٹکراؤ کا ماحول قائم ہوگیا۔ اس کے برعکس پچھلے زمانہ میں جب مذہب کا غلبہ تھا تو سماج میں محبت اور انسانیت کی قدریں پرورش پارہی تھیں۔

اس سلسلہ میں چند بڑے مذاہب کی مثال لیجئے۔ ہندوازم نہایت قدیم مذہب ہے۔ ہندو ازم کا نظریہ وہ تھا جس کو اَدویت واد کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے فلسفیانہ پہلو سے قطع نظر، اس نے لوگوں میں یہ احساس جگایا کہ میں اور تو کا فرق اضافی ہے۔ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔

یہ مذہبی نظریہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بناتا ہے کہ اگر میں سچا ہوں تو دوسرا بھی اپنے لحاظ سے سچا ہوسکتا ہے۔ اس طرح ہندو مذہب کے پھیلاؤ نے وہ چیز پیدا کی جس کو موجودہ زمانہ میں سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ اور بلاشبہ عملی اعتبار سے مشترک سماج کے لئے سیکولرزم سے بہتر کوئی نظریہ نہیں۔

سیکولرزم لوگوں کے اندر ہم وجودیت (co-existence) کا ذہن بناتا ہے۔ اور ہم وجودیت یا بقائے باہم کا نظریہ مشترک سماج کی تعمیر و تشکیل کے لئے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندستانی سماج میں اس فکر کے اثرات ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ یہاں ہر مذہب کے لوگ آئے، اور ہر ایک کو یہاں استقبال ملا۔ مذہبی بنیاد پر کبھی ہندستان میں کسی کی مخالفت نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندستان میں ہر مذہب کے لوگ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ یہاں شیر وشکر ہو کر رہ رہے ہیں۔

اس کے بعد بدھزم کو لیجئے۔ بدھ ازم کی تحریک زیادہ تر مذہبی ظاہر پرستی کے خلاف اٹھی۔ بدھ ازم نے ظاہری ڈھانچہ کے بجائے اقدار (values) پر زور دیا۔ اس نے انسان کو سب سے زیادہ اہمیت دے کر یہ تعلیم دی کہ انسان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا سب سے بڑا مذہبی عمل ہے۔

اس طرح بدھ ازم کے پھیلاؤ نے لوگوں کے اندر تواضع، سادگی، انکساری، امن پسندی کا مزاج پیدا کیا۔ اس سے انسانی معاشرہ میں زبردست اخلاقی انقلاب آیا۔ اس انقلاب

کے واضح اثرات ان سماجوں کے اندر دیکھے جاسکتے ہیں جہاں بدھ ازم کو زیادہ پھیلاؤ ملا۔ خاص طور پر جاپان اور تھائی لینڈ سے لے کر ملیشیا اور سنگاپور تک کا علاقہ اس کی مثال ہے۔ ان ملکوں کے لوگوں میں امتیازی طور پر امن پسندی، تواضع اور اطاعت شعاری کا مزاج دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بڑی حد تک بدھ ازم کی دین ہے۔

اس کے بعد مسیحیت کو لیجئے۔ مسیحی قوموں میں ایک جذبہ تمام قوموں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور وہ انسانی محبت اور خدمت خلق کا جذبہ ہے۔ یہ براہ راست طور پر ان کے مذہب کی دین ہے۔ حضرت مسیح نے سیاسی باتیں نہیں کیں۔ انھوں نے وقت کی حکومت سے کوئی ٹکراؤ نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔

اس طرح مسیحیت میں انسانی محبت اور انسانی خدمت کی روایتیں قائم ہوئیں۔ اس سے مسیحی قوموں میں یہ مزاج پیدا ہوا کہ وہ حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کریں۔ وہ سیاسی ٹکراؤ سے بچتے ہوئے خدمت خلق کے شعبوں میں اپنے آپ کو لگا دیں۔ اس مزاج کے اثرات ہندستان میں اور دوسرے ملکوں میں واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسیحی قوموں نے موجودہ زمانہ میں خدمت خلق کے میدان میں سب سے زیادہ کام انجام دیا ہے۔

اب اسلام کو لیجئے۔ اسلام میں سب سے زیادہ زور توحید پر ہے۔ اسلام کے نزدیک ساری بڑائی صرف خدا کو حاصل ہے۔ بڑا صرف ایک ہے۔ باقی تمام لوگ یکساں اور برابر ہیں۔ ایک حدیث میں اس بات کو ان الفاظ میں کہا گیا ہے کہ الخلق عیال اللہ۔ یعنی تمام انسان خدا کی پریوار ہیں۔

اس عقیدہ سے انسانی مساوات کا نظریہ پیدا ہوا۔ نہ صرف مسلمان بلکہ دوسری قومیں بھی کسی نہ کسی طور پر اس تحریک مساوات سے متاثر ہوئیں۔ ساری دنیا میں عام طور پر انسانی برابری کے اصول کو مانا جانے لگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام سے پہلے برتر نسل اور کمتر نسل کا نظریہ ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ انسانیت اونچے اور نیچے طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام کے ذریعہ جو فکری انقلاب آیا اس نے انسانی نابرابری کے دور کو ختم کیا اور انسانی برابری کے دور کو ہمیشہ کے لئے تاریخ کے

دھارے میں شامل کر دیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ انسانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں مذاہب کا رول ہمیشہ نہایت مثبت رہا ہے۔ اس معاملہ میں مذاہب کے تعمیری رول سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

نوٹ : یہ تقریر ۱۲ جنوری ۱۹۹۶ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

مذہب اور سیاست

مذہب کیا ہے۔ مذہب ان روحانی قدروں اور انسانی اصولوں میں جینے کا نام ہے جن کو خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بتایا ہے۔ مذہب کا پہلا اصول توحید ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں صرف ایک حقیقت ایسی ہے جو سب سے اوپر ہے جو سب سے بالا ہے، اور وہ خدا ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے۔ وہ اس سے گھمنڈ کا جذبہ چھین لیتا ہے جو تمام برائیوں کی اصل جڑ ہے۔

مذہب کا دوسرا اصول مساوات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اور سب کے سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں۔ مذہب کا یہ اصول انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کی اونچ نیچ کو مٹا دیتا ہے۔ خواہ وہ دولت اور عہدہ کی وجہ سے ہو، یا رنگ اور نسل کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے۔ اس مذہبی عقیدہ کے مطابق تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ سب کو ایک مشترک خاندان کی طرح مل جل کر رہنا چاہئے۔

مذہب کا تیسرا بنیادی اصول عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماجی تعلقات اور آپس کے لین دین میں ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ دوسرے آدمی کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ کرے جس طرح ترازو ٹھیک ٹھیک تولتا ہے اسی طرح انسان کو بھی ٹھیک ٹھیک تولنا چاہئے۔ انسان کا ہر معاملہ اسی طرح درست ہونا چاہئے جس طرح ترازو کی تول بالکل درست ہوتی ہے۔

یہی مذہب کی اصل حقیقت ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مذہب درحقیقت کچھ قدروں اور کچھ پیمانوں کا نام ہے۔ وہ ایک فرد کو سوچ اور مزاج کے اعتبار سے، خاص طرح کا انسان بناتا ہے۔ ایسا انسان جو دنیا میں تواضع کی نفسیات کے ساتھ جئے۔ جو سچائی کے آگے جھک جائے۔ جو تمام انسانوں کو اپنا سمجھے، جس کو کوئی انسان غیر نظر نہ آئے۔ جو دوسرے انسان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو وہ خود اپنے ساتھ چاہتا ہے۔ جو اپنے آپ کو بھی اسی پیمانہ سے ناپے جس پیمانہ سے وہ دوسروں کو ناپنا چاہتا ہے۔

اس طرح مذہب انسان کی زندگی کو جانوروں کی زندگی سے الگ کر دیتا ہے۔ جانور صرف ایک ہی بات کو جانتے ہیں۔ اور وہ ان کا فائدہ ہے۔ وہ اپنے غرض اور فائدہ کے سوا کسی اور چیز سے واقف نہیں۔ مگر مذہبی انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ مذہبی انسان کی زندگی کچھ قدروں اور کچھ اصولوں

کے تابع ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہش پر نہیں چلتا۔ بلکہ اپنے عقلی فیصلہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو حق کے مطابق کرنا چاہئے۔ اور وہ نہیں کرتا جس کا کرنا حق کے مطابق اس کے لئے درست نہیں۔

مذہب کی اس حقیقت کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات اپنے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کا تعلق سیاست سے کیا ہے۔ وہ چیز جس کو آجکل سیاست کہا جاتا ہے اس سے مذہب کا براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ البتہ بالواسطہ طور پر مذہب کا تعلق سیاست سے اسی طرح ہے جس طرح اس کا تعلق دوسری تمام انسانی سرگرمیوں سے ہے۔

ایک شخص جو صحیح معنوں میں مذہبی ہو اور مذہب کو اس کی روح کے اعتبار سے اپنائے ہوئے ہو تو وہ زندگی کے جس شعبہ میں بھی داخل ہوگا اس کا مذہب بھی اس کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ اس کا رویہ ہر معاملہ میں مذہبی انسان کا رویہ ہوگا۔ مثلاً وہ سڑک پر چل رہا ہو تو وہ ٹریفک کے اصولوں کی پوری پابندی کرتا ہوا چلے گا۔ وہ کسی سروس میں ہو تو وہ حسب قاعدہ اپنی پوری ڈیوٹی انجام دے گا۔ وہ تاجر ہو تو اس کی تجارت لوٹ اور دھوکہ بازی کی تجارت نہیں ہوگی بلکہ دیانت داری کی تجارت ہوگی۔ ایک سچا مذہبی انسان خود اپنے اندرونی جذبہ کے تحت مجبور ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی رہے بااصول انسان کی طرح رہے۔ وہ کسی بھی حال میں بے اصولی اور خود غرضی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

یہی معاملہ سیاست کا بھی ہے۔ ایک مذہبی انسان سیاست میں بھی، براہ راست یا بالواسطہ طور پر داخل ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں بھی وہ اپنے مذہبی مزاج کے تحت اپنا سیاسی عمل کرے گا نہ کہ مذہبی مزاج کو چھوڑ کر۔ اس کی سیاست دوبارہ بااصول سیاست ہوگی نہ کہ مصلحت پرستی کی سیاست۔ وہ سیاسی مواقع کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے استعمال کرے گا نہ کہ قوم اور ملک کو لوٹنے کے لئے۔ وہ اپنی سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے جھوٹ نہیں بولے گا۔ بلکہ اپنی غلطیوں کا کھلے طور پر اعتراف کرے گا، خواہ اس اقرار کی قیمت اس کو یہ دینی پڑے کہ وہ سیاسی عہدہ یا سیاسی اقتدار سے محروم ہو جائے۔

ایک شخص سیاست میں مذہب کا نام لے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مذہبی آدمی ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ ایک خود غرض سیاست داں ہو اور مذہب کا نام صرف اس لئے استعمال کر رہا ہو کہ اس کے ذریعہ سے عوام کو دھوکہ دے۔ وہ اپنی خود غرضی کی سیاست چلائے اور ظاہر یہ کرے کہ وہ مذہب کی سیاست چلا رہا ہے۔

مشہور مثل ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح مذہب کے نام پر چلائی جانے والی سیاست کو بھی اس کے نتیجہ کے اعتبار سے جانچنا چاہئے۔ اگر یہ سیاست اخلاق اور انسانیت کی فصل اگا رہی ہو تو وہ مذہبی لوگوں کی سیاست ہے۔ اور اگر اس کے نتیجہ میں باہمی ٹکراؤ اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہو تو یقینی طور پر وہ استحصالی سیاست ہے۔ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر کہا جائے کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری، تو یہ الفاظ بے معنی معلوم ہوں گے۔ لیکن اگر ہم لفظ بدل دیں اور یوں کہیں کہ مذہبی آدمی کی تجارت یا مذہبی آدمی کی ڈاکٹری، تو پھر یہ الفاظ بے معنی معلوم نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ مذہبی تجارت یا مذہبی ڈاکٹری کسی چیز کا نام نہیں۔ مگر مذہبی آدمی کی تجارت واقعۃً ایک چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اپنی سوچ اور اپنے ذہن کے اعتبار سے مذہبی ہو۔ ایسا آدمی جب تجارت کرے گا تو اس میں وہ اپنے مذہبی اصولوں کا لحاظ کرے گا۔ مثلاً وہ گاہک کو دھوکا نہیں دے گا۔ وہ لین دین میں خیانت نہیں کرے گا۔ وغیرہ۔ اس طرح اس کی تجارت مذہبی آدمی کی تجارت بن جائے گی۔

اسی طرح ایک شخص سچا مذہبی ہو، اس کے بعد وہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرے تو وہ اپنے مریضوں کو صرف پیسہ لوٹنے کا ذریعہ نہیں سمجھے گا۔ بلکہ وہ ان کا ہمدرد ہوگا۔ وہ ان کو صحیح دوا دے گا۔ وہ ان کا خیر خواہ بن کر ان کا علاج کرے گا۔ اس طرح کا اعلیٰ سلوک اس کی ڈاکٹری کو ایک مذہبی انسان کی ڈاکٹری بنا دے گا۔

گویا مذہب عملی اعتبار سے مذہبی انسان کا نام ہے۔ اگر واقعۃً کسی سماج میں مذہبی انسان ہیں تو ان کے مذہبی عمل سے سماج میں مذہبی ماحول پیدا ہوگا۔ اور اگر ایسے انسان نہ ہوں جو واقعی معنوں میں مذہبی ہوں تو ایسا سماج مذہبی سماج نہیں بن سکتا، خواہ وہاں مذہبی نعرہ لگانے والوں کی بھیڑ اکٹھا ہو، خواہ وہاں مذہب کے نام پر کتنے ہی ہنگامے جاری ہوں۔

مذہبی تجارت حقیقۃً مذہبی انسان کی تجارت کا دوسرا نام ہے۔ مذہبی انسان کے بغیر وہ تجارت وجود میں نہیں آسکتی جس کو مذہبی تجارت کہا جاسکے۔ اسی طرح اگر مذہبی سیاست کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔ حقیقی مذہبی انسان کے بغیر حقیقی مذہبی سیاست کا کوئی

وجود نہیں۔

جو لوگ مذہب کی اس حقیقت کو نہیں جانتے وہ "مذہبی حکومت" بنانے کا نعرہ لگاتے ہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ "مذہبی انسان" بنانے کی کوشش کی جائے۔ "مذہبی حکومت بناؤ" کا نعرہ ایک بے معنی نعرہ ہے جو صرف سماجی جھگڑے اور قومی فساد میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر "مذہبی انسان بناؤ" کا مشن چلایا جائے تو سماج میں جھگڑا گھٹے گا اور فساد ختم ہوگا۔

"مذہبی تجارت" اگر کوئی چیز ہو تو وہ مذہبی انسان کی تجارت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی انسان کے بغیر مذہبی تجارت کے کوئی معنی نہیں۔ اسی طرح "مذہبی سیاست" اگر کوئی چیز ہو تو وہ بھی مذہبی انسان کی سیاست کا دوسرا نام ہوگی۔

سچے مذہبی انسان کی روش ہی کسی سیاست کو مذہبی رنگ دیتی ہے۔ اگر سچے مذہبی انسان نہ ہوں تو مذہبی نعرے بازی یا مذہب کے نام پر ہنگامہ آرائی سے کوئی سیاست مذہبی سیاست نہیں بن سکتی، خواہ اس قسم کی کوشش میں ہزاروں سال لگا دئے جائیں۔

مذہب اور سیاست یا سیاست اور مذہب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سیاست کو مذہب کے لئے استعمال کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مذہب کو سیاست کے لئے استعمال کیا جائے۔ پہلی صورت مذہب کے مطابق ہے اور انسانیت کے لئے رحمت ہے۔ جب کہ دوسری صورت سراسر مذہب کے خلاف ہے اور انسانیت کے لئے ایک سماجی عذاب سے کم نہیں۔

مذہب کے بارے میں خاص طور پر مشرقی ملکوں میں لوگ بہت حساس ہوتے ہیں۔ اگر مذہب کے نام پر کوئی اشو کھڑا کیا جائے تو وہ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس بنا پر خود غرض سیاستداں اپنی لیڈری کو نمایاں کرنے کے لئے اس کو سب سے زیادہ آسان سمجھتے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں" جیسا کوئی نعرہ بلند کریں اور لوگوں میں اِدھر سے اُدھر تک آگ لگا دیں۔ اس آگ کی روشنی میں لیڈر کا اپنا چہرہ تو خوب روشن ہو جاتا ہے مگر عام انسان اس کی آگ میں جھلس کر رہ جاتے ہیں۔

صحیح سیاست اور غلط سیاست کو ناپنے کا ایک بہت کھلا ہوا معیار ہے۔ جو سیاست محبت کی بنیاد پر اٹھائی جائے وہ سچی سیاست ہے۔ اور جو سیاست نفرت کی بنیاد پر اٹھائی جائے وہ جھوٹی سیاست۔

اب چونکہ مذہب تمام انسانوں سے محبت اور خیر خواہی کی تعلیم دیتا ہے اس لئے جب کوئی سچا مذہبی انسان سیاست کے میدان میں آئے گا تو وہ انسانوں کی محبت کی بنیاد پر اپنی سیاسی تحریک چلائے گا۔ وہ سیاست میں ان اعلیٰ انسانی قدروں کو شامل کرے گا جو مذہب کا روح اور خلاصہ ہیں۔ مثلاً بے غرضی، اصول پسندی، انصاف، استحصال سے بچنا، حقوق سے زیادہ ذمہ داریوں کا خیال، وغیرہ۔

اس کے برعکس اگر کوئی شخص مذہب کا نام لیتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ وہ نفرت اور تشدد کی سیاست چلانا چاہتا ہے تو یقینی طور پر وہ مذہبی نہیں ہے۔ وہ مذہب کو صرف اپنے خودغرضانہ مقاصد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ کیوں کہ مذہب اور نفرت یا مذہب اور تشدد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے۔

مذہب اور سیاست کا لفظ ایسا ہی ہے جیسے محبت اور سیاست کا لفظ۔ محبت سے بھرا ہوا دل، خواہ وہ سیاست کے پلیٹ فارم پر ہو یا اور کسی پلیٹ فارم پر، کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کرسکتا۔ اسی طرح جس انسان کے اندر مذہب کی روح اتری ہوئی ہو وہ کبھی نفرت اور دشمنی کی بات نہیں کرے گا، خواہ وہ سیاست کے میدان میں ہو یا کسی اور میدان میں۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۸ کو نشر کیا گیا۔

ایجاب وقبول کی روایت

زندگی نام ہے لین دین کا۔ لینے کا اور دینے کا۔ دوسروں کو متاثر کرنے کا اور دوسروں سے متاثر ہونے کا۔ یہ ایک عام سماجی قانون ہے جو ساری تاریخ میں جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ جہاں انسانی تعلقات ہوں گے، وہاں یہ باہمی عمل بھی جاری رہے گا۔

باہمی تبادلہ کی ایک مثال تجارت ہے۔ تجارتی لین دین میں لوگ ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ اسی طرح مکانات بنانے میں لوگ ایک دوسرے کے تعمیری تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح فرنیچر، سواری، زراعتی سامان اور دوسری تمام چیزوں میں ایک انسانی گروہ اور دوسرے انسانی گروہ کے درمیان لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔ اور یہ عین فطری بات ہے کہ یہ دوطرفہ عمل انسانوں کے درمیان برابر جاری رہے۔

تاہم لین دین کے واقعات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو اس سے ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ یہ عمل محدود ہے نہ کہ لامحدود۔ اس دوطرفہ عمل میں ایک خاص حدبندی کا طریقہ رائج ہے۔ یعنی دونوں طرف کی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو برابر ایک دوسرے کے اثر سے بدلتی رہتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ کچھ اور چیزیں ہیں جو ہمیشہ یکساں رہتی ہیں۔ وہ اثر قبول کئے بغیر یکساں حالت میں اپنے آپ کو باقی رکھتی ہیں۔

اس معاملہ میں زندگی کی مثال سمندر کے پانی کی سی ہے۔ سمندر میں اوپر کی سطح پر موجیں اٹھتی ہیں۔ ایک طرف کا پانی دوسری طرف کے پانی میں برابر ملتا رہتا ہے۔ مگر سمندر کے نیچے کا پانی بالکل ساکن ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا ہے۔ سمندر کے اوپر کے پانی میں تبادلہ کا عمل جاری رہتا ہے اور سمندر کے نیچے کے پانی میں یکسانیت اور برقراری کا عمل۔

یہ فرق عین فطری ہے اور اس کو لازماً باقی رہنا چاہئے۔ اس فرق کو ختم کرنا فطرت کے خلاف ہے۔ اس سے ٹکرانا فطرت سے ٹکرانا ہے۔ اور فطرت سے ٹکرانے والا خود اپنے کو تباہ کرتا ہے، وہ فطرت کے ابدی عمل میں تبدیلی لانے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں تغیر پذیر امور میں ٹھہراؤ پر اصرار کرنا بھی غلط ہے اور ٹھہراؤ والے امور میں تغیر کی کوشش بھی یکساں

طور پر غلط اور بے فائدہ ہے۔

اب اس کی روشنی میں " مذہب میں ایجاب وقبول کی روایت " پر غور کیجئے۔ مذہب کا معاملہ بھی اسی عام قانون کے تحت آتا ہے۔ مذہب میں بھی کچھ ابدی اصول ہیں، اور کچھ اس کے اضافی پہلو ہیں۔ مذہب کے ابدی اصول ہمیشہ یکساں حالت پر باقی رہتے ہیں۔ مگر اس کے اضافی پہلو میں تبادلہ کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس دوسرے پہلو میں ایک مذہب دوسرے مذہب سے لیتا بھی ہے اور اسی کے ساتھ اس کو دیتا بھی ہے۔ ایک اعتبار سے مذہب سمندر کی تہ کی مانند ہے اور دوسرے اعتبار سے مذہب سمندر کی سطح کی مانند۔

سمجھنے کی آسانی کے لئے ان دونوں چیزوں کو مذہبی حقیقت اور مذہبی کلچر کہا جاسکتا ہے۔ ان کو ہم مختص طور پر مذہب اور کلچر کہیں گے۔ مذہب بنیادی طور پر کچھ اصول اور کچھ قدروں کا نام ہے۔ یہ اصول اور قدریں ابدی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ صداقت کی حامل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی یا مصالحت ممکن نہیں۔

مگر کلچر کا تعلق زیادہ تر اجتماعی رہن سہن سے ہے۔ وہ جغرافی تقاضوں اور قومی حالات اور تاریخی عوامل سے ایک یا دوسری شکل میں متشکل ہوتا ہے۔ ان میں مذہب کے بنیادی اصولوں کا انعکاس بھی ضرور موجود ہوتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ وقتی یا مقامی حالات سے بھی اثر قبول کرتا ہے۔

اسلام کی مثال لیجیے۔ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں شروع ہوا۔ اس کے بعد وہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔ اسلام کی بنیاد جن ابدی اصولوں پر تھی۔ مثلاً توحید، رسالت، آخرت، ان معاملات میں مسلمانوں نے کسی ملک میں کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ یہ اصول ہر جگہ اپنی حالت میں یکساں طور پر برقرار ہے۔ مگر، مثال کے طور پر لباس کے معاملہ میں، مسلمانوں نے ہر ملک کے مقامی رواج کا اثر قبول کیا۔ آج عرب، ایران، ہندستان، یورپ، ہر جگہ مسلمان موجود ہیں۔ مگر ہر جگہ ان کا لباس جدا گانہ ہے۔

تاہم ایک اصول ہر جگہ کارفرما نظر آئے گا۔ لباس کے ستر کے بارہ میں اسلام نے جو اصول مقرر کئے تھے، اس کو مسلمانوں نے ہر جگہ یکساں طور پر برقرار رکھا۔ مگر لباس کی وضع کے بارہ

میں ہر جگہ وہ مقامی رواج کا اثر قبول کرتے رہے۔ گویا لباس کے معاملہ میں انھوں نے "پچاس فیصد" اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا، اور بقیہ "پچاس فیصد" میں مقامی حالات کا۔

اگر آپ مختلف ملکوں کا سفر کریں تو آپ ہر ملک کے مسلمانوں کے دسترخوان میں فرق پائیں گے۔ عرب کا کھانا، ایران کا کھانا، یورپ کا کھانا، ہر جگہ کے مسلمانوں کے کھانے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ مگر یہاں بھی فرق کے ساتھ یکسانیت کا ایک پہلو ہر جگہ موجود ہے۔ مسلمانوں نے کھانے کے طریقوں میں ہر جگہ مقامی اثر قبول کیا، مگر کھانے کے بارہ میں اسلام نے حرام و حلال کی جو حد مقرر کی تھی، اس کو ہر جگہ برقرار رکھا۔

یہی معاملہ مکانات کا ہے۔ مختلف ملکوں میں مسلمانوں کے مکانات دیکھئے تو ایک جگہ اور دوسری جگہ کے طرز تعمیر میں کافی فرق نظر آئے گا۔ ہر جگہ مسلمانوں نے مقامی طرز تعمیر کا اثر قبول کیا اور مکانات بنانے میں اس کا لحاظ کیا۔ مگر اسی کے ساتھ ایک اصول ہر جگہ ان کے یہاں غیر متغیر طور پر موجود ملے گا۔ اور وہ "پردہ" کا اصول ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مکانات میں زنان خانہ اور مردان خانہ کی تقسیم رکھی۔ ان کو انھوں نے اس طرح بنایا کہ پردہ کے حدود کو باقی رکھتے ہوئے وہ اس کے اندر اپنے خاندان کے ساتھ رہ سکیں۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی نقطۂ نظر سے اس ایجاب و قبول کے دو پہلو ہیں۔ ایک اصول اور اقدار کے اعتبار سے، اور دوسرا، کلچرل مظاہر کے اعتبار سے۔ اصولی امور میں مذہب کا طریقہ صدفی صد برقراری کا ہے۔ اور کلچرل مظاہر کے معاملہ میں پچاس فیصد اور پچاس فیصد کا طریقہ کارفرما ہے۔ یعنی مذہب اپنے اصول اور عقائد کے معاملہ میں صدفی صد غیر متغیر حالت میں باقی رہنا چاہتا ہے۔ اور کلچرل مظاہر کے معاملات میں پچاس فیصد کی حد تک اپنی قدروں کو باقی رکھتے ہوئے بقیہ پچاس فیصد میں مطابقت اور ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۲ مارچ ۱۹۹۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

تیوہار اور قومی یک جہتی

تیوہار کو عربی میں عید، ہندی میں تیوہار اور انگریزی میں فیسٹول (Festival) کہتے ہیں۔ تیوہار کا بنیادی مقصد اجتماعی روایات کو زندہ رکھنا اور فرد کو فرد سے جوڑنا ہے۔ انسانی تہذیب کی پوری تاریخ میں تیوہار کا رواج رہا ہے۔ سال کی خاص تاریخوں میں مشترک طور پر قومی تقریب منعقد کرنا، یا مشترک تصور کے تحت کسی یادگار دن کو اجتماعی خوشی منانا، اسی کا نام تیوہار ہے۔

تیوہار عام طور پر سال کی مقرر تاریخوں میں ہوتے ہیں۔ اس روز سب لوگ جمع ہو کر مخصوص انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس طرح تیوہار لوگوں کے اندر اجتماعیت اور یک جہتی پیدا کرنے میں مددگار ہوتا ہے۔ وہ سماج کے ایک حصہ کو اس کے دوسرے حصہ سے قریب لے آتا ہے۔ تیوہار ملاقات اور تعلق کی مضبوط اور پائدار زمین فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

تیوہار کا ایک حصہ عام طور پر کسی مخصوص سماجی گروہ کے اپنے عقیدہ اور اپنی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک حصہ عمومی ہوتا ہے جو صرف ایک سماجی گروہ کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتا بلکہ پورے سماج، اور وسیع تر معنوں میں تمام انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

مثلاً عید میں دوگانہ نماز کا تعلق مسلم عقیدہ سے ہے۔ وہ مسلمانوں کے مذہب کا حصہ ہے۔ مگر عید میں شیرینی کھانا اور کھلانا ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ وہ انسانی سطح پر میل جول کو بڑھانے والا ہے۔ وہ ایک عالمی چیز ہے نہ کہ کوئی گروہی چیز۔ اسی طرح دیوالی میں لکشمی کی پوجا کرنا ہندو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ہندو مذہب کا جز ہے لیکن گھر کی صفائی ایک ایسی چیز ہے جس میں ہر آدمی کے لئے دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ اس کو ہر آدمی خوشی سے اختیار کر سکتا ہے۔

میں آزادی (۱۹۴۷) سے پہلے والے ہندستان میں پیدا ہوا۔ مجھے اپنے بچپن کی یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب دیوالی کا تیوہار آتا تو مسلمان ہندوؤں کے یہاں تحفے بھیجتے۔ ہم لوگ بھی اپنے

گھروں کی صفائی اسی طرح کیا کرتے تھے جس طرح ہندو لوگ اس تیوہار میں اپنے گھروں کی صفائی کرتے ہیں۔ اسی طرح جب عید کا تیوہار آتا تو ہندو بچے بھی مسلم بچوں کی طرح نئے کپڑے پہنتے۔ ہندو گھروں میں شیرینی کا اہتمام کیا جاتا اور وہ اپنے مسلم پڑوسیوں کی تواضع کرکے خوش ہوتے۔

اس طرح مسلمانوں نے ہندو تیوہاروں میں اپنے لئے دلچسپی کا سامان پایا تھا اور ہندو، مسلمانوں کے تیوہاروں میں اپنی دلچسپی کا سامان پارہے تھے۔ دونوں فرقوں کے تیوہار ایک اعتبار سے ان کے اپنے فرقے کے تیوہار ہوتے تھے اور دوسرے اعتبار سے ان کی حیثیت مشترک تیوہار کی ہوتی تھی۔ اس دوسرے اعتبار سے دونوں گویا ایک دوسرے کے تیوہاروں کو مل جل کر مناتے تھے۔ اس طرح دونوں فرقوں میں رواداری کو فروغ ملتا تھا۔ دونوں بار بار ایک دوسرے سے قریب ہوتے رہتے تھے۔

اس چیز نے اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کامل ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کر رکھی تھی۔ دونوں میں کسی قسم کی اجنبیت حائل نہ تھی۔ دونوں اپنے آپ کو مسلم اور ہندو سمجھتے ہوئے وسیع تر ہندستانی قوم کا جزء بنے ہوئے تھے۔ دونوں اس عظیم ملک سے یکساں محبت کرتے تھے جس کا نام اب تاریخ میں برصغیر ہند (Indian sub-continent) لکھا جاتا ہے۔

یہی وہ دور ہے جس کی بابت سرسید نے اپنی ایک تقریر (۲۷ جنوری ۱۸۸۳) میں کہا تھا:

"ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے، جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں۔ ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا اور جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں۔ ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے میں، جینے میں دونوں کا ساتھ ہے۔ درحقیقت ہندستان میں ہم دونوں باعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی اور بہبودی ممکن ہے۔ اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت اور ایک دوسرے کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں۔"

پھر یہی وہ ہندستان ہے جس کا ترانہ اقبال نے اپنے اشعار میں گایا تھا۔ ان کا یہ شعر اس مشترکہ جذبہ کی بہترین عکاسی کرتا ہے جس کو ہندستان کے تقریباً ہر شخص نے سنا ہے اور بے شمار

لوگوں نے اس کو گایا ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اس طرح کے مشترک ماحول اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنے میں تیوہار نہایت اہم رول ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نفرت اور باہمی دوری کے قاتل ہیں۔ اگر تیوہاروں کو صحیح جذبہ کے ساتھ اور مشترک انداز میں منایا جائے تو ہمارے سماج سے ہر قسم کے جھگڑے اور فساد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

مجھے مدھیہ پردیش کے ایک صاحب نے بتایا۔ وہاں کے ایک قصبہ میں فرقہ وارانہ تناؤ کا ماحول تھا۔ ہولی کے تیوہار کا زمانہ آیا تو سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اس موقع پر فرقہ وارانہ فساد ہو کر رہے گا۔ ہولی کا رنگ انسانی خون کے رنگ میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس وقت ایک بزرگ ہندو، مسلمانوں کے علاقہ میں گئے۔ انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں اور آپ لوگوں کو ایک مشورہ دینے آیا ہوں جس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اگر آپ میرے اس مشورہ کو قبول کر لیں تو امید ہے کہ ہماری بستی بہت بڑی آفت سے بچ جائے گی۔

انھوں نے کہا کہ اس وقت ہماری بستی کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ مجھے بظاہر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات باقی رہے تو ہولی کے موقع پر ضرور فرقہ وارانہ فساد ہو جائے گا اور ہماری سڑکوں پر رنگ کے بجائے خون بہے گا۔ اس مسئلہ کے حل کی ایک نہایت آسان تدبیر ہے اور اس وقت میں آپ کو وہی تدبیر بتانے آیا ہوں۔

انھوں نے کہا کہ ہولی کے دن جب ہندو لڑکے ہولی کھیلتے ہوئے مسلمانوں کے محلہ کے پاس پہنچیں تو مسلمان اس سے الگ نہ رہیں۔ بلکہ مسلمان لڑکے بھی باہر نکل کر ان کی پارٹی میں شامل ہو جائیں اور ان کے ساتھ ہولی کھیلنا شروع کر دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر بالفرض آپ لوگوں کے کپڑوں میں ہولی کا رنگ لگنے کا کچھ عذاب ہو تو میں بھگوان سے کہتا ہوں کہ وہ اس کو میرے حصہ میں ڈال دے اور اس تدبیر سے فساد کے ٹلنے کا جو ثواب ہے وہ سب آپ لوگوں کے حصہ میں لکھ دیا جائے۔ یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آ گئی، چنانچہ انھوں نے ہولی کے موقع پر ایسا ہی کیا۔

ہولی کے دن حسب معمول ہندو نوجوانوں کی پارٹی مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر آئی۔ اس وقت، پہلے سے طے کئے ہوئے منصوبہ کے مطابق، کچھ تفریح پسند مسلم نوجوان اپنے گھروں سے نکلے اور جوش وخروش کے ساتھ ہندو پارٹی میں مل گئے۔ وہ اس وقت انھیں جیسے بن کر ان کے ساتھ ہولی کھیلنے لگے۔

ایسا کرنے کے بعد اچانک ساری فضا بدل گئی۔ جو دن دو دشمنوں کے ٹکراؤ کا دن بنتا وہ دو دوستوں کے ملاپ کا دن بن گیا۔ ہولی کا رنگ جو خون کے چھڑکاؤ کی صورت اختیار کرنے والا تھا، وہ پیار ومحبت میں بدل کر لوگوں کے اوپر گلاب جل کا چھڑکاؤ بن گیا۔

اسی طرح مہاراشٹر کے ایک شہر کا قصہ ہے۔ وہاں ہر سال ایک خاص تاریخ کو گن پتی کا جلوس نکلتا ہے جو گویا ان کا ایک سالانہ تیوہار ہے۔ ہندو اس میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی سال ایسا ہوا کہ جلوس جب مسلم محلہ سے گزرنے والی سڑک پر پہنچا تو کسی نہ کسی بات پر دونوں فرقوں میں اشتعال پیدا ہو گیا اور فساد کی نوبت آ گئی۔

پچھلے سال وہاں کے مسلمانوں نے مشورہ سے یہ طے کیا کہ وہ جلوس کے خلاف روک ٹوک نہیں کریں گے اور نہ اس کی روٹ بدلنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ جب جلوس آیا تو انھوں نے پچھلے سالوں کے برعکس جلوس کا استقبال اور اس کو راحت پہنچانے کی کوششیں کیں۔ مثلاً یہ گرمی کا موسم تھا۔ چنانچہ انھوں نے راستہ میں جگہ جگہ ٹھنڈے پانی کا انتظام کر دیا۔ وغیرہ

اس کا نتیجہ نہایت خوشگوار نکلا۔ دو فرقے جو اس سے پہلے ایک دوسرے کو حریف کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ ایک دوسرے کو دوست کی نظر سے دیکھنے لگے۔ جلوس کا قافلہ جو عام حالت میں دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے کا سبب بنتا، وہ دونوں کے درمیان دوستی اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

تیوہار کو اگر صحیح طریقہ سے منایا جائے تو بلاشبہ وہ رواداری اور اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ وہ پورے سماج کو مشترک انسانی رشتہ میں جوڑ کر صالح معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اور صالح معاشرہ سے پیدا ہونے والے نتیجہ ہی کا دوسرا نام یک جہتی ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۴ اپریل ۱۹۸۹ کو نشر کی گئی۔

تصوّف اور تہذیب نفس

تصوف کا گہرا تعلق تہذیب نفس سے ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ تصوف کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ انسان کو نفسیاتی اعتبار سے ایک مہذب انسان بنایا جائے۔

سیاست کا نشانہ ہمیشہ خارجی نظام ہوتا ہے۔ اہل سیاست اپنے اصلاحی نقشہ کو قائم کرنے کے لئے سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دیتے ہیں وہ خارجی سماجی ڈھانچہ کو توڑنا ہے۔ تصوف کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تصوف کا نشانہ ہمیشہ فرد ہوتا ہے۔ یعنی فرد کے اندر روحانی تبدیلی اور اخلاقی اصلاح پیدا کرنا۔ اس اعتبار سے تصوف گویا روحانی یا اخلاقی سائنس کا دوسرا نام ہے۔

اہل تصوف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فرد کو مادی رغبتوں سے اوپر اٹھائیں۔ وہ آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ مادی چیزوں سے زیادہ روحانی مقصد کو اہمیت دے۔ وہ اپنے وجود کے حیوانی عنصر کو دبائے اور اپنے وجود کے انسانی عنصر کو ترقی دے۔ وہ اپنے اندر یہ اخلاقی استعداد پیدا کرے کہ وہ زیادتی کے باوجود مشتعل نہ ہو۔ وہ نفرت کے جواب میں محبت کا سلوک کرے۔ وہ ہر حال میں اپنے کو ردعمل کی نفسیات سے بچائے اور دوست اور دشمن سب کے ساتھ یکساں طور پر مثبت رویہ پر قائم رہے۔

تصوف آدمی کے اندر مہربانی اور رحم دلی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر محبت اور تعفف کا مزاج بناتا ہے۔ تصوف کا مقصد انسان کو سطحی چیزوں سے اٹھانا اور اس کو اعلیٰ حقیقتوں میں جینے کے قابل بنانا ہے۔ جو آدمی اس قسم کی برتر زندگی حاصل کرلے وہ اس دنیا میں پھول کی طرح جینے لگتا ہے۔ اس سے ہر ایک کو خوش اخلاقی کا تجربہ ہوتا ہے۔ سماج کے اندر وہ ایک ایسا بے ضرر انسان بن جاتا ہے جس سے کسی آدمی کو اپنے لئے خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔

سچے اہل تصوّف دوسروں سے لینے کے بجائے دوسروں کو دینے والے ہوتے ہیں۔ وہ درخت کی مانند ہوتے ہیں جس سے لوگوں کو سایہ اور لکڑی اور سبزہ اور پھل اور پھول

ملتا ہے۔ مگر خود درخت لوگوں سے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ تصوف کے طریقہ کو اختیار کرنے کے بعد آدمی کو روحانی طور پر اتنا زیادہ مل جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو حسد کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ وہ دوسروں کے اثاثہ کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی چیزوں میں حصہ دار بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ میں جیتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ، اور اگر نفع نہ پہنچا سکو تو دوسروں کو نقصان بھی نہ پہنچاؤ۔

ایک تمثیلی قصہ تصوف کی اس حقیقت کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفی کا کردار کیا ہے اور صوفی اور غیر صوفی میں کیا فرق ہے۔

وہ قصہ اس طرح ہے کہ ایک صوفی بزرگ تھے۔ وہ اپنے مریدوں کے قافلہ کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ قافلہ نے درمیان میں ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں بہت سے درخت تھے۔ اگلی صبح کو بہت سے فاختہ غول کی صورت میں وہاں آگئے۔ اور اس درخت کے اوپر منڈلانے لگے جس کے نیچے بزرگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ فاختہ برابر کچھ بولیاں نکال رہے تھے جیسے کہ وہ کسی معاملہ کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں۔

بزرگ نے جب فاختہ کے غول کو اس حال میں دیکھا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے اس احتجاج کا سبب پوچھا۔ فاختہ کے لیڈر نے جواب دیا کہ آپ کے ایک مرید نے ہمارے ساتھ دھوکے کا معاملہ کیا ہے اور ہم اس کے خلاف آپ سے احتجاج کر رہے ہیں۔

اس نے کہا کہ ہم میں سے ایک کبوتر یہاں درخت پر پتیوں کے سایہ میں آرام کر رہا تھا کہ آپ کے ایک مرید نے اس کو غلیل کا نشانہ بنایا اور اس کو مار کر گرا دیا اور پھر اس کو ذبح کر ڈالا۔ بزرگ نے اپنے مذکورہ مرید کو بلایا اور اس سے فاختہ کی اس شکایت کے بارہ میں پوچھا۔ مرید نے جواب دیا کہ حضرت، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ان جانوروں کو تو خدا نے ہماری خوراک بنایا ہے۔ ان کو مارنا ہمارے لئے حلال ہے۔ پھر اگر میں نے ایک فاختہ کو مار کر ذبح کر ڈالا تو میں نے کون سا غلط کام کیا۔

بزرگ نے مرید کا یہ جواب فاختہ کے لیڈر تک پہنچایا۔ اس نے کہا کہ ہماری شکایت وہ نہیں ہے جو آپ اور آپ کے مرید سمجھ رہے ہیں۔ ہماری شکایت تو یہ ہے کہ آپ لوگوں نے صوفی

کا مذہب اختیار کیا اور آپ نے صوفی کے روپ میں آکر یہاں پڑاؤ ڈالا۔ مگر عملاً آپ نے شکاری والا کام کیا۔ آپ کو صوفی کے بھیس میں دیکھ کر ہم مطمئن ہوگئے تھے کہ آپ کے وجود سے ہم کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ شکاری کے روپ میں یہاں آتے تو ہم بھی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتے جیسا کہ ہم دوسروں سے کرتے ہیں۔

یہ تمثیلی قصہ تصوف اور صوفی کی حقیقت کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ صوفی ایک بے ضرر انسان ہوتا ہے۔ صوفی کی نظر دوسروں پر نہیں ہوتی بلکہ اپنے آپ پر ہوتی ہے۔ صوفی دوسروں کو دکھ دینا نہیں چاہتا۔ صوفی آخری حد تک دوسروں کے جذبات کا احترام کرتا ہے۔ اسی لئے ہندستان کے تمام بڑے بڑے صوفیاء ویجیٹیرین تھے۔ اور ان کی درگاہوں کا لنگر آج تک ویجیٹیرین ہی ہوتا ہے۔

تصوف مادی چیزوں کے مقابلہ میں روحانی حقیقتوں پر زور دیتا ہے۔ تصوف کا مقصد آدمی کے نفس کو نکھارنا ہے۔ تصوف آدمی کو روحانی اور اخلاقی انسان بناتا ہے۔ تصوف آدمی کے اندر یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ دشمن کو بھی دوست سمجھے۔ تصوف آدمی کے اندر منفی جذبات کو دباتا ہے اور اس کے مثبت جذبات کو ابھارتا ہے۔ تصوف آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے اور غیر کا فرق کئے بغیر ہر ایک کو اپنے سینہ سے لگا سکے۔

نوٹ : یہ تقریر ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے براڈکاسٹ کی گئی۔

رومی : ایک تعارف

مولانا جلال الدین رومی بہت بڑے صوفی تھے۔ وہ ۱۲۰۷ء میں بلخ (افغانستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۷۳ء میں ان کی وفات ہوئی۔ انھوں نے پہلے علوم ظاہری کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۲۴۴ میں قونیہ میں ان کی ملاقات ایک درویش شمس الدین تبریزی سے ہوئی۔ وہ ان کے ساتھ چند مہینے رہے۔ شمس الدین تبریزی کی صحبت نے مولانا روم میں زبردست روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کے بعد وہ شعر کی زبان میں اپنے احساسات کا اظہار کرنے لگے۔ انھوں نے وہ مجموعہ تیار کیا جو مولانا روم کی مثنوی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں تقریباً ۲۶ ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کہا جانے لگا کہ وہ فارسی زبان کا قرآن ہے:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

تصوف کی کتابوں میں مثنوی مولانا روم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا روم کی اس مثنوی کو مثنوی معنوی بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں عالم معنوی اور احوال باطن کے اسرار و معارف کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ تصوف اور روحانیت کے موضوع پر بہت سی مثنویاں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن جو مقبولیت مثنوی مولانا روم کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو حاصل نہ ہو سکی۔

مثنوی مولانا روم میں کثرت سے اخلاق اور روحانیت کی باتیں ہیں۔ تاہم مثنوی کے آغاز میں مولانا نے بانسری کی مثال سے جو مضمون بیان کیا ہے وہی گویا پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔

مولانا روم نے مثنوی کو بانسری سے شروع کیا ہے۔ بانسری کی مثال لے کر نہایت گہرے مضامین بیان کئے ہیں۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بانسری کے ذریعہ انھوں نے معرفت کے جو مضامین بیان کئے ہیں وہ کسی اور ساز کی مثال سے نکالے نہیں جا سکتے تھے۔

ہندو مذہب میں خاص طور پر بانسری کا تعلق روحانیت کے ساتھ مانا گیا ہے۔ کرشن جی کی

تصویروں میں بانسری کا شامل ہونا اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ مولانا روم نے بانسری کی تشبیہ کو خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اس کے ذریعہ انھوں نے روح کی ماہیت اور اس کی حقیقت کو موثر انداز میں نظم کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی مولانا روم اس شعر سے شروع ہوتی ہے کہ بانسری کو سنو کہ وہ کیا بیان کرتی ہے۔ وہ جدائی کے اوپر نالہ کر رہی ہے :

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی ہا شکایت می کند

مولانا روم نے اس میں بتایا ہے کہ بانسری سے جو دل سوز نغمے نکلتے ہیں وہ اس لئے ہیں کہ وہ اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے۔ بانسری سے نکلنے والی آواز کا درد و سوز اس بنا پر ہے کہ وہ اپنے نیستاں سے کاٹ کر الگ کر دی گئی ہے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسانی روح دراصل روح الارواح یا ہستی مطلق سے جدا ہو کر اس موجودہ دنیا میں آئی ہے جس کو عالم شہود کہا جاتا ہے، اسی علیحدگی کی بنا پر وہ مسلسل اضطراب اور بے چینی میں رہتی ہے۔ روح کی یہ حالت چوں کہ اپنی اصل سے جدائی کی بنا پر ہے، اس لئے جب تک وہ اپنی اصل کی طرف واپس نہ ہو جائے اس کو سکون حاصل نہ ہوگا۔ ان کے نزدیک یہی مطلب ہے اس آیت قرآنی کا کہ : اے نفس مطمئن ، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی ، وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں (الفجر)

مولانا روم کا یہ فلسفہ وحدت الوجود کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ اکثر صوفیا روحدت الوجود کو بطور حقیقت مانتے ہیں۔ مگر اکثر علما نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

اہل ظاہر کے یہاں لاالٰہ الّا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انسان عبد اور مخلوق ہے اور اس کو چاہئے کہ اسی ایک معبود کو مانے اور اسی کی عبادت کرے۔ مگر صوفیا کا کہنا ہے کہ لاالٰہ الّا اللہ کا مطلب ہے لاموجود الّا اللہ۔ یعنی عالم کون میں صرف ایک ذات واحد کا وجود ہے ، کسی دوسری چیز کا حقیقی وجود نہیں۔ ان کے نزدیک بقیہ چیزیں جو اس کائنات میں ہیں وہ اسی وجود حقیقی کے مختلف مظاہر ہیں جو بظاہر الگ نظر آتے ہیں مگر وہ اس سے الگ نہیں۔ انسان بھی اسی ایک وجود اصلی کا جز ہے۔ اس کا الگ ہونا ہی اس کا مسئلہ ہے۔

جس دن وہ مٹ کر ذات حقیقی میں ضم ہو جائے گا اس کا مسئلہ بھی ختم ہو جائے گا ـــــ یہی مختصر طور پر مولانا روم کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔

نوٹ : یہ تقریر ۱۷ جون ۱۹۹۲ کو آل انڈیا ریڈیو (نیشنل چینل) سے نشر کی گئی۔

فرقہ واریت کا مسئلہ

فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل اتنا ہی آسان ہے جتنا خاندانی مسئلہ کا حل آسان ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر خاندان یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ اسی طرح مختلف فرقے بھی یک جہتی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ خاندان کے مختلف افراد جس اصول کے تحت باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسی طــرح ملک کے مختلف فرقے بھی باہم مل کر رہنا سیکھ جائیں۔ جو اصول آج بھی خاندان کی اجتماعی زندگی میں عملاً رائج ہے اسی اصول کو خاندان سے باہر کی اجتماعی زندگی میں بھی رائج کر دیا جائے۔ یہی کامیابی کا واحد راستہ ہے، خاندان کے اندر بھی اور خاندان کے باہر بھی۔

فرقہ وارانہ مسئلہ بڑے پیمانہ پر عین اسی چیز کا نام ہے جس کو چھوٹے پیمانہ پر خاندانی مسئلہ کہا جاتا ہے۔ خاندانی مسائل مختلف رشتہ داروں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں اور فرقہ وارانہ مسائل مختلف فرقوں کے درمیان۔ گھر ایک چھوٹا خاندان ہے اور ملک اس کے مقابلہ میں بڑا خاندان۔ ایک اور دوسرے میں جو فرق ہے وہ صرف ڈگری کا فرق ہے ورنہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ خاندان کے اندر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ایک رشتہ دار اور دوسرے رشتہ دار کے درمیان ناخوش گواریاں ظہور میں آتی ہیں۔ ایک کو دوسرے سے قولی یا عملی تکلیف پہونچتی ہے۔ اس کے باوجود کوئی چیز ہے جو خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑے رکھتی ہے اور ان کو منتشر ہونے سے بچاتی ہے۔ خاندانی اتحاد اور یک جہتی کا جو راز ہے وہی قومی اتحاد اور یک جہتی کا راز بھی ہے۔ ہر شخص کو اپنے خاندان کی سطح پر جو تجربہ پیش آرہا ہے اسی تجربہ کے بہترین سبق کو وہ ملکی افراد کے معاملہ میں استعمال کرے اور پھر کبھی فساد نہیں ہوگا۔

ہر عقل مند آدمی جانتا ہے کہ خاندانی مسائل کا سادہ حل یہ ہے کہ خاندان کے اندر ایک دوسرے کا لحاظ کرنے کی فضا پائی جائے۔ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آدمی مشتعل نہ ہو بلکہ اس پر ٹھنڈے طریقہ سے غور کرے۔ وہ مسئلہ کو الجھانے کے بجائے سلجھانا چاہے۔ وہ مسئلہ کو تعلقات کا خاتمہ نہ سمجھے بلکہ درمیانی مدت کا ایک وقتی واقعہ سمجھ کر اس سے گزر جائے۔

یہ ذہن خاندان کے افراد کے اندر برداشت کامزاج پیدا کرتا ہے۔ اور برداشت تمام اختلافات کا واحد یقینی حل ہے۔ ایک دانش مند باپ جو ایک خاندان کا سربراہ ہو، وہ اپنے گھر والوں کو ہمیشہ یہ سبق دیتا ہے کہ تم لوگ ایک دوسرے کا احترام کرو۔ تم ایک دوسرے کے کام آنے کی کوشش کرو۔ ایک آدمی صرف اپنے حقوق کو یاد نہ رکھے بلکہ وہ اپنے فرائض کو بھی پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کرے۔ خاندان کے کسی فرد سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو دوسرے لوگ اسے سنبھالیں اوراس سے درگذر کریں۔

یہی خاندانی یک جہتی کا راز ہے اور یہی قومی یک جہتی کا راز بھی۔ تمام فرقہ وارانہ جھگڑے صرف اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے خاندان کی سطح پر زندگی کا جو راز سیکھا تھا اس کو انہوں نے فرقہ وارانہ معاملہ میں استعمال نہیں کیا۔

فرقہ وارانہ جھگڑوں کی واحد وجہ یہ ہے کہ لوگ گھر کے معاملات میں جتنے سنجیدہ ہیں، وہ گھر کے باہر کے معاملات میں اتنے سنجیدہ نہیں۔ گھر کے اندر ہر روز ناموافق باتیں پیش آتی ہیں اور ہر آدمی ان کو برداشت کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا گھر اجڑ جائے گا۔ مگر اسی قسم کا ایک ناخوش گوار معاملہ گھر کے باہر پیش آجائے تو لوگ فوراً بگڑ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سے اس دوعملی کو ختم کردیا جائے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک صاحب تھے۔ وہ اپنے رشتہ داروں کو ہمیشہ ایک شعر سنایا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بس یہ ایک شعر پکڑ لو اور اس کے بعد تمہارے تمام گھریلو مسائل اپنے آپ ختم ہوجائیں گے۔ وہ شعر یہ تھا :

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا　　کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

اس شعر میں ایک حدیث کے مفہوم کو منظوم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بلاشبہ یہ کامیاب اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ اگر لوگ اس ایک ہدایت کو پکڑ لیں تو ان کے تمام مسائل حل ہوجائیں، خواہ وہ گھر کے اندر کے مسائل ہوں یا گھر کے باہر کے مسائل۔

مسٹر الف اور مسٹر ب دونوں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ مسٹر الف کے لڑکے نے مسٹر ب کے لڑکے کے ساتھ ایک نازیبا حرکت کی اور اس کو غصہ دلادیا۔ اس کے جواب میں مسٹر ب کے لڑکے

نے مسٹر الف کے لڑکے کو مارا۔ اب مسٹر الف باہر آئے اور مسٹر ب کے گھر والوں کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین شروع کر دی ۔ انھوں نے اپنے لڑکے کو کچھ نہیں کہا۔ پوری ذمہ داری مسٹر ب کے لڑکے پر ڈالتے ہوئے یک طرفہ طور پر مسٹر ب کو انسانیت کے ساتھ رہنے کی تلقین کرتے رہے ۔

مسٹر الف کے وعظ کو اگر پس منظر سے الگ کرکے دیکھا جائے تو وہ ایک درست بات معلوم ہوگی۔ لیکن اگر اس کو پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو وہ سراسر ایک غلط بات ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اپنے لڑکے کو کچھ نہ کہنا اس کی نازیبا حرکتوں پر اس کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ یہ دوسرے کے لڑکے کے لیے اگر پیامِ انسانیت ہے تو اپنے لڑکے کے لیے پیامِ شرارت ۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو اپنے اور غیر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے آدمی کی غلطی ہو تو اس کو گھٹاتے ہیں ، اور اپنے سے باہر کا آدمی غلطی کر دے تو اس کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ بس یہی دو عملی سارے فساد کی جڑ ہے ۔ اگر لوگوں کے اندر یہ مزاج آجائے کہ وہ معاملات کو انصاف کی نظر سے دیکھیں۔ وہ اپنوں کے معاملہ میں نرمی کا جو طریقہ اختیار کرتے ہیں ، وہی نرم طریقہ غیروں کے معاملہ میں بھی اختیار کریں تو کبھی کوئی جھگڑا نہ ہو۔ اس کے بعد تمام شر و فساد اپنے آپ ختم ہو جائے ۔

حال میں میری ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو تیس سال سے تجارت کرتے ہیں۔ اور آجکل جدہ میں ہیں۔ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے زندگی کا بہت تجربہ اٹھایا ہے اور بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے ۔ یہ بتائیے کہ لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا راز کیا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ اس کا راز وہی ہے جس کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ یعنی ناموافق باتوں سے ٹکرانے کے بجائے ان کو نظر انداز کرنا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہمیشہ ٹکراؤ کے موقع پر یک طرفہ طور پر پیچھے ہٹنے کے لیے تیار رہتا ہوں ۔ اس لیے میرا راستہ کبھی کھوٹا نہیں ہوتا۔ میرے لیے کوئی رکاوٹ رکاوٹ ثابت نہیں ہوتی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے بہت سے واقعات بتائے۔

مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک شخص کسی بات پر مجھ سے بگڑ گیا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور مجھ کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔ اس نے مجھے زبردست دھمکیاں دیں۔ میں خاموش سنتا رہا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ تم کو جو کرنا ہو کرو۔ مگر جان لو کہ میرے پاس بھی ایک حربہ ہے۔ اس نے

غصہ کے ساتھ پوچھا کہ وہ کیا حربہ ہے۔ میں نے کہا کہ تم جتنا زیادہ مجھے گالیاں دوگے میں اتنا ہی زیادہ تم کو دعائیں دوں گا۔ تم جتنا زیادہ مجھ کو دباؤگے میں اتنا ہی زیادہ جھکتا چلاؤں گا۔ میری یہ بات سن کر اس کا سارا جوش ختم ہوگیا۔ وہ چپ چاپ واپس چلا گیا اور پھر کبھی میرے خلاف کوئی بات نہیں کی۔

انھوں نے مزید کہا کہ اس پالیسی کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہے کہ میں غیر ضروری نقصانات سے بچ جاتا ہوں۔ اس کا مزید فائدہ یہ ہے کہ میرے اندر بے پناہ جرأت آگئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسروں سے نفرت آدمی کو بزدل بناتی ہے۔ اور دوسروں سے محبت آدمی کو بہادر بنادیتی ہے۔ اور بلاشبہ یہ نہایت سچی بات ہے۔

ہندستان کے حالات میں فرقہ وارانہ مسئلہ کی سب سے بڑی نفسیاتی وجہ شک وشبہہ ہے۔ مختلف تاریخی اسباب سے یہاں ایک دوسرے کے خلاف غیر ضروری قسم کے شبہات کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ ان شبہات کو پھاڑ کر باہر آجائیے اور پھر تمام فرقہ وارانہ مسائل آپ کو فضا میں تحلیل ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ایک مرتبہ میں ہوائی جہاز سے یورپ کے ایک مقام کا سفر کر رہا تھا۔ ہوائی اڈہ پر پہونچا تو اس قدر کہر چھایا ہوا تھا کہ سورج دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کہر کی حالت میں ہمارا جہاز اوپر بلند ہوا۔ کچھ دیر تک تو چاروں طرف اندھیرے کی وہی کیفیت رہی جو ہوائی اڈہ پر نظر آرہی تھی۔ مگر جب جہاز اپنی پوری بلندی پر پہونچ گیا تو میں نے جہاز کی کھڑکی سے دیکھا کہ سورج کی روشنی پورے آب وتاب کے ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ شبہات کا ہے۔ ہم اکثر شبہات کے کہر میں گھر کر سوچتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ شبہات کا دائرہ ایک مصنوعی اور محدود دائرہ ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی کوشش کرکے اس دائرہ کے باہر آجائیں تو ہر طرف ہم کو یقین اور اطمینان کا سورج چمکتا ہوا نظر آنے لگے گا۔

مجھے ایک شہر کا حال معلوم ہے۔ وہاں ہر سال ایک فرقہ کا جلوس نکلتا ہے جو دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ سے گزرتا ہے۔ عبادت گاہ کے پاس پہونچ کر جلوس چھ گھنٹہ اور آٹھ گھنٹہ تک رکا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبادت گاہ کے لوگ روک ٹوک کرتے اور یہ کہتے کہ جلوس

کو دوسرے راستے سے لے جاؤ۔ اس طرح بات بڑھتی اور ضد کی فضا پیدا ہو جاتی، یہاں تک کہ فساد ہو جاتا۔ پچھلے سال عبادت گاہ کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ جلوس کے خلاف کوئی روک ٹوک نہ کریں گے۔ چنانچہ جلوس حسب سابق آیا تو وہاں دوسرے فرقہ کا کوئی آدمی اسے روکنے کے لیے موجود نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس صرف آدھ گھنٹہ میں گزر گیا اور کسی قسم کا کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ ضد کے جواب میں ہمیشہ ضد پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ضد نہ کریں تو دوسرے کی ضد اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اسی طرح میں ایک شہر کے بارے میں جانتا ہوں جہاں دو مسجدیں ہیں۔ اور دونوں بہت پہلے سے آثارِ قدیمہ کے قبضہ میں تھیں۔ ان میں سے ایک مسجد بہت چھوٹی مسجد ہے اور دوسری مسجد اس کے مقابلہ میں دس گنا زیادہ بڑی ہے۔ بڑی مسجد پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جب کہ چھوٹی مسجد پر ابھی تک جھگڑا چل رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی مسجد کو کچھ موقع پرست لیڈروں نے جلسہ جلوس کا مسئلہ بنا دیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ دونوں فرقوں کے لیے ساکھ کا مسئلہ بن گیا اور اس کی بازیابی کی راہ میں سیاسی نزاکتیں پیدا ہو گئیں۔

اس کے برعکس بڑی مسجد کا معاملہ لیڈروں تک نہیں پہونچا۔ وہ مقامی طور پر غیر معروف مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا جنھوں نے اس کی بازیابی کے لیے انفرادی سطح پر کوششیں کیں۔ یہ کوشش چونکہ غیر سیاسی انداز میں تھی، اس میں انھیں دوسرے فرقہ کا تعاون بھی حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ مسجد اور اس سے ملحق وسیع زمین مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی۔ میں نے خود جا کر اس مسجد اور اس کے علاقہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہاں اب مسجد اور مدرسہ قائم ہے۔ بجلی اور ٹیلی فون بھی لگ گیے ہیں۔ لوگ سکون کے ساتھ دینی اور تعلیمی کام میں مشغول ہیں۔

اختلافی معاملہ کو جلسہ جلوس کا مسئلہ بنانا اس کی نزاکت کو بڑھاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خاموشی کے ساتھ اس کے حل کی تدبیریں کی جائیں تو مسئلہ کے حل کی راہیں نکل آتی ہیں۔

اسی طرح مجھے ایک قصبہ کے بارے میں معلوم ہے۔ وہاں مسلمان ایک مسجد اور مدرسہ بنا رہے تھے۔ بنیاد کھودی جانے لگی تو دوسرے فرقہ کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے کہا کہ ہم یہاں سے دیوار نہیں اٹھنے دیں گے۔ آپ دو گز پیچھے لے جا کر اپنی دیوار اٹھائیے۔ مدرسہ کے ذمہ دار فوراً راضی

ہوگیے اور کام کو روک دیا۔ اگلے دن اس فرقہ کے بڑے لوگ ان کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے بعض نادانوں نے آپ کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی تھی۔ ہم نے انھیں سمجھادیا ہے۔ آپ پہلے جہاں دیوار اٹھارہے تھے دوبارہ وہیں سے اپنی دیوار اٹھائیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ نادانی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کو دانش مندی کے ذریعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا بھی ہے۔ فرقہ وارانہ جھگڑوں کے پیچھے ہمیشہ کچھ نادانوں کی نادانیاں شامل رہتی ہیں۔ اگر دوسرے لوگ آگے بڑھ کر دانش مندی کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر ہر جھگڑا اپنے آغاز ہی میں ختم ہوجائے گا۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو، بمبئی سے ۱۲ اپریل ۱۹۸۷ کو نشر کی گئی۔

علم دار کشمیر

شیخ نورالدین نورانی ایک کشمیری صوفی تھے۔ کشمیر کے لوگوں میں عام طور پر وہ علم دار کشمیر کے نام سے مشہور تھے۔ ہندو لوگ انھیں پیار سے نند رشی کہتے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔ قصبہ چرار شریف (کشمیر) میں ان کی درگاہ تھی جو کہ سرینگر سے ۲۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ درگاہ ۱۱ مئی ۱۹۹۵ کو ایک بھیانک آگ سے جل کر راکھ ہو گئی۔

شیخ نورالدین نورانی فیروز شاہ تغلق کے ہم عصر تھے۔ وہ ۱۳۷۷ء میں کشمیر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۴۳۹ء میں چرار کے مقام پر ان کی وفات ہوئی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کے اس وقت کے حاکم زین العابدین نے شیخ نورانی کی قبر کی جگہ پر ایک بڑا مقبرہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی میں پٹھانوں کی حکومت کے زمانہ میں اس درگاہ کی مزید توسیع ہوئی اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی۔

چرار شریف کی اس درگاہ میں شیخ نورالدین نورانی کی قبر کے ساتھ گیارہ اور صوفیوں کی قبریں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی مقدس تاریخی یادگاریں وہاں رکھی ہوئی تھیں۔ مثلاً حضرت فاطمہ کے تبرکات، وغیرہ جو آگ کی نذر ہو گئے۔

افغانی گورنر عطا محمد خاں ان سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اپنی عقیدت کے اظہار کے طور پر انیسویں صدی کے آغاز (۱۸۱۰ - ۱۸۰۸) میں شیخ نورالدین نورانی کے نام کا سکہ جاری کیا تھا۔ اس افغانی گورنر نے درگاہ کی مزید توسیع کر کے اس میں مسجد کا اضافہ کیا تھا۔

کشمیر کے مشہور بزرگ حضرت امیر کبیر علی ہمدانی اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے کشمیر میں ایک روحانی بیداری آگئی تھی۔ اس زمانہ میں مقامی صوفیوں اور بزرگوں کا ایک پورا گروہ پیدا ہو گیا۔ ان لوگوں کو عام طور پر بابا یا رشی کہا جاتا تھا۔

یہ مسلمان رشی نہایت سادہ زندگی گزارتے تھے۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان مسلمان رشیوں میں سب سے زیادہ شہرت شیخ نورالدین نورانی نے پائی۔ ہندوؤں میں بھی وہ اتنا ہی مقبول و محبوب تھے جتنا کہ مسلمانوں میں۔ (آب کوثر

از شیخ محمد اکرام، صفحہ ۳۸۱)

بابا داؤد خاکی جو ایک صوفی شاعر تھے انھوں نے شیخ نور الدین نورانی کی تعریف میں ایک فارسی نظم کہی ہے۔ اس نظم کے تین شعر یہ ہیں :

شیخ نور الدین ریشی، پیر جمع ریشیاں　　زاہدے خوش بود باحق داشت بسیار اشتغال
بود با تجرید و تفرید اہل صوم د ہر نیز　　تارک لحم و بصل، شیر و عسل، بسیار سال
صاحب کشف و کرامت بود و نطق خوب داشت　　ہم اویسی بود گفت ایں داؤد ی صاحب مقال

ترجمہ : شیخ نور الدین رشی تمام رشیوں کے پیر تھے۔ وہ ایک اچھے زاہد تھے۔ وہ سچے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ انھوں نے تجرد کی زندگی بسر کی۔ وہ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ گوشت، پیاز دودھ، شہد کو انھوں نے سالوں تک چھوڑے رکھا۔ وہ کشف وکرامات والے تھے۔ ان کا کلام بہترین کلام ہوتا تھا۔ داؤد خاکی کا کہنا ہے کہ وہ اویسی سلسلہ کے ایک صوفی تھے۔

شیخ نور الدین نورانی کی ابتدائی زندگی مصیبتوں میں گزری۔ وہ دنیا والوں کی حالت دیکھ کر غمگین رہتے تھے، آخر کار انھوں نے بستی کو چھوڑ دیا۔ اور وہ پہاڑ میں جاکر تنہا ایک غار میں رہنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ۱۲ سال تک اسی غار میں مراقبہ کرتے رہے۔ اس دوران انھوں نے گھاس تک کھائی۔ یہ غار اب تک وہاں موجود ہے۔ اور دس فٹ گہرا ہے۔ آخر عمر میں ان کا حال یہ تھا کہ وہ روزانہ صرف ایک پیالہ دودھ پر گزارہ کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں وہ بہت کمزور اور لاغر ہو گئے۔ اور صرف ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ یہ سلطان زین العابدین کا زمانہ تھا۔

ایک کتاب ہے جس کا نام نور نامہ ہے۔ اس کتاب میں شیخ نور الدین نورانی کے صوفیانہ اقوال جمع کئے گئے تھے۔ اس کتاب کو بابا نصیب الدین غازی نے فارسی زبان میں مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب شیخ نورانی کے انتقال کے دو سو سال بعد تیار کی گئی تھی۔

چرار شریف میں شیخ نور الدین نورانی کی درگاہ کا طرز تعمیر بالکل بدھوں کے پگوڈا جیسا تھا یہ عمارتی اسٹائل گویا اس بات کی علامت تھا کہ شیخ نور الدین نورانی کٹرپن سے بہت دور تھے۔ وہ صلح کل کی پالیسی کو پسند کرتے تھے۔

شہنشاہ جہانگیران کا معتقد تھا۔ اس نے شیخ نورالدین نورانی اور ان کے پیروؤں کے بارہ میں کہا تھا کہ یہ رشی نہ کسی کو برا کہتے اور نہ کسی سے کوئی چیز مانگتے۔ یہ دو لفظ میں شیخ نورالدین نورانی اور ان کے ماننے والوں کی نہایت صحیح اور جامع تصویر ہے۔

شیخ نورالدین نورانی سچی کشمیریت کی علامت تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ" اگر تو دانش مند ہے تو ہندو اور مسلمان کو الگ الگ انسان نہ سمجھ ، یہی خدا سے ملنے کا واحد راستہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ ان کا کلام کشمیر کے ایک شاعر نے رشی نامہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نورالدین نورانی کے نزدیک انسان کی ایک ہی پہچان تھی۔ یہ کہ انسان انسان سے پیار کرے۔ ان کے نزدیک انسان سے پیار ہی خدا کی پہچان کا حقیقی راستہ ہے

شیخ نورالدین نورانی ایک صوفی بزرگ تھے۔ وہ روحانیت اور انسانیت اور پیار کو سب سے ذیادہ اہم سمجھتے تھے۔ کسی کا دل دکھانا یا کسی کو نقصان پہنچانا ان کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا۔ وہ انسان کی زندگی میں فطرت کا حسن دیکھنا چاہتے تھے۔

شیخ نورالدین نورانی کے قیمتی اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ : میں نے تلوار توڑ دی اور اس سے درانتی بنالی۔ یہ شیخ نورانی کے فکر کا خلاصہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے لوہا بنایا جس میں خصوصی طاقت ہے۔ مگر لوہا اس لئے نہیں ہے کہ آپ اس کو تشدد کے لئے استعمال کریں۔ بلکہ آپ کو چاہئے کہ لوہے کو تعمیر انسانیت کے لئے استعمال کریں۔ آپ لوہے سے تلوار کے بجائے درانتی بنائیں جو زراعت کے کام آتی ہے۔

اسی طرح انھوں نے کہا کہ جنگل ہوں گے تو اناج ہوگا۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جنگل سے بارش ہوگی اور بارش سے کھیتوں میں فصل اُگے گی۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس دنیا میں ایک کو دوسرے کے ساتھ تعاون کا معاملہ کرنا ہے۔ باہمی تعاون کے بغیر اس دنیا میں کوئی تعمیری نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

شیخ نورالدین نورانی کے اقوال کشمیری زبان میں ہیں۔ یہ اقوال انسانیت اور روحانیت کی اسپرٹ سے بھرپور ہیں۔ کچھ مزید اقوال کا ترجمہ یہ ہے :

کام، کرودھ، لوبھ، موہ اور اہنکار یہ سب انسان کو دوزخ میں بھیجنے کے لئے کافی ہیں۔

اپنے جسم کا سنگار کرنے سے من کا میل نہیں ہٹتا۔

ایک ہی ماں باپ کے بیٹے ہیں، ان کو خدا کا دامن تھامنا چاہئے، کیا مسلمان اور کیا ہندو۔ اللہ کی رحمت دونوں کے لئے برابر ہے۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۵ مئی ۱۹۹۵ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

برداشت کا اصول

ایک ہندستانی کہاوت ہے ـــــ "اگر کوئی کتا تمھیں کاٹے تو کیا تم بھی کتے کو کاٹو گے" اس چھوٹے سے جملہ میں زندگی کی بڑی گہری حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں انسان کے ساتھ "کتے" بھی ہیں۔ اس لئے یہاں یہ واقعہ بھی ضرور پیش آئے گا کہ کبھی کوئی کتا انسان کو کاٹ لے۔ مگر اس کا جواب یہ نہیں ہے کہ آدمی خود بھی کتے کو کاٹنے لگے۔ کیونکہ یہ نہ صرف مسئلہ کو بڑھانا ہے بلکہ اپنے آپ کو کتے کی سطح پر لے جانا ہے۔ اس لئے بہترین بات یہ ہے کہ جب کسی کے ساتھ یہ حادثہ پیش آئے کہ اس کو ایک کتا کاٹ کھائے تو وہ اس کو نظرانداز کرکے آگے بڑھ جائے۔ اپنے زخم کا علاج کرکے اپنی زندگی کے سفر کو جاری رکھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام دانش مند لوگوں نے غصہ، دشمنی اور انتقام جیسی چیزوں کو برا کہا ہے اور اس کے بجائے معاف کرنے اور بھلا دینے کو زندگی کی ترقی کا راز بتایا ہے۔ یہاں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں۔

بدلہ لینے سے انسان اپنے دشمن جیسا ہو جاتا ہے اور بدلہ نہ لینے سے اس سے بہت زیادہ بہتر	بیکن
اپنے دشمن کے لئے اپنی بھٹی کو اتنا گرم نہ کر کہ وہ تجھ کو ہی جلا ڈالے	شیکسپیر
دشمن کو معاف کر دینا دشمن سے انتقام لینے کا سب سے بہتر طریقہ ہے	مانس ہنس
ہم خود اپنا برا کئے بغیر دوسروں کا برا نہیں کر سکتے	ولیس جہس
برداشت کرنا زندگی کا ایک اصول ہے نہ کہ کمزوری	مہاتما گاندھی
جب دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو سمجھ لو کہ دونوں غلطی پر ہیں	ڈچ کہاوت
کسی سے دشمنی کرنا اپنے ارتقا میں روک لگانا ہے	ونوبا بھاوے
دشمن کا لوہا بھلے ہی گرم ہو جائے مگر ہتھوڑا تو ٹھنڈا رہ کر ہی کام دے سکتا ہے	سردار پٹیل
نفسانی خواہشات کا جنون تھوڑی دیر رہتا ہے مگر اس کا پچھتاوا بہت دیر تک	شیلر
جس نے کسی دشمن کو معاف نہیں کیا وہ زندگی کی ایک عظیم خوشی سے محروم رہا	لیومیٹر
جہاں غصہ ہے سمجھ لو کہ وہاں تباہی بھی ضرور ہوگی	گوسوامی تلسی داس
اچھے مزاج کی بہترین علامت ہے برے مزاج کو برداشت کر لینا	ایمرسن

ان اقوال میں سے ایک ایک قول زندگی کی گہری حقیقت کو بیان کر رہا ہے۔ پہلی بات یہ کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی باتوں پر دشمن کو معاف کرنا کمزوری نہیں بلکہ بہادری ہے۔ یہ ایک مثبت عمل ہے۔ جو شخص ہیجانی واقعات پیش آنے کے باوجود لوگوں کو معاف کر دے وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا آدمی ہے۔ اور اپنے آپ پر قابو رکھنے سے بڑی کوئی بہادری نہیں۔

پھر یہ کہ انتقام نہ لینا خود بہت بڑا انتقام ہے، جب کسی کی طرف سے برائی پیش آنے کے باوجود آدمی اس کے

خلاف کوئی بری کارروائی نہیں کرتا تو اس کا یہ عمل بے شمار پہلوؤں سے اس کے لئے مفید بنتا ہے۔ اس کو برتر کردار پیش کرنے کی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مسئلہ کو لمبا کرنے کے بجائے وہ وہیں کا وہیں اسے ختم کر دیتا ہے۔ وہ اپنے وقت اور قوت کو منفی کارروائیوں سے بچا کر اپنی ترقی اور استحکام میں لگاتا ہے، دوسری طرف ایسا کر کے وہ اپنے مخالف کو اس کے اپنے ضمیر کے سامنے رسوا کر دیتا ہے۔ وہ اس کی دشمنانہ نفسیات کو دباتا ہے اور اس کے اندر چھپی ہوئی انسانیت کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔ آپ کے ہر "دشمن" انسان کے اندر آپ کا ایک "دوست" انسان بھی چھپا ہوا ہے۔ اور دشمن کو معاف کرنا دراصل اس بات کی کوشش کرنا ہے کہ اس کے اندر چھپا ہوا آپ کا دوست انسان برآمد ہو جائے۔

ایک آدمی آپ کے ساتھ برائی کرے اور آپ بھی اس کے ساتھ برائی کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اور وہ دونوں برابر ہو گئے۔ آپ اس سے اچھے جب ہوتے جب کہ آپ برائی کا بدلہ اچھائی سے دیتے۔ جب آپ نے بھی وہی کیا جو دوسرے نے آپ کے ساتھ کیا تھا تو آپ میں اور دوسرے میں فرق کیا رہا۔

زبان پر قابو

ٹامس فلر (۱۶۶۱-۱۶۰۸) ایک انگریز مصنف گزرا ہے۔ اس کا قول ہے "پرندے اپنے پاؤں کے باعث جال میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے باعث"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سماجی زندگی میں اکثر مصیبتوں کی وجہ آدمی کی زبان ہوتی ہے۔ زبان کی بے احتیاطی گھر کے اندر اور گھر کے باہر آدمی کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ آدمی اگر زبان کو قابو میں رکھے یا کم از کم ایسا کرے کہ نازک مواقع پر چپ رہے تو یقینی طور پر وہ بہت سی ناخوش گوار چیزوں سے بچ سکتا ہے۔ تمام مصلحین اور مفکرین نے زبان کے محتاط استعمال پر زور دیا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں:

بری بات پر تم بھلی بات کے ذریعہ زیادہ آسانی کے ساتھ فتح پا سکتے ہو	گوتم بدھ
تلوار کے وار کی نسبت زبان کا وار زیادہ گہرا ہوتا ہے	ہندی کہاوت
خدا سے ڈرنے والے کی زبان گونگی ہو جاتی ہے	فضیل بن عیاض
زبان ہم کو اس لئے دی گئی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے خوش گوار باتیں کریں نہ کہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچائیں	گوتم بدھ
بیوقوف آدمی کا دل منہ میں ہوتا ہے اور عقل مند آدمی کی زبان دل میں	شیکسپیئر
خالی دماغ اور قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان ایک دوسرے کے قریبی دوست ہیں	اوڈن
پیروں کی لغزش کے بعد سنبھلا جا سکتا ہے مگر زبان کی لغزش کے بعد سنبھلنا ممکن نہیں	فرینکلن
جاہل کی زبان اس کی مالک ہوتی ہے اور عقل مند کی زبان اس کی خادم	عربی کہاوت
دشمن بھی اچھی بات کہے تو اس کو قبول کرنے میں تامل نہ کرو	سوامی شیدانند
جو شخص ناپسندیدہ بات کہے گا وہ ناپسندیدہ بات سنے گا	عربی کہاوت

بات کو دیر تک سوچو پھر اس کو منھ سے نکالو، تم کبھی شرمندہ نہ ہوگے — افلاطون

اگر آدمی کے پاس اچھے بول ہوں تو وہ اچھی صورت نہ ہونے کے باوجود لوگوں کو اچھا معلوم ہوگا — سویٹ نارڈین

بولنے کی طاقت جو انسان کو حاصل ہے وہ بڑی انوکھی طاقت ہے۔ ساری معلوم کائنات میں کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں دو گونگے آدمی اگر باہم ملیں تو ان کا ملنا کس قدر بے معنی ہوتا ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہے جس نے کبھی دو گونگوں کو ملتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر جب دو بولنے والے آدمی ملتے ہیں تو ان کا ملنا حد درجہ بامعنی بن جاتا ہے۔ اس وقت زبان ہی وہ چیز ہوتی ہے جس سے دونوں اپنے آپ کو ایک دوسرے سے قریب کرتے ہیں۔ دو ملنے والے جب سنجیدگی اور مٹھاس کے ساتھ باتیں کریں تو اس سے زیادہ حسین منظر اس زمین پر کوئی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جب دو آدمی تلخ کلامی پر اتر آئیں تو وہ اتنا زیادہ برا منظر ہوتا ہے کہ خود بولنے والے اگر اپنی اس وقت کی تصویر دیکھ لیں تو اپنی اس حرکت پر نفرت کرنے لگیں۔

نادان آدمی خیال کرتا ہے کہ بھلی بات بولنے پر لوگ اس کو کمزور سمجھیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی بری بات سن کر اپنے کو تھامتا ہے اور اس کے جواب میں اپنی زبان سے بھلی بات نکالتا ہے تو وہ اپنی غیر معمولی طاقت کا ثبوت دیتا ہے، وہ اپنے اس بڑا اعتماد مظاہرہ سے اپنے دشمن کو مرعوب کرلیتا ہے ایسے ہر واقعہ کے بعد دشمن کا دل مجبور ہوتا ہے کہ اپنے کو چھوٹا اور اپنے حریف کو بڑا سمجھے۔ بھلی بات دشمن کے مقابلہ میں ایک قیمتی ہتھیار ہے، ایسا ہتھیار جو آدمی کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس ہتھیار کو جانیں اور اس کو استعمال کریں۔

جو شخص مخالف کی بری بات سے برا اثر نہیں لیتا وہ اپنے اس مزاج سے ایک بہت بڑا اثاثہ اپنے لئے حاصل کرتا ہے، یہ کہ وہ مخالف کی بات کو بھی ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سن سکے اور اگر اس کے اندر کوئی صداقت ہے تو اس کو پالے۔ تاریخ کی اکثر نادانیاں صرف اس بات کا نتیجہ تھیں کہ آدمی نے اپنے مخالف کی بات کو کھلے ذہن سے نہیں سنا۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو بری بات سے اثر نہ لینا بجائے خود حکمت کا ایک خزانہ ہے۔ اور آدمی کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مفت کے خزانے سے محروم نہ کرے۔

وقت کی اہمیت

نپولین (۱۸۲۱ – ۱۷۶۹) دنیا کا ایک مشہور ترین فاتح ہے۔ اس نے بے شمار جنگی کامیابیاں حاصل کیں۔ قدرتی آفت کے سوا کوئی اس کو زیر نہ کر سکا۔ نپولین نے اپنی کامیابیوں کا راز ان الفاظ میں بیان کیا۔ "میں اپنے حریفوں کے اوپر اس لئے غالب آتا ہوں کہ وہ لمحات جن کو لوگ کچھ نہیں سمجھتے، میں ان کی اہمیت کو پالیتا ہوں اور ان کو فوراً استعمال کرتا ہوں" یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بڑے بڑے مواقع اکثر چھوٹے لمحات میں آتے ہیں۔ ان لمحات کو جاننا اور ان کے مطابق فوری اقدام کرنا ہی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ ان نازک لمحات میں معمولی کوشش سے وہ کام ہو جاتا ہے جو بعد کو بڑی کوششوں سے بھی نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں یہاں چند اقوال نقل کئے جاتے ہیں

میں نے وقت کو برباد کیا تھا، اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے — شیکسپیئر

ایک موقع تمہارا دروازہ صرف ایک بار کھٹکھٹاتا ہے — کہاوت

انسان کے لئے زندگی میں کامیابی کا راز ہر آنے والے موقع کے لئے تیار رہنا ہے — ڈزرائیلی

وقت کی ٹرین اس کے لئے تیزی سے بھاگ رہی ہے جو کنارے کھڑا ہوا اس کا تماشا دیکھ رہا ہو مگر
وقت کی ٹرین اس کے لئے ٹھہر جاتی ہے جو برابر کی پٹری پر خود بھی اسی کی رفتار سے دوڑنا شروع کردے — آئن سٹائن

وقت ایسی نعمت ہے جس کا دوسرا کوئی بدل نہیں — بابا فرید

جس کام کو تم آج کر سکتے ہو اسے کبھی کل پر نہ ٹالو کیونکہ کل کبھی نہیں آتا۔ — چیسٹر فیلڈ

تم ہر چیز کو قیمت دے کر خرید سکتے ہو مگر وقت ہی ایک ایسا سودا ہے جس کی کوئی قیمت نہیں — خان خاناں

اگر تم کو زندگی عزیز ہے تو وقت کو ضائع نہ کرو۔ کیونکہ زندگی وقت ہی کے لمحات کا دوسرا
نام ہے۔ — فرینکلن

کسی کام کو شروع کرنے کا ابھی اسی وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں — انگریزی کہاوت

چھوٹے موقع کا صحیح استعمال اس کو بڑا بنا دیتا ہے اور بڑے موقع کا غلط استعمال اس کو
چھوٹا کر دیتا ہے — سویٹ مارڈین

نہ ہر لغزش واپس لی جا سکتی ہے اور نہ ہر موقع دوبارہ ہاتھ آتا ہے — عربی کہاوت

آدمی کے پاس سب سے بڑی دولت وقت اور موقع ہے، وہ وقت نہیں جو کل ملنے والا ہے بلکہ وہ وقت جو ابھی ملا ہوا ہے۔ جو شخص وقت کے انتظار میں ہے وہ تیز بھاگتی ہوئی گاڑی کے پیچھے سست رفتاری سے دوڑ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اس کو کبھی نہیں پکڑ سکے گا۔ جس چیز کو کامیابی کہا جاتا ہے وہ حقیقتہً اس کا نام ہے کہ آپ وقت کو استعمال کرلیں اور ناکامی یہ ہے کہ آپ وقت کو صحیح طور پر استعمال نہ کر سکیں۔ وقت ہر ایک کے لئے یکساں طور پر آتا ہے مگر وقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے وقت سے فائدہ اٹھایا ہو۔

وقت کی مثال برف کی مانند ہے۔ دو آدمی برف کی ایک ایک سل اپنے گھر میں لاتے ہیں۔ بظاہر دونوں کا معاملہ یکساں ہے۔ مگر برف کا مالک صرف وہ ہے جو برف کو فوراً کام میں لائے۔ جو برف کو کام میں نہ لاسکے وہ برف کو پانے کے باوجود برف کا مالک نہیں۔ کیونکہ بہت جلد وہ دیکھے گا کہ برف پگھل کر ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے پاس برف کے نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔

وقت کبھی ہمارے پیچھے نہیں دوڑے گا۔ بلکہ خود ہمیں وقت کے پیچھے دوڑنا ہوگا۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے وقت ہی کے درمیان کرنا ہے۔ وقت کو کھو کر ہم کوئی اور موقع نہیں پا سکتے جہاں ہم وہ کر سکیں جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مقصد کے لئے بھرپور حرکت میں آنے کا وقت وہی ہے جو ابھی فوری طور پر آپ کو حاصل ہے۔ اگر آپ نے ابھی وقت کو نہیں پکڑا تو وہ آپ سے اتنی دور جا چکا ہوگا کہ آپ کبھی اس کو پکڑ نہ سکیں گے۔

نوٹ: یہ تقریر ۲-۴ دسمبر ۱۹۸۰ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

نظر انداز کرو

"میں تمھاری صورت دیکھنا نہیں چاہتا"، کہنے والے نے کہا
"اپنی آنکھیں بند کرلو، میری صورت تمھیں دکھائی نہیں دے گی"
"میں تمھاری آواز سننا نہیں چاہتا" کہنے والے نے دوبارہ کہا
"اپنے کان بند کرلو، میری آواز تمھیں سنائی نہیں دے گی"

راماین کے دو کرداروں کا یہ سادہ مکالمہ زندگی کی بہت بڑی حقیقت بیان کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کہ جس مسئلہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے آدمی دوسروں کے پیچھے دوڑتا ہے، اس کو وہ اپنے آپ پر عمل کر کے زیادہ بہتر طور پر حل کر سکتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی کو کسی دوسرے شخص سے کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو وہ فوراً اس شخص کے خلاف کارروائی شروع کر دیتا ہے اور پھر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ نہ صرف پہلا مسئلہ بدستور باقی رہتا ہے بلکہ بے شمار نئے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہر مسئلہ کا زیادہ آسان اور یقینی حل یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو اس سے ہٹا لے، اس سے الجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے آپ کو زیادہ مفید کاموں میں مصروف رکھے۔

کسی مفکر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دوسروں کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنے پیچھے پڑو، کیونکہ اپنے آپ کو پکڑ کر تم زیادہ بہتر طور پر دوسرے کو پکڑ سکتے ہو" اکثر لوگ زندگی کے اس راز کو نہیں جانتے۔ وہ اپنی طاقت اور اپنے وقت کا بڑا حصہ اپنے مفروضہ مخالفین کو سبق سکھانے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اس طاقت اور وقت کو اپنی تعمیر میں لگائیں تو اپنے کو مضبوط اور کامیاب بنا کر وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ اپنے مخالفین کو سبق دے سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسرے شخص کی برائی کو نظر انداز کرنا ہمیشہ اس سے مقابلہ کرنے کا زیادہ کامیاب طریقہ ہوتا ہے۔ آپ کی بڑھی ہوئی طاقت آپ کے مخالف کو مرعوب کر کے بٹھا دیتی ہے۔ وہ آپ کے خلاف مزید کارروائی کرنے کا حوصلہ کھو دیتا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ برائی کرنے والے سے اپنے کو الجھا دیں تو یہ ہمیشہ تھوڑے نقصان کو بچانے کی خاطر بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اس طرح آپ اپنے وقت اور قوت کو بھی ضائع کرتے ہیں اور دوسرے کو موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنے اندر چھپی ہوئی مزید برائیوں کے ساتھ آپ کے اوپر پل پڑے۔

سماج کی ملی جلی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ہم کو کسی کی بات سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کسی کا کوئی کام ہمارے لئے پریشانی کا باعث بن جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر تکلیف ہونا فطری ہے۔ مگر ایسے مواقع پر سہارے کام لینے ہی میں ہر قسم کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔ اگر ہم برداشت نہ کریں اور بھڑ کر دوسرے سے لڑنے لگیں تو اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بھڑنے سے دوسرا شخص بھی بھڑتا ہے اور بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دوسرے کو برباد کرنے کی کوشش میں ہم خود اپنے آپ کو برباد کر لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک مکان کی اوپر کی منزل پر رہتا تھا۔ نیچے خالی جگہ تھی جہاں لڑکے کبھی کبھی آکر کھیلتے اور شور

مچاتے۔ اوپر والے کو لڑکوں کا شور پسند نہ تھا۔ اس نے منع کیا مگر لڑکے نہ مانے۔ آخر ایک دن غصہ میں آکر اس نے یہ کیا کہ لڑکوں کے اوپر چھت سے گندا پانی گرا دیا۔ لڑکے اس میں بھیگ گئے۔ اب لڑکوں کے غصہ کی باری تھی۔ انھوں نے آپے سے باہر ہو کر چھت کی طرف اینٹ کے ٹکڑے پھینکنے شروع کئے جو نیچے پڑے ہوئے تھے۔ ایک ٹکڑا اگر واش بیسن پر گرا جو اوپر والے کے مکان میں باہر کی جانب لگا ہوا تھا۔ چینی کا واش بیسن فوراً ٹوٹ گیا۔ لڑکے تو چند منٹ کے بعد بھاگ گئے مگر اس کا ٹوٹا ہوا قیمتی واش بیسن اس واقعہ کی افسوس ناک یادگار بن کر باقی رہ گیا۔ آدمی نے اگر لڑکوں کے شور کی طرف سے اپنے "کان" بند کر لئے ہوتے تو وہ شور سے بھی بچ جاتا اور واش بیسن کے نقصان سے بھی۔

کھونا بھی پانا ہے

"حادثات آدمی کو ہیرو بنا دیتے ہیں" کسی مفکر کا یہ قول لوئی بریل (۱۸۵۲ — ۱۸۰۹) کی زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ لوئی بریل ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ ابھی وہ تین سال کا تھا کہ باپ کی دکان میں ایک حادثہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔ یہی فرانسیسی اندھا ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار اندھوں کے لئے پڑھنے لکھنے کا وہ علامتی طریقہ ایجاد کیا جس کو اسی کے نام پر بریل کا طریقہ (Braille System) کہا جاتا ہے۔ لوئی بریل کے لئے بظاہر دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ مگر اس کے شوق اور محنت نے تاریکی میں بھی ایک نئی روشنی کا راز دریافت کر لیا۔

اسی قسم کا واقعہ ہیلن کیلر (۱۹۶۸ — ۱۸۸۹) کا ہے۔ یہ امریکی خاتون ابھی صرف ڈیڑھ سال کی تھی کہ ایک مہلک بخار میں وہ اندھی اور بہری ہو گئی۔ چونکہ وہ نہ دیکھ سکتی اور نہ سن سکتی تھی اس لئے وہ بولنا بھی نہ سیکھ سکی۔ آنکھ اور کان دونوں سے محرومی نے اس کو بالکل بے بسی کی حالت میں ڈال دیا تھا۔ بظاہر اب ہیلن کیلر کے لئے ایک ہی انجام مقدر تھا۔ وہ کسی معذور خانہ میں کس مپرسی کی زندگی گزارتے ہوئے مر جائے۔ ہیلن کیلر نے آنکھ اور کان کھو دئے تھے مگر اس نے ہمت نہیں کھوئی تھی۔ اس نے طے کیا کہ وہ آنکھ نہ ہوتے ہوئے دیکھے گی اور کان نہ ہوتے ہوئے سنے گی۔ وہ ان خوش قسمت لوگوں کی مانند بنے گی جن کو قدرت کی طرف سے آنکھ اور کان حاصل ہوتے ہیں۔

جب آدمی عزم کرے تو راہیں بھی کھلنے لگتی ہیں۔ ہیلن کیلر کو اپنی مدد کے لئے ایک لائق ٹیچر مس سولیون مل گئی۔ ہیلن کیلر نے انگلی سے چھو کر پڑھنے والے حروف سیکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پڑھنا آگیا۔ بہری ہونے کے باوجود اس نے اپنی محنت سے بولنا سیکھ لیا۔ اس نے یہ کیا کہ اس کی استانی جب بولتی تو وہ اس کے حلق پر اور اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حلق اور ہونٹ پر الفاظ کی حرکاتی شکل کو محسوس کرتی اور ان حرکتوں کو انگلی سے سمجھ کر اپنی زبان سے ان کی نقل کرتی۔ اس انوکھے قسم کی تعلیمی کوشش میں برسہا برس لگ گئے۔ مگر بالآخر اس کی کوشش کامیاب ہوئی۔ اس نے انگلیوں کی مدد سے الفاظ کی حرکتوں کو پہچاننا اور ان کو اسی طرح دہرا دہرا کر بولنا سیکھ لیا۔ اب وہ باقاعدہ پڑھنے اور بولنے لگی۔ اس نے اپنی تعلیم میں اپنی انگلیوں کو آنکھ اور کان کا بدل بنا لیا۔ انگلیوں کی مدد سے اس نے پڑھنا سیکھا اور انگلیوں ہی کی مدد سے بولنا بھی۔

مس سولیون سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہیلن کیلر نے پرکن کے اندھوں کے کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ۱۹۰۴ میں گریجویٹ ہو کر نکلی۔ اب اس نے لکھنا بھی سیکھ لیا۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ دیکھنے اور سننے کی فطری استعداد سے محرومی کے باوجود اس نے تین زبانیں سیکھ لیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور اسپینی۔ اس نے دنیا بھر کا سفر کر کے اندھوں کی تعلیم پر لیکچر دئے۔ اس کو ہارورڈ، گلاسگو، برلن اور دہلی کی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں دیں۔ اس کے علاوہ اس کو اور بہت سے عالمی اعزازات ملے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کوئی بڑا کارنامہ اکثر وہی لوگ انجام دیتے ہیں جو کسی بڑے حادثہ سے دو چار ہوتے ہوں۔ کسی کے ساتھ جب کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ اس کے اندر کمی کے احساس کو بے پناہ حد تک جگا دیتا ہے۔ وہ اس چیز کو پانے کے لئے دوسروں سے زیادہ بے تاب ہو جاتا ہے جس کو وہ کسی وجہ سے دوسروں سے بہت کم پائے ہوئے ہے۔ اس کی یہ بیتابی اس کے اندر سوئی ہوئی بہت سی نئی نئی صلاحیتوں کو ابھار دیتی ہے۔ دوسرے لوگ جس چیز کو صرف جزئی محنت سے لینا چاہتے ہیں اس کو وہ اپنی ساری شخصیت لگا کر حاصل کرنے کے لئے بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ تڑپ اس کے اندر ایک نیا انسان جگا دیتی ہے۔ "آنکھ" سے محروم ہونے والا اپنے "ہاتھ" سے پڑھنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔ پیروں کو کھونے والا اپنی عقل کے ذریعہ اپنے سفر کی تدبیر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے گھاٹا اٹھانے والا دوسرے اعتبار سے نفع حاصل کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حادثات بظاہر امکانات کا خاتمہ ہیں۔ مگر وہ ایک نئے آغاز کا سبب بن سکتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر نیا ارادہ ابھارتے ہیں۔ اس کی چھپی ہوئی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "پائے ہوئے" آدمیوں کے مقابلہ میں "کھوئے ہوئے" آدمیوں نے زیادہ بڑے کارنامے انجام دئے ہیں۔

ذمہ داری اپنی

ایک مفکر نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی۔ اس نے کہا "آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیئیٹ (Radiate) کرتا رہتا ہے" مطلب یہ ہے کہ آدمی جو عمل کرتا ہے اس کے ذریعہ سے وہ ماحول کے اندر اپنا تعارف پھیلاتا رہتا ہے۔ جس طرح ریڈیم کا ایک ٹکڑا اپنے گرد و پیش اپنی شعاعیں بکھیرتا ہے اسی طرح انسان اپنے ہر رویہ سے دوسروں کو بتاتا رہتا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

ایک دکان دار کا قصہ ہے۔ اس نے اپنے یہاں حساب لکھنے کے لئے ایک منیب رکھا۔ پہلے دن کام کرنے کے بعد منیب نے دکان دار کے یہاں غسل کیا اور اس کے بعد نل کو بند نہیں کیا، اس کو کھلا چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اگلے دن منیب آیا تو دکان دار نے اس کو مہینہ بھر کی پوری تنخواہ پیشگی دیتے ہوئے کہا "اب آپ کل سے میرے یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے گا"

"کیوں" منیب نے حیرت کے ساتھ پوچھا "ابھی تو آپ نے صرف نل کو کھلا چھوڑا ہے" دکان دار نے کہا "اسی طرح اگر کسی دن آپ نے میرے کاروبار میں کوئی دراز کھلا چھوڑ دیا تو میری ساری دولت اس کے راستہ بہہ

جائے گی اور میں دیوالیہ ہو کر رہ جاؤں گا "، ممکن ہے کہ دکان دار کے یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے منیب نے اس کو دل ہی دل میں برا بھلا کہا ہو۔ اس کی نظر میں دکان دار بہت غلط آدمی ہو جس نے ذرا سی بات کو اتنا بڑھایا کہ اس کی ملازمت ختم کر دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں اصل غلطی منیب کی ہے نہ کہ دکان دار کی۔ منیب کی لیاقت کو کوئی دکان دار صرف بہی کھاتہ کے صفحات میں نہیں دیکھے گا بلکہ اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کو دیکھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کرے گا۔

اگر ماحول آپ کے ساتھ غلط رویہ اختیار کرے تو ہر گز ماحول کی شکایت نہ کیجئے۔ کیونکہ ماحول تو صرف آپ کے عمل کا ردعمل پیش کرتا ہے۔ ماحول آپ کے ساتھ جو کچھ کر رہا ہے وہ خود آپ کے اس تعارف کا نتیجہ ہے جو آپ نے ماحول کے اندر کرایا تھا۔ اگر آپ ماحول کے اندر اپنا اچھا تعارف کرائیں تو ناممکن ہے کہ ماحول آپ سے اچھا سلوک نہ کرے۔ اگر ماحول کا سلوک آپ کی امیدوں کے خلاف ہو تو صرف اپنے کو قصوروار ٹھہرایئے۔ کیونکہ ماحول آپ کے ساتھ اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ خود آپ کے عمل کے مثنیٰ کو آپ کی طرف لوٹاتا ہے۔ جو آپ نے ماحول کو دیا ہے وہی وہ آپ کو دے دیتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

جس طرح بے شمار چھوٹے چھوٹے نقطے اور لکیریں مل کر ایک تصویر بناتے ہیں، اسی طرح آپ کا ہر لمحہ کا عمل دیکھنے والوں کے ذہن میں آپ کا نقش ترتیب دیتا رہتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ماحول کی نظر میں آپ کی ایک تصویر نہ بنے اور یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ کے ساتھ ماحول کا معاملہ اس کے سوا کسی بنیاد پر ہو جو آپ نے اپنے روزانہ کے عمل سے اسے دیا ہے۔ آدمی ہر وقت اپنی ایک تاریخ بنا رہا ہے۔ کسی کی تاریخ اچھی ہے اور کسی کی بری۔ کسی کی تاریخ کتابوں میں لکھی جاتی ہے اور کسی کی صرف مقامی داستان ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنے حلقہ میں ٹھیک ویسا ہی جانا جاتا ہے جیسا کہ اس نے اپنی تاریخ کے مطابق اپنے آپ کو بنایا ہے۔

آدمی ہر آن اپنے آپ کو ریڈیئیٹ کرتا رہتا ہے —— اس قول کو یاد رکھئے، اور پھر آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی، کیونکہ آپ خود بھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیں گے۔ اور اگر کسی کو شکایت کا موقع دیں گے تو پہلے سے اس کے لئے تیار رہیں گے کہ اس کی طرف سے آپ کو قابل شکایت بات برداشت کرنا ہے۔

آئینہ وہی دکھاتا ہے جو آپ فی الواقع ہیں۔ آئینہ میں کسی کے چہرہ پر دھبہ دکھائی دے تو وہ آئینہ سے نہیں لڑتا بلکہ خود اپنے دھبہ کو صاف کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دھبہ چہرہ پر ہے نہ کہ آئینہ پر۔ اسی طرح ماحول سے اگر آپ کو کوئی شکایت پیدا ہو تو ماحول پر غصہ نہ کیجئے۔ ماحول تو عین وہی چیز پیش کر رہا ہے جو آپ نے اپنے بارے میں ماحول کو بتایا ہے۔ ایسے ہر موقع پر اپنے آپ پر نظر ثانی کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے آپ کو درست کرتے ہی ماحول کے آئینہ میں بھی آپ کی تصویر درست ہو گئی ہے۔

انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے زیادہ سمجھ لیتا ہے جتنا کہ وہ فی الواقع ہے۔ یہی تمام جھگڑوں اور شکایتوں کی جڑ ہے۔ دوسرے آپ کو اتنا ہی سمجھتے ہیں جتنا کہ آپ حقیقۃً ہیں۔ اور آپ اپنے کو اپنی حقیقی حیثیت سے زیادہ سمجھے ہوئے ہیں۔ یہ فرق باہمی اختلاف پیدا کرے گا اور اختلاف آخر کار ٹکراؤ تک پہنچ جائے گا۔

یہ ایک ایسی کمزوری ہے جس میں فرد اور گروہ دونوں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ آپ حقیقت پسندی کا انداز اختیار کریں۔ حقیقت پسندی کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۱ - ۲۳ اپریل ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

ذرہ سے پہاڑ تک

ایک پرانی کہاوت ہے: "اگر تم پہاڑ کو سرکانا چاہتے ہو تو پہلے ذروں کو سرکانا سیکھو" آدمی اگر یکبارگی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانا چاہے تو وہ اس کو نہیں ہٹا سکتا۔ لیکن اگر وہ اس راز کو جان لے کہ پہاڑ بہت سے چھوٹے چھوٹے ذروں سے مل کر بنا ہے تو وہ ذروں سے اپنا عمل شروع کر کے یقیناً ایک روز پہاڑ تک پہنچ جائے گا۔ ذروں کو پکڑتے پکڑتے کوئی بھی شخص پہاڑ کو پکڑ سکتا ہے۔ مگر جو آدمی پہلے ہی دن پہاڑ کو پکڑنا چاہے وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

زندگی میں کوئی چیز ناممکن نہیں۔ ناممکن صرف یہ ہے کہ ممکن چیز کو ناممکن طریقہ سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ ایک ایک اینٹ رکھ کر یقینی طور پر اپنے لئے ایک مکان تیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ یکایک پورا مکان آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے تو ایسا مکان کبھی آپ کے لئے تیار نہ ہو گا۔ دنیا کے بنانے والے نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں جزء سے کل تک پہنچنے کا قانون رائج ہے۔ آدمی کو قدرت کے اسی قانون کی پیروی کرنی ہے۔ اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور طریقہ کامیابی حاصل کرنے کا نہیں۔

اکثر لوگوں کی ناکامی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ "ذرہ" سے اپنا کام شروع کرنا نہیں چاہتے بلکہ پورے "پہاڑ" کو یکبارگی اپنی جگہ سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک ایک ذرہ سے نمٹنے میں تو بہت دیر لگے گی، کیوں نہ پورے پہاڑ کو اکھٹے ہی سر کر لیا جائے۔ مگر یہ بہت بڑی بھول ہے۔ ذرہ ذرہ سے چلنے والے کے لئے تو کسی نہ کسی دن پہاڑ کی منزل آجائے گی۔ مگر جو شخص پورے پہاڑ پر بیک وقت قابو پانا چاہے گا وہ کبھی اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو گا، خواہ اس میں وہ کروروں سال بتا دے۔

ایک مقام پر دو بھائی تھے۔ ایک بھائی فوری طور پر بڑا فائدہ چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا "دے مولا چھین کر دو کی چوتھائی"۔ پہلے وہ ایک عرصہ تک عملیات اور تسخیر کی ورزشیں کرتا رہا تاکہ جنوں کو قبضہ میں کرے اور ان کے ذریعہ سے اچانک کوئی بڑا خزانہ حاصل کرلے۔ مگر سالہا سال کی محنت کے باوجود وہ کسی جن کو مسخر نہ کر سکا۔ اس کو نہ کوئی جن ملا اور نہ کوئی خزانہ۔ اس کے بعد اس نے لاٹری اور معمے کا تجربہ شروع کیا۔ سارے مہینہ اس کا یہ مشغلہ رہتا کہ لاٹری کے ٹکٹ خریدتا اور معمے بھر کر روانہ کر دیتا۔ اس میں بھی کتنے سال گزر گئے۔ مگر چھپر پھاڑ کر دولت اس کے اوپر نہیں برسی۔ آخر کار مایوسی کے عالم میں ایک روز اس کا انتقال ہو گیا۔

دوسری طرف اس کے دوسرے بھائی نے یہ کیا کہ پہلے انھوں نے کتابت سیکھی۔ ایک عرصہ تک وہ اخباروں اور رسالوں میں کتابت کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک پرنٹنگ پریس میں ملازمت کرلی۔ جب چھپائی کا کام اچھی طرح آگیا تو انھوں نے ایک چھوٹا سا ہینڈ پریس خرید لیا۔ اب وہ مزید ترقی کر کے ایک بڑا چھاپہ خانہ کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ اس میں وہ اور ان کے سب بچے لگے ہوئے ہیں۔ وہ عزت کی زندگی گزار رہے ہیں اور ان کی سب ضرورتیں

فراغت کے ساتھ پوری ہورہی ہیں ——— ایک بھائی نے بیک وقت پورے پہاڑ کو قبضہ میں لینا چاہا، وہ ناکام ہوگیا۔ دوسرا بھائی ذرہ ذرہ کو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھا، وہ کامیاب رہا۔

اسماعیل میرٹھی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب گزرے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

یوں ہی بوندیوں بھرے جھیل تال ——— یوں ہی کوڑی کوڑی ہوا جمع مال

یہ شعر ایک ایسی حقیقت بیان کر رہا ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں صد فی صد درست ہے۔ گنگا یا اور کوئی بڑا دریا میدانی علاقہ میں سمندر کا ایک پھیلا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو اس پہاڑی مقام پر دیکھیں جہاں سے وہ شروع ہوتا ہے تو آپ پائیں گے کہ میدان کا عظیم دریا پہاڑ کا معمولی چشمہ ہے۔ یہاں کی برفانی بلندی پر آپ کو بالکل دوسرا منظر دکھائی دے گا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر پانی کی چھوٹی چھوٹی بے شمار دھاریں بہہ بہہ کر نیچے ایک مقام پر آکر ملتی ہیں۔ یہاں ان کے ملنے سے دریا بنتا ہے۔ یہ دھاریں الگ الگ بس پانی کی سوت سی ہوتی ہیں۔ مگر ان کے یکجا ہونے سے ایک بڑا دھارا بہہ نکلتا ہے جو آگے میدانی علاقہ میں پہنچ کر دریا کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ پہاڑ کی چوٹی سے پہلے ہی قدم پر ایک گنگا بہادے تو ایسا گنگا کبھی وجود میں نہ آئے گا۔ گنگا پانی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی سوتوں سے مل کر بنتا ہے نہ کہ اچانک پانی کا سمندر بہہ پڑنے سے۔

معتدل زندگی

جاپان میں ایک شخص ہے جس کا نام ہے شیگی چیو ایزومی۔ وہ دنیا کا سب سے زیادہ معمر آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ۲۹ جون ۱۸۶۵ میں ہوئی تھی۔ اتنی زیادہ عمر کے باوجود ابھی تک اس کی جسمانی حالت بہت اچھی ہے۔ وہ جنوبی جاپان کے ایک جزیرہ ٹوکونوشیما میں ایک نارمل آدمی کی طرح رہتا ہے۔ غیر معمولی طور پر لمبی عمر کے باوجود تندرست ہونے کی وجہ سے اس نے بہت شہرت پائی ہے۔ وہ جاپان میں آنے والے سیاحوں کی فہرست کا ضروری جزء بن گیا ہے۔ چنانچہ ہر روز تقریباً ۲۰۰ سیاح اس کو دیکھنے کے لئے اس جاپانی جزیرہ میں پہنچتے ہیں۔ اس سے ملنے والے عام طور پر ایک سوال ضرور کرتے ہیں: "آپ کے نزدیک زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ کیا ہے" ایزومی کے الفاظ میں اس کا جواب یہ ہے کہ:

Live an ordinary life and don't go to extremes

معمولی زندگی گزارو اور کسی معاملہ میں انتہا پسندی تک نہ جاؤ (ہندستان ٹائمس ۸ جولائی ۱۹۸۱)

یہ بظاہر سیدھی سادی بات بہت قیمتی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی اگر کھانے، کپڑے، مکان اور دوسری ضروریات زندگی میں سادہ اور معمولی طریقہ کو اپنائے تو وہ کہیں زیادہ سکھی اور تندرست رہے اور بہت سی الجھنوں اور دشواریوں سے اپنے آپ بچ جائے۔ زیادہ تر مسئلے غیر ضروری تکلفات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور ان سے بچنے کی سب سے زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ اس قسم کے غیر ضروری تکلفات کو اپنی زندگی میں شامل ہی نہ کیا جائے۔

آپ کسی بھی مقام پر دونوں قسم کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شخص وہ ہے جس پر ہر وقت یہ احساس چھایا رہتا ہے کہ اس کی پوزیشن خراب نہ ہو۔ وہ اپنے اس مزاج کی وجہ سے مہمانوں کی تواضع میں بے حد تکلف کرتا ہے۔ گھر کو سجانے میں اپنی بساط سے زیادہ پیسہ خرچ کرتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنا ہو تو کافی وقت اس کو اپنے بنانے سنوارنے میں لگانا پڑتا ہے۔ تعلقات اور بات چیت میں خواہ مخواہ تصنع برتتا ہے۔ کوئی سفر کرنا پڑے تو ہر قسم کے لوازم کی فراہمی میں اتنا زیادہ سامان اپنے ساتھ لاد لیتا ہے کہ اس کا سفر غیر ضروری طور پر ایک مصیبت بن جائے۔ ایسا آدمی کبھی خوش نہیں ہوگا اور نہ اس کی صحت اچھی رہے گی۔

دوسری طرف وہ شخص ہے جو ضرورت دیکھتا ہے نہ کہ پوزیشن۔ جب کوئی شخص اس کے یہاں آتا ہے تو گھر میں جو کچھ موجود ہوتا ہے وہ بے تکلف اسے کھلا دیتا ہے۔ مکان کے معاملہ میں وہ صرف صفائی کو ضروری سمجھتا ہے نہ کہ سجاوٹ اور تزئین کو۔ اس کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو اسی حال میں باہر چلا جاتا ہے جیسے کہ وہ گھر کے اندر تھا۔ اس کا سفر اتنا ہلکا پھلکا ہوتا ہے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کب گیا تھا اور کب واپس آگیا۔ ایسا آدمی ہمیشہ خوش رہے گا۔ اس کی صحت بھی اچھی ہوگی۔ اس کے دماغ پر کسی قسم کا تناؤ نہیں ہوگا۔ وہ دن کو نشاط کے ساتھ کام کرے گا اور رات کو چین کی نیند سوئے گا۔

اسی طرح یہ ایک واقعہ ہے کہ انتہا پسندی اکثر حالات میں آدمی کے لئے مشکلات کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے مختلف اسباب سے ایک شخص کا دوسرے سے ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے مواقع پر لوگ عام طور پر انتہا پسندانہ طریقوں کی طرف جھک جاتے ہیں۔ وہ اعتدال اور توسط کا طریقہ اختیار نہیں کرپاتے بلکہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پسند کرتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ کیونکہ ایک فریق کی انتہا پسندی دوسرے فریق کے اندر جوابی انتہا پسندی پیدا کرتی ہے اور مسئلہ ختم ہونے کے بجائے اور زیادہ الجھتا چلا جاتا ہے۔ ایک مسئلہ کی جگہ کئی مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ دوسری مثال بھی ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے خلاف باتوں کا شدید اثر لیتے ہیں۔ جو دوسروں کے بارے میں رائے قائم کرنے میں ہمیشہ آخری انتہا پر چلے جاتے ہیں، جن کی دوستی بھی حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور دشمنی بھی حد سے بڑھی ہوئی، ایسے لوگ کبھی پرسکون زندگی کے مالک نہیں بن سکتے۔ اس کے برعکس جو لوگ خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کریں، جو دوسروں کے بارے میں ہمیشہ اعتدال کے ساتھ رائے قائم کریں، جو دوستی میں بھی درمیانی راہ اختیار کریں اور دشمنی میں بھی درمیانی راہ۔ ایسے لوگ ہمیشہ چین کے ساتھ رہیں گے۔ ان کا دن بھی سکون کے ساتھ گزرے گا اور رات بھی۔ یہی وہ زندگی ہے جس کے متعلق ویلنگٹن نے کہا ہے ——— موت کے بعد جنت میں رہنے کے لئے موت سے قبل بھی جنت میں رہنا ہوگا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۱ اگست ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

آپ کا عمل آپ کی قسمت ہے

ایک ڈینش کہاوت ہے "خوش قسمتی دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا سمجھ داری گھر کے اندر موجود ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ خوش قسمتی سمجھ دار آدمی کے حصہ میں آتی ہے نہ کہ بے سمجھ آدمی کے حصہ میں۔ خوش قسمتی دراصل اس نتیجہ کا نام ہے جو سمجھ داری کے ساتھ عمل کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

ہر شخص کی زندگی میں وہ مواقع ضرور آتے ہیں جب کہ وہ بروقت صحیح عمل کرکے اپنے مقدر کو اچھا بنا سکے۔ ہر شخص پر وہ لمحات گزرتے ہیں جو اس کی دانش مندی اور اس کی قوت عمل کا امتحان ہوتے ہیں۔ مگر یہ مواقع ہمیشہ اچانک آتے ہیں۔ آدمی کو بس چند لمحات کے اندر انھیں پہچاننا پڑتا ہے۔ جو شخص ایسے مواقع پر سمجھ داری اور قوت فیصلہ کا ثبوت دے وہ کامیاب رہتا ہے اور جو شخص سمجھ داری اور قوت فیصلہ کا ثبوت نہ دے سکے وہ ناکام رہتا ہے۔

نقصان یا ناکامی کسی کا مقدر نہیں، وہ اپنی کوتاہی کی قیمت ہے۔ اگر آپ نے موقع کو پہچاننے میں غفلت کی ہے تو آپ کو ضرور اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ اپنی غفلت کے لئے کسی دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرا کر آپ اپنی غفلت کی قیمت ادا کرنے سے بچ نہیں سکتے۔ بھرتری ہری نے سچ کہا ہے "نقصان کیا ہے وقت پر چوک جانا" اگر آپ وقت پر چوک گئے تو دوسرے کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کی تلافی کرنا ممکن نہیں۔

آپ بہت سے لوگوں کو زمانہ کی شکایت کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ کہیں گے "کیا کریں ہماری قسمت ہی بری ہے" یا یہ کہ "مقدر نے میرا ساتھ نہ دیا ورنہ میری کامیابی یقینی تھی"، اس قسم کے جملے اگرچہ قواعد زبان کے اعتبار سے درست ہیں مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہیں۔ کیونکہ زمانہ کسی کا دوست یا کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔ وہ ایک کے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے کے لئے۔

پال شرر نے کتنی عمدہ بات کہی کہ "آج کی محنت ہی کل کی قسمت ہے" آدمی جس چیز کو قسمت کا فیصلہ کہتا ہے وہ دراصل اس کی اپنی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قسمت کے ترازو پر ہر آدمی کا انجام تل رہا ہے۔ مگر انجام کے پلہ میں کسی آدمی کو اتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا عمل کے پلہ میں اس نے رکھا ہے۔ دنیا کے بازار میں عمل ہی ہر سودے کی قیمت ہے۔ یہاں جو شخص جتنا عمل کرے گا اتنا ہی سودا اس کے حصہ میں آئے گا۔

ایک پرانی کہاوت ہے کہ "کوئی موقع تمھارا دروازہ صرف ایک بار کھٹکھٹاتا ہے" اگر آپ کسی موقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں تو اس کے بعد مزید یہ غلطی نہ کیجئے کہ کسی دوسرے کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف شکایت کرنے بیٹھ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری بار جب کوئی موقع آپ کا دروازہ کھٹکھٹائے گا تو آپ اس کی آواز

نہیں سن سکیں گے اور دوبارہ ناکام رہیں گے۔ جو آدمی فریاد و ماتم میں مشغول ہو اس کے کان اپنی ہی آوازوں سے بھرے ہوتے ہیں، پھر اس کو باہر کی آواز کس طرح سنائی دے گی۔

اتھرووید میں کہا گیا ہے "میرے دائیں ہاتھ میں عمل ہے اور میرے بائیں ہاتھ میں فتح"۔ حقیقت یہ ہے کہ عمل اور کامیابی دونوں باہم اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں میں وہی رشتہ ہے جو بیج اور درخت میں ہوتا ہے، درخت اسی کے حصہ میں آتا ہے جس نے درخت کے لئے بیج ڈالا ہو۔ اسی طرح کامیابی کا مالک صرف وہ شخص بنتا ہے جس نے اس کے لئے ضروری عمل کیا ہو۔ بیج کو صحیح حالات ملنا اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ضرور درخت بنے۔ اسی طرح درست عمل اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ کر رہے۔

یاد رکھئے، امیدوں کا ہر محل اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے ٹوٹتا ہے۔ اگر آپ خود چوکس ہوں تو کوئی آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ کتنی بامعنی ہے یہ چیک کہاوت ـــــــ "بدبختی ہمیشہ اس دروازہ سے داخل ہوتی ہے جو ہم خود اس کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔"

غصہ سے بچئے

ارسطو کا قول ہے "غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے اور شرمندگی پر ختم ہوتا ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غصہ ایک نفسیاتی ہیجان کی حالت ہے اور ہیجان کی حالت میں جو کارروائی کی جائے اس میں کبھی اعتدال نہیں ہو سکتا۔ غیر معتدل حالت میں آدمی جب کوئی کارروائی کرتا ہے تو اعتدال پر آنے کے بعد اکثر اسے اس احساس سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

امریکہ میں پولس قانون کے نفاذ میں بہت مستعد رہتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص ٹرافک اصول کی خلاف ورزی کرے یا سڑک پر گندگی ڈالے تو فوراً اس پر جرمانہ کیا جاتا ہے۔ ایک لطیفہ ہے کہ ایک بار کسی سڑک پر ایک کار تیزی سے گزری۔ ڈرائیور مقررہ رفتار (۵۵ میل فی گھنٹہ) سے زیادہ تیز اپنی گاڑی چلا رہا تھا۔ امریکی پولس نے اس کا پیچھا کیا۔ کافی دور جا کر اس نے اس کو پکڑا۔ پولس نے بتایا کہ وہ اتنے فاصلہ سے اس کا پیچھا کرتی آرہی ہے۔ چونکہ وہ مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلا رہا تھا اس لئے اس کو چاہئے کہ وہ قانون کے مطابق تیس ڈالر جرمانہ ادا کرے۔

یہ سن کر موٹر سوار پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگرٹ تھا۔ اس نے اظہار بیزاری میں سگرٹ سڑک پر پٹک دیا۔ پولس کے آدمی نے فوراً کہا: جناب عالی، اب آپ مزید پچاس ڈالر اس کوڑا ڈالنے (Littering) کے بھی ادا کیجئے ـــــــ آدمی نے فوراً جرمانہ ادا کیا ہوتا تو وہ ۳۰ ڈالر میں چھوٹ جاتا۔ مگر اس کے غصہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانہ کی رقم بڑھ کر ۸۰ ڈالر ہوگئی۔

"غلطی کے بعد بہترین صحیح بات یہ ہے کہ آدمی اپنی غلطی کا اعتراف کرے" کسی کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ آدمی اگر فوراً اپنی غلطی کو مان لے تو وہ سستا چھوٹ جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نے غلطی کو ماننے میں دیر کی یا غصہ میں کوئی اور غلطی کر ڈالی تو یہ صرف اس کے جرم میں اضافہ کے ہم معنی ہوگا اور اس کے اوپر لگنے والی "جرمانہ" کی رقم بڑھتی چلی جائے گی۔

جرم اگر بالکل کھلا ہوا ہو تو اس کا اعتراف نہ کرنا ڈھٹائی بن جاتا ہے، اور ڈھٹائی تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اور اگر آدمی ایسا کرے کہ جرم کی نشان دہی کرنے والے سے لڑنے لگے تو وہ اپنے بچاؤ کے آخری موقع کو بھی کھو دے گا۔ اس کی طرف سے قصور کا اعتراف نہ کرنا فریق ثانی کے اندر مزید ردعمل پیدا کرے گا اور وہ قصوروار کو اس سے زیادہ سخت سزا دینے پر اتر آئے گا جو ابتداءً وہ اس کو دینا چاہتا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے "صابن کپڑے کے میل کو صاف کرتا ہے اور اعتراف اخلاق کے میل کو"

اپنی غلطی کا اعتراف مسئلہ کو فوری طور پر ختم کرنے کی سب سے آسان تدبیر ہے۔ ایک فریق جب نرمی سے اپنی غلطی کو مان لے تو دوسرا فریق بھی فوراً نرم پڑ جاتا ہے۔ غلطی کا اعتراف دوسرے شخص کے غصہ پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

ایک دکاندار نے محلہ کے ایک نوجوان شخص پر چوری کا الزام لگایا۔ یہ الزام غلط تھا۔ نوجوان کو سخت غصہ آیا۔ اس نے دکاندار کا گریبان کھینچا اور اس کو پکڑ کر مارنا شروع کیا۔ اس کے بعد بات بڑھی۔ محلہ میں کافی شور و غل ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کو دھمکی دیتے اور زور دکھاتے رہے۔ نوجوان کے آدمیوں نے اس سے کہا کہ تم معافی مانگ لو۔ مگر وہ کسی طرح معافی مانگنے پر تیار نہ ہوا۔ اگلے روز دوبارہ لوگ جمع ہوئے اور یہی بات شروع ہوئی۔ نوجوان کسی حال میں معافی مانگنے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخر دکاندار اٹھا۔ وہ عمر میں کافی زیادہ تھا۔ اس نے بڑھ کر نوجوان کو اپنے سینہ سے لگالیا۔ اس نے کہا "اگر تم معافی مانگنے کے لئے تیار نہیں ہو تو چلو میں ہی تم سے معافی مانگتا ہوں، اس قصہ کو ختم کرو"

اس کے بعد نوجوان ڈھ پڑا۔ دکاندار نے خود جھک کر نوجوان کو بھی جھکا دیا۔ نوجوان اچانک دکاندار کے قدموں میں گر پڑا۔ اس نے کہا "آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے لئے باپ کے برابر ہیں۔ اصلی قصور میرا ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیجئے"

بہت کم لوگ ہیں جو غصہ آنے کے بعد غصہ کے انجام سے بچتے ہوں۔ حالاں کہ غصہ کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا آسان بھی ہے اور ممکن بھی۔ غصہ کوئی مستقل حالت نہیں۔ وہ خارجی اسباب کے تحت وقتی طور پر آدمی کے اوپر طاری ہوتا ہے۔ اور جو چیز وقتی اور خارجی نوعیت کی ہو اس کو دور کرنا اتنا ہی آسان

ہے جتنا کپڑے پر میل لگنے کے بعد کپڑے کو دھو کر پاک کرنا۔

غصہ آنے کے بعد غصہ کے انجام سے بچنے کے لئے صرف ایک چیز درکار ہے۔ اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے سنبھالنے کی طاقت۔ غصہ آنے کے بعد اگر ایک لمحہ کے لئے بھی آپ اپنے کو اس کے زیر اثر آنے سے روک لیں تو یقینی طور پر آپ اپنے کو غصہ کے انجام سے بچا سکتے ہیں۔

جیفرسن کا قول ہے "اگر تم غصہ میں ہو تو بولنے سے پہلے ایک سے دس تک گنو، اگر بہت زیادہ غصہ میں ہو تو سو تک" یہ غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی نہایت آسان تدبیر ہے۔ غصہ کی حالت میں سو تک گنتی گننا دراصل اپنے ذہن کو غصہ سے پھیرنا ہے۔ آدمی اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اپنے ذہن کو کسی دوسری طرف موڑ سکے تو اس کے غصہ کی آگ اپنے آپ ٹھنڈی ہو جائے گی۔

شکایت نہیں

ٹامس کارلائل کا قول ہے "کیا تم نے اس آدمی کے بارے میں نہیں سنا جو سورج کو اس لئے کوستا تھا کہ وہ اس کی سگرٹ نہیں جلاتا" کارلائل نے جو بات تمثیلی انداز میں کہی ہے وہ ہم میں سے اکثر لوگوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آپ کو بے شمار لوگ کسی نہ کسی کی شکایت کرتے ہوئے ملیں گے ــــــ حکومت کی شکایت، پڑوسیوں کی شکایت، رشتہ داروں کی شکایت، دوستوں کی شکایت۔ اور اسی طرح دوسری شکایت۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اکثر شکایتیں بالکل بے بنیاد ہوتی ہیں۔ وہ اپنی کوتاہی کے لئے دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کے ہم معنی ہوتی ہیں۔ وہ ایسی ہی ہیں جیسے کوئی سگرٹ پینے والا اپنا سگرٹ سورج کی طرف کر کے یہ چاہے کہ سورج کی گرمی سے اس کا سگرٹ جل جائے۔ اور سورج جب اس طرح اس کے سگرٹ کو نہ جلائے تو وہ سورج کو کوسنے لگے۔ حالانکہ ایسے آدمی کو اپنی بے عقلی اور اپنی بے ہمتی کا شاکی ہونا چاہئے نہ کہ آسمان کے سورج کا۔

کسی نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ "جتنی زیادہ امید اتنی ہی زیادہ مایوسی" جب بھی آپ کو کسی شخص سے شکایت پیدا ہو تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے اس شخص سے اس سے زیادہ کی امید کر لی تھی جو امید فی الواقع آپ کو اس سے کرنی چاہئے تھی۔ اگر آپ ایک لکڑی سے یہ امید قائم کر لیں کہ وہ آپ کے لئے لوہے کا کام دے گی تو اس کے بعد مایوسی کے سوا اور کیا چیز آپ کے حصہ میں آئے گی۔

ایک شخص جس کے پاس آپ کے لئے صرف زبانی ہمدردی تھی اس سے آپ نے عملی ہمدردی کی امید قائم کر لی۔ ایک شخص جس کو آپ سے صرف اتنا تعلق تھا کہ وہ ملاقات کے وقت آپ کو چائے پلا دے اس سے آپ نے یہ امید کر لی کہ وہ آپ کے لئے پیسہ خرچ کرے گا اور آپ کی خاطر جان لڑائے گا۔ ایک شخص جو آپ کا صرف رسمی دوست تھا اس کے بارے میں آپ نے یہ یقین کر لیا کہ وہ آپ کا جگری دوست ثابت ہوگا۔ ایک شخص جو صرف اچھے حالات میں آپ کا

ساتھ دے سکتا تھا اس کے متعلق آپ نے یہ امید باندھ لی کہ وہ برے حالات میں آپ کا ساتھی بنے گا۔ ایک شخص جو صرف بناؤ کے وقت شریف رہ سکتا تھا اس سے آپ نے یہ توقع کر لی کہ وہ بگاڑ کے وقت بھی شریف بنا رہے گا۔ یہ سب چیزیں حقیقت واقعہ کے خلاف ہیں اور موجودہ دنیا میں حقیقت واقعہ کے خلاف چیزوں کا کوئی وجود نہیں۔

اس قسم کی امیدیں کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے وہ آپ کے حق میں بھی پوری نہیں ہوئیں۔ زندگی کا راز یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے بس اس کی طاقت کے بقدر چاہا جائے، اس سے زیادہ نہیں۔ اگر آپ ایسا کریں کہ دوسروں سے اتنی ہی امید کریں جتنی امید ان سے کرنی چاہئے تو آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "مطمئن زندگی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندی ہے۔"

آپ صرف ایک سادہ سی بات کو پکڑ لیجئے اور اس کے بعد آپ کو کبھی کسی سے شکایت نہ ہوگی۔ "اپنے آپ کو بھی اسی پیمانہ سے ناپئے جس پیمانہ سے آپ دوسروں کو ناپنا چاہتے ہیں۔" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی معاملہ میں ایک شخص سے بگڑ جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیا اور ایسا کیا۔ حالاں کہ اگر وہ اس طرح سوچے کہ میں اس شخص کی جگہ ہوتا تو ایسے حالات میں کیا کرتا تو یقیناً وہ اس رائے پر پہنچے گا کہ ایسے حالات میں خود وہ بھی دوسروں کے ساتھ وہی کچھ کرتا جو دوسروں نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ آپ دوسرے کو کبھی وہ نہیں دے پاتے جس کی امید وہ آپ سے قائم کئے ہوئے ہے۔ پھر دوسرے سے اگر آپ کو یہی تجربہ ہو تو آپ کو دوسرے سے شکایت کرنے کا کیا حق۔

جو آدمی شکایتی مزاج کا ہو اس کے حصہ میں مزید یہ نقصان آتا ہے کہ وہ ہر ایک سے بیزار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کے اوپر اعتماد نہیں کر پاتا۔ اگر آپ سورج سے یہ چاہیں کہ وہ آپ کے راستہ کو روشن کر دے تو سورج آپ کو بہت بڑی نعمت نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ یہ چاہنے لگیں کہ آپ اپنا سگرٹ سورج کی طرف کریں اور وہ آپ کی سگرٹ سلگا دے تو سورج آپ کو بیکار سی چیز معلوم ہونے لگے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی آپ کو کچھ نہ کچھ دے سکتا ہے۔ مگر آدمی آپ کو وہی چیز دیتا ہے جو وہ خود آپ کو دینا چاہتا ہے نہ کہ وہ چیز جو آپ اس سے اپنے لئے لینا چاہتے ہیں۔

جو آدمی دوسروں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ امید باندھ لے اس کو ہر آدمی ناقص معلوم ہوگا، وہ کسی کو اپنا نہیں سمجھے گا۔ وہ بھرے ہوئے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ یہی بات ایک ترکی کہاوت میں اس طرح کہی گئی ہے "جس کو ایسے دوست کی تلاش ہے جس میں کوئی کمی نہ ہو اس کو کبھی کوئی دوست نہیں ملے گا۔"

نوٹ: یہ تقریر ۱۵ - ۱۷ دسمبر ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

دونوں طرف ساحل

ایک شخص کشتی پر سوار ہوکر سمندری سفر کے لئے روانہ ہو رہا تھا۔ اس کے مغربی دوست نے اس کو رخصت کرتے ہوئے کہا کہ آج تم ایک صاف سمندر میں اپنا سفر شروع کر رہے ہو۔ مگر کبھی موسم تمھارے لئے اچھا رہے گا اور کبھی خراب۔ تمھارے راستہ میں طوفان آئیں گے اور تمھیں اس کا مقابلہ کرکے آگے بڑھنا ہوگا۔ تم کبھی بے ہمت نہ ہونا۔ محفوظ ساحل تمھارے دونوں طرف تمھارا انتظار کر رہا ہے:

Safe harbour awaits you both in the end

ان چند لفظوں میں زندگی کی بہت گہری حقیقت بیان کردی گئی ہے۔ آدمی ایک مقصد کی طرف بڑھتا ہے۔ مقصد کو حاصل کرنے میں اسے ناکامی ہوتی ہے۔ وہ ہمت چھوڑ بیٹھتا ہے۔ ایک ناکامی کو وہ ساری ناکامی سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اب میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اگر وہ اپنے سابقہ مقام کی طرف لوٹ آئے تب بھی وہ ناکام نہیں۔ یہ اس کی ایک کامیاب حیثیت ہی تھی جس نے اسے یہ موقع دیا کہ وہ کشتی پائے اور اس پر سوار ہوکر اس کو چلاتا ہوا آگے بڑھے۔ پھر اگر وہ اپنی اس سابقہ کامیاب حیثیت کی طرف لوٹے اور اس کو دوبارہ پالے تو اس میں ناکامی کا کیا سوال۔

دریا کے دونوں طرف ساحل ہوتے ہیں۔ اگر آدمی آگے نہ بڑھ سکے تو پیچھے لوٹ کر بھی وہ ایک ساحل کو پالے گا۔ یہی معاملہ زندگی کے سفر کا بھی ہے۔ یہاں بھی سفر کے دونوں طرف ساحل ہیں، ایک مقام وہ ہے جدھر آپ بڑھنا چاہتے ہیں۔ دوسرا مقام وہ ہے جس کو چھوڑ کر آپ آگے بڑھے تھے۔ اگر آپ اگلے مقام تک نہ پہنچ سکیں تو پیچھے لوٹ آیئے۔ کیونکہ یہاں بھی ایک مقام آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ہر وقت دو امکانات کے درمیان ہوتا ہے۔ مگر اکثر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک امکان کو کھو کر وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دوسرا امکان بھی ان سے کھویا جا چکا ہے۔

کسی کا قول ہے "جو سورج کل صبح کو نکلا تھا وہی آنے والے دن کو دوبارہ چمکنے والا ہے"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ گزرے ہوئے وقت کا ماتم کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ آنے والے وقت کا استعمال کیا جائے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حکمت کا لحاظ کرتے ہوں۔

ایک طالب علم دسواں پاس کرچکا تھا۔ اس کے بعد اس نے گیارھویں درجہ کا امتحان دیا۔ وہ اس امتحان میں فیل ہوگیا۔ اس کے بعد اس پر اتنی مایوسی چھائی کہ اس نے خودکشی کرلی۔ اس کو یاد نہ رہا کہ اگر وہ علم کی گیارھویں سیڑھی تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے تو اس سے کیا ہوا۔ دسویں سیڑھی پر تو اب بھی اس کے پاؤں جمے ہوئے ہیں۔ اگر وہ

پیچھے لوٹ آتا تو وہ " دسویں پاس " کی حیثیت سے بھی دنیا میں اپنی جگہ بنا سکتا تھا۔ یا دوبارہ محنت کر کے گیارھویں درجہ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر اس کی مایوسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ صرف اگلا کنارہ یاد رکھ سکا۔ اس کے پیچھے بھی ایک کنارہ تھا مگر وہ اس کو بھول گیا۔ اگر وہ کچھ اور نہ کرتا، صرف اپنے پیچھے کی طرف لوٹ آتا تو وہ دیکھتا کہ ایک محفوظ ساحل اس کا انتظار کر رہا ہے۔ مگر اس نے صرف اپنے آگے دیکھا، وہ اپنے پیچھے نہ دیکھ سکا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے زندگی کے عین کنارے کھڑے ہو کر اپنے کو زندگی سے محروم کر لیا۔

ناکامی کے واقعات ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ آدمی جب ناکام ہو تو اس کے دل کو جھٹکا لگے۔ اپنی غلطیوں کا احساس کر کے اس کو سخت شرمندگی لاحق ہو۔ ناکامی کا یہ احساس اس وقت بہت مبارک ہے جب کہ وہ نئی، زیادہ صحیح جدوجہد کے لئے آدمی کو اکسائے - لیکن ناکامی کا احساس اگر صرف افسوس کرنے اور اپنے کو گھلانے کے ہم معنی بن جائے تو یہ ایک ناکامی کے بعد اپنے کو دوسری اور زیادہ بری ناکامی کے حوالے کرنا ہے۔ یاد رکھئے جو ناکام نہ ہو وہ ابھی زندگی میں داخل ہی نہیں ہوا۔ اور جو ناکامی سے صرف کڑھن لے کر لوٹا اس نے زندگی کو پا کر دوبارہ زندگی کو کھو دیا۔ پامر کا یہ قول نہایت درست ہے کہ ——— " اصلاح کی تدبیر کئے بغیر نادم ہونا ایسا ہی ہے جیسے سوراخ بند کئے بغیر جہاز میں سے پانی نکالنا "

وقت کی اہمیت

ایک شخص فوج میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ اس کے بعد ترقی کرتے کرتے بڑا فوجی افسر بن گیا۔ اس فوجی افسر نے ایک بار اپنی زندگی کا تجربہ بتاتے ہوئے کہا " فوج میں میری غیر معمولی ترقی کا سبب صرف میری یہ خصوصیت تھی کہ مجھ کو اگر دس بجے ڈیوٹی پر جانا ہوتا تو میں نو بجے تیار رہتا تھا "

بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے مگر یہ بہت اہم بات ہے۔ یہ تمام ترقیوں کا راز ہے۔ زندگی کے معاملات میں وقت کی بے حد اہمیت ہے۔ جو شخص وقت کا جتنا زیادہ پابند ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ ترقی کے منازل طے کرے گا۔ اکثر ناکامیوں اور مصیبتوں سے بچنے کا واحد راز یہ ہے کہ وقت کو نہ کھویا جائے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے " وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرو، تمھاری گاڑی کبھی نہیں چھوٹے گی "

آپ کو ایک ٹرین پکڑنی ہے جو دس بج کر ۳۰ منٹ پر چھوٹتی ہے۔ آپ کے گھر سے اسٹیشن تک کا راستہ ۳۰ منٹ کا ہے۔ اب اگر آپ یہ سوچیں کہ وقت سے پہلے جانے کی کیا ضرورت۔ اور گھر سے صرف پانچ منٹ پہلے روانہ ہوں تو عین ممکن ہے کہ راستہ میں کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آجائے جو آپ کے سفر کو ۳۰ منٹ کے بجائے ۴۰ منٹ یا ۵۰ منٹ کا بنا دے اور نتیجہ یہ ہو کہ آپ کی گاڑی چھوٹ جائے۔ آپ

اسٹیشن اس حال میں پہنچیں کہ وہاں آپ کو یہ سننے کے لئے ملے کہ آپ کی گاڑی آپ کے آنے کے صرف چند منٹ پہلے روانہ ہوگئی۔ جو شخص وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اس کی ٹرین کبھی نہیں چھوٹتی۔ مگر جو آدمی عین وقت پر اسٹیشن پہنچنا چاہے گا عین ممکن ہے کہ اسٹیشن پہنچ کر اس کو یہ خبر سننی پڑے کہ ٹرین روانہ ہوگئی۔

وقت کی پابندی حقیقۃً تیز روی کا نام ہے نہ کہ سادہ معنوں میں صرف پابندی کا۔ وقت پر کارکردگی کا ثبوت صرف وہ شخص دے پاتا ہے جو وقت کے بارے میں مبالغہ آمیز حد تک حسّاس ہو۔ جو شخص وقت سے آگے چلنے کی کوشش کرے وہی وقت کے ساتھ چل پائے گا۔ جو شخص وقت سے آگے بڑھنے کا مزاج رکھتا ہو وہی وقت کو پکڑنے میں کامیاب ہوگا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص وقت سے پہلے تیار ہونے کی کوشش کرے وہی وقت پر تیار ہو کر اپنے کام پر پہنچتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی عین وقت پر اپنی تیاری شروع کرے وہ ہمیشہ وقت سے پیچھے رہے گا۔ ایسا آدمی کبھی ٹھیک وقت پر اپنے کام پر نہیں پہنچ سکتا۔

آدمی اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ اور نہ کسی آدمی کو موجودہ دنیا میں سارا اختیار حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کے راستہ میں دوسروں کی طرف سے بار بار مختلف قسم کی رکاوٹیں پیش آتی رہتی ہیں۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اندازہ کچھ کرتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ اس بنا پر وقت کے مطابق کام کرنے کی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہر کام کے لئے وقت سے کچھ پہلے تیاری شروع کر دی جائے۔ جب آپ کوئی پروگرام بنائیں تو اس اتفاقی رکاوٹ کا لحاظ کرکے اپنا پروگرام بنائیں جو غیر متوقع طور پر پیش آکر آپ کے منصوبہ کو بگاڑ دینے والی ہے۔ اگر آپ اپنے پروگراموں میں اس حکمت کو ملحوظ رکھیں تو یقینی طور پر آپ غیر ضروری قسم کی خلل اندازیوں سے بچ سکتے ہیں۔ اور پھر آپ کے اوپر سیموئل ٹیلر کے یہ الفاظ صادق نہ آئیں گے کہ "مشکل ایسا عذر ہے جس کو تاریخ کبھی قبول نہیں کرتی"

آپ کو ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جو ایک ضروری کام نہ کر سکیں گے اور اس کے بعد کہیں گے کہ کیا کریں وقت نہیں ملا۔ یہ وقت نہ ملنے کا واقعہ صرف اس لئے پیش آیا کہ انھوں نے اپنے وقت کو برباد کیا۔ وقت کی کمی ہمیشہ وقت کی بربادی کی قیمت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر برویئر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "جو لوگ وقت کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ وقت کی کمی کی شکایت کرتے ہیں۔"

نوٹ: یہ تقریر ۱۱-۱۲ مارچ ۱۹۸۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی

چھت کے لئے فرش

ایک شخص کا قول ہے کہ سر کے اوپر چھت ہونے کے لئے ضروری ہے کہ تمھارے پیروں کے نیچے ایک فرش موجود ہو:

To have a roof over your head you need a floor under your feet

چھت اوپر ہوتی ہے مگر وہ ہمیشہ نیچے کے فرش کے اوپر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر فرش نہ ہو تو چھت کھڑی کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہی معاملہ زندگی کا ہے۔ آپ کو پہلے نیچے کی زمین تیار کرنی ہوگی، اس کے بعد ہی آپ اوپر کی ترقیوں کے مالک بن سکتے ہیں۔

فرینکلن کا قول ہے "ٹوٹی ہوئی کشتی کو ساحل کے قریب ہی رہنا چاہئے"۔ اگر آدمی اس حقیقت کا لحاظ نہ کرے کہ اس کی کشتی ٹوٹی ہوئی ہے اور جوش میں آکر اپنی کشتی کو بیچ سمندر میں ڈال دے تو ایسا جوش ہمیشہ الٹا پڑے گا۔ وہ اس کی کشتی کو بھی ڈبائے گا اور خود اس کو بھی۔ اگر آپ کی کشتی ٹوٹی ہوئی ہے تو آپ یا تو ساحل پر رہئے جہاں پانی بھی کم ہوتا ہے اور خطرہ کے وقت بچاؤ کی تدبیر بھی قریب ہی مل جاتی ہے۔ اور اگر آپ ساحل پر رہنے پر قانع نہیں ہیں تو پہلے اپنی کشتی کو درست کیجئے۔ ایسی حالت میں آپ کے عمل کا آغاز لازماً کشتی کو درست کرنے سے ہونا چاہئے نہ کہ ساحل کو چھوڑ کر پانی کے منجدھار میں داخل ہو جانے سے۔

اس اصول کا تعلق زندگی کے ہر معاملے سے ہے۔ اگر آپ ایک مکان بنانا چاہتے ہیں تو پہلے آپ کے پاس تعمیر کا ضروری سامان ہونا چاہئے۔ اگر آپ کسی زبان میں ایک اخبار نکالنا چاہتے ہیں تو اس زبان میں اخبار پڑھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہونی چاہئے۔ اگر آپ الکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو آپ کے حلقۂ انتخاب میں ایسے ووٹر ہونے چاہئیں جو آپ کو ووٹ دیں۔ ابتدائی بنیاد کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کیا جاسکتا، خواہ وہ فرد سے متعلق ہو یا قوم سے متعلق۔

ایک پرانی کہاوت ہے "خود کو بدل دو، قسمت اپنے آپ بدل جائے گی" اس کا مطلب یہ ہے کہ مصیبت کا سبب آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ آدمی اگر سوچے کہ جو مسئلہ پیدا ہوا ہے اس کا اصلی سبب کہاں ہے تو معلوم ہوگا کہ اس کا سبب اس کی اپنی کوتاہی ہے۔ جب ناکامی کا اصل سبب اپنی کوتاہی ہے تو دوسرے کے خلاف شور وغل کرنے سے کیوں کر ایسا ہو سکتا ہے کہ ناکامی کامیابی میں

تبدیل ہو جائے۔

ایک شخص نے دکان کھولی۔ اس کی دکان چلی نہیں۔ یہاں تک کہ دیوالیہ پن کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایک روز اس کے دوست نے کہا "تمھاری دکان اس لئے نہیں چل رہی ہے کہ تمھارے گاہکوں کو پاس کا دکان دار توڑ لیتا ہے"۔ یہ سن کر دکان دار بولا "تم غلط کہتے ہو، میرے گاہک کو دوسرا دکان دار توڑتا ہے تو میں دوسرے دکان دار کے گاہک کو کیوں نہیں توڑ لیتا" دکان دار نے معاملہ کو گہرائی کے ساتھ دیکھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر میری ناکامی کا بنیادی سبب کیا ہے۔ وہ اس رائے پر پہنچا کہ اس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ گاہکوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے بات نہیں کرتا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی اس کمزوری کو دور کرے گا۔

اس نے اپنے اوپر قابو پانا شروع کیا۔ اب کوئی گاہک اس کی دکان پر آتا تو وہ نہایت میٹھے انداز میں بولنے کی کوشش کرتا۔ دھیرے دھیرے اس کا بولنے کا انداز بدل گیا اور اسی کے ساتھ اس کی دکان کی حالت بھی۔ اس نے جب یہ کیا کہ اپنے اندر کی بنیادی کمزوری دور کر لی تو بقیہ کمیاں اپنے آپ دور ہوتی چلی گئیں۔

حواس نہ کھوئیے

"اعتماد زندگی ہے اور بے اعتمادی موت"، پرم ہنس کے اس قول کی تشریح ملکۂ برطانیہ کے ایک واقعہ سے بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔

لندن میں بکنگھم پیلیس ملکۂ الزبتھ کی شاہی قیام گاہ ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۸۲ کو یہ واقعہ ہوا کہ ایک اجنبی شخص ملکۂ برطانیہ کے سونے کے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ایش ٹرے تھی۔ جو دھار دار آلے کا کام کر سکتی تھی۔ یہ امکانی طور پر ایک خطرناک ہتھیار تھا۔ ملکہ نے جب اچانک ایک غیر شخص کو ایسی حالت میں کمرے میں پایا تو ان کو خطرہ کا احساس ہوا۔ ملکہ کا ہاتھ فوراً مخصوص بٹن پر پہنچ گیا۔ یہ محل کی ایک خاص گھنٹی ہے جو خطرہ کے وقت حفاظتی عملہ کو خبردار کرنے کے لئے بجائی جاتی ہے۔ ملکہ نے بٹن بار بار دبائی مگر گھنٹی خاموش تھی۔ کسی سبب سے وہ بج نہ سکی۔

یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ملکہ ایک تنہا خاتون کی حیثیت سے کمرے میں تھیں۔ دوسری طرف ایک طاقت ور مرد دھار دار آلہ لئے کھڑا تھا۔ ملکہ اگر آنے والے آدمی پر بگڑ جاتیں یا اس کو نکل جانے کا زبانی حکم دیتیں

تو وہ فوراً غصہ میں آکر ٹوٹ پڑتا اور ملکہ کا کام تمام کر دیتا۔ مگر ملکہ نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ انھوں نے اپنی قوتوں کو سنبھالا اور آنے والے آدمی سے نرمی کے انداز میں بات شروع کر دی۔ ملکہ نے اجنبی آدمی کو سگرٹ پیش کی اور اپنی ٹھنڈی باتوں سے اس کی توجہ دوسری طرف موڑ دی۔ انھوں نے نہ تو آدمی کو برا بھلا کہا اور نہ محل کے اندر بلا اجازت گھس آنے پر کوئی تنبیہ کی۔ اس طرح انھوں نے اجنبی آدمی کو دس منٹ تک ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول رکھا۔ اتنی دیر میں محل کے حفاظتی آدمی پہنچ گئے اور مذکورہ شخص گرفتار کر لیا گیا۔

ملکہ برطانیہ کی خود اعتمادی نے ان کو ایک بڑے خطرے سے بچا لیا۔ اگر وہ اعتماد کھو دیتیں تو شاید اگلے دن برطانی قوم اپنی ملکہ کا ماتمی دن منانے کی تیاریاں کر رہی ہوتی۔

نازک وقت میں اپنے اعتماد کو بحال رکھنا اور اپنے دماغ کو حاضر رکھنا بے حد اہمیت رکھتا ہے خطرہ کے وقت گھبرا اٹھنا اپنے معاملہ کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑ لینا ہے۔ آدمی اگر حوصلہ نہ کھوئے اور اپنے ہوش و حواس کو درست رکھے تو یقیناً وہ بچ جائے گا۔ اس کا دماغ ایسی تدبیر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گا جو اس کو خطرے کے کنارے پہنچ کر بھی خطرہ سے بچا لے۔

ڈاکٹر ہیوگو کا قول ہے کہ احتیاط دانش مندی کی سب سے ہونہار اولاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی بہت سی کامیابیوں کا تعلق محتاط عمل میں ہے نہ کہ پرجوش اقدام میں۔ عقل مندی کے بہت سے پہلو ہیں اور اس میں شک نہیں کہ احتیاط اکثر اوقات سب سے بڑی عقل مندی ہوتی ہے۔ مگر احتیاط کے طریقہ پر پوری طرح وہی شخص عمل کر سکتا ہے جو حالات کی شدت کے باوجود اپنے حواس کو بحال رکھے جو کسی بھی صورت میں مغلوب الحال نہ ہو جائے۔

جب بھی آدمی کے ساتھ کوئی خلاف امید صورت پیش آتی ہے یا وہ کسی خطرہ میں گھر جاتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بے سوچی سمجھی کارروائی شروع کر دیتا ہے۔ اس قسم کی کارروائی آدمی کو مزید بربادی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچاتی۔ اگر آدمی ہمت نہ ہارے اور گھبرائے بغیر اپنے عمل کا نقشہ بنائے تو وہ ہر مشکل صورت حال سے بآسانی باہر آ سکتا ہے۔ حتیٰ کہ شیکسپیر (۱۶۱۶-۱۵۶۴) کے الفاظ میں اکثر اوقات وہ مسکراہٹ سے وہ چیز حاصل کرے گا جس کو وہ تلوار کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

(نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۶-۱۷ اگست ۱۹۸۲ کو نشر کی گئی۔

تعمیر کی طاقت

چینی مفکر کنفیوشش کا قول ہے۔ "ایک چھوٹا چراغ روشن کرنا اس سے بہتر ہے کہ تم تاریکی کو برا کہو۔" کیونکہ تاریکی کو برا کہہ کر ہم تاریکی کو دور نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم اگر تاریکی میں ایک چراغ جلا دیں تو تاریکی اپنے آپ جاتی رہے گی۔

رات نے اگر آپ کے چاروں طرف اندھیرا پھیلا دیا ہو تو اس کے خلاف لفظوں کا طوفان اٹھا کر آپ اس سے نجات نہیں پا سکتے۔ البتہ اگر آپ ایک شمع حاصل کر کے اس کو جلا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ رات کے باوجود آپ کا ماحول روشن ہو گیا ہے۔

برائی کو ختم کرنا ہے تو بھلائی کا آغاز کر دیجئے۔ آپ کو لوگوں کی طرف سے بدسلوکی کا تجربہ ہو تو آپ ان سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آئیے۔ لوگ ظالم بنے ہوئے ہوں تو آپ انصاف کرنا شروع کر دیجئے لوگ آپ کے ساتھ امتیاز برت رہے ہوں تو آپ اس پر صبر کر کے اپنی کمیوں کی تلافی میں لگ جائیے۔ لوگ آپ کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنائے ہوئے ہوں تو آپ ان کو نظر انداز کر کے اپنے اصل کام میں مصروف ہو جائیے۔ یہی کسی مسئلہ کو حل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا جتنے طریقے ہیں وہ مسئلہ کو الجھانے والے ہیں نہ کہ مسئلہ کو حل کرنے والے۔

ایک مسلم نوجوان ایک مسجد میں امام مقرر ہوئے۔ اس مسجد کے بارہ میں مشہور تھا کہ یہاں کوئی امام ٹھہرتا نہیں۔ وہاں جتنے امام آئے سب تھوڑے تھوڑے دن کے بعد بیزار ہو کر چلے گئے۔ مسجد کے لوگ اماموں کو بہت کم تنخواہ دیتے تھے۔ ان کو عزت کی نظر سے تو دیکھنے کا سوال ہی نہ تھا۔

نوجوان کے اندر تعمیری مزاج تھا۔ اس نے سوچا، میرے پیش رو جو چیز مطالبہ کے ذریعہ حاصل نہ کر سکے، میں اس کو انشاء اللہ عمل کے ذریعہ حاصل کروں گا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ وہ نہ صرف اپنے مقررہ فرائض کو بحسن و خوبی ادا کرے گا۔ بلکہ فرائض سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ مسجد کی صفائی کا پہلے سے زیادہ اہتمام کرتا۔ مسجد سے ملی ہوئی زمین پہلے خالی پڑی رہتی تھی اب اس نے اس کی صفائی کر کے وہاں سبزی اور پھول لگا دیئے اور آبپاشی اور محنت کر کے اس کو سبزہ زار بنا دیا۔ محلہ کے لڑکے جو صبح و شام کھیل کود میں رہتے تھے ان کو مسجد میں بلا کر پڑھانا شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ لوگوں کی تلخ باتوں کا جواب بھی میٹھے انداز میں دیتا۔ وہ لوگوں کی بدسلوکی کے باوجود ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا۔

اس قسم کے کاموں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مسجد والوں کے دل جیت لئے۔ لوگ اس سے اتنا خوش ہوئے کہ اپنے آپ اس کی تنخواہ بڑھادی۔ اس کو کثرت سے تحفے تحائف ملنے لگے۔ ہر آدمی اس کو عزت کی نظر سے دیکھنے لگا۔ لوگوں کی خواہش ہوئی کہ اس کے لئے ایسا انتظام کریں کہ وہ یہاں مستقل رہنے لگے۔ یہاں سے چھوڑ کر کہیں اور نہ جائے۔ چنانچہ اس کے لئے مسجد سے متصل ایک رہائشی کوارٹر بنادیا گیا تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو وہاں لائے اور دل جمعی کے ساتھ وہاں رہے۔

زندگی کا یہی راز ہے جس کو شیکسپیر نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے — تمہیں کیا چاہئے، جو کچھ بھی تمہیں چاہئے اس کو مسکراہٹ کی طاقت سے حاصل کرو نہ کہ تلوار کی طاقت سے"۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے محض وقتی جذبات کے تحت کام کرتے ہیں۔ اگر وہ سوچ سمجھ کر کام کریں تو انہیں معلوم ہو کہ وہ جو کچھ "تلوار" کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کو وہ "مسکراہٹ" کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔

آدمی کو بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ پیسہ اور اخلاق۔ پیسہ آپ کو آپ کی ضرورتیں دیتا ہے اور اخلاق آپ کو لوگوں کے درمیان اچھی طرح رہنے کے قابل بناتا ہے۔ آدمی کو اگر اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیسہ چاہئے تو اسی کے ساتھ اس کو لوگوں سے اچھا نباہ کرنے کے لئے اچھا اخلاق بھی چاہئے۔ مگر اکثر آدمی پہلی چیز حاصل کرنے کے لئے محنت کرتے ہیں اور دوسری چیز حاصل کرنا بھول جاتے ہیں۔ چین کی ایک کہاوت میں ان دونوں چیزوں کی اہمیت کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے —— "اگر تمہارے پاس دو پیسے ہوں تو ایک سے روٹی خریدو اور دوسرے سے پھول۔ روٹی تمہیں زندگی دے گی اور پھول تم کو جینے کا فن سکھائے گا"۔

زندگی کا معرکہ

"سب کچھ لٹ جانے پر بھی مستقبل باقی رہتا ہے" بودی کا یہ قول زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بیان کر رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے امکانات لٹ گئے ہوں تو وہ یقینی طور پر ماضی کے امکانات ہوں گے نہ کہ مستقبل کے امکانات۔ آدمی خواہ کتنا ہی زیادہ برباد ہو جائے۔ بہر حال اس کی بربادی اس کے ماضی کی بربادی ہوتی ہے۔ اس کا مستقبل پھر بھی پوری طرح اس کے لئے موجود ہوتا ہے۔ وہ مستقبل کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر کے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی کامیاب زندگی پا سکتا ہے۔

کسی حادثہ سے دوچار ہونے کے بعد اگر آدمی یہ کہہ سکے کہ میں نے "ماضی کو کھویا ہے مگر میں نے مستقبل کو نہیں کھویا" تو گویا کہ اس نے جو چیز کھوئی تھی اس سے بھی زیادہ بڑی چیز اس نے دوبارہ پالی۔

کیوں کہ اس کا یہ احساس اس کو ایک نیا آغاز عطا کرتا ہے ، اور اس دنیا میں حقیقی آغاز ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

رابرٹ کولیئر نے نہایت صحیح کہا ہے کہ "انسان کی سب سے اچھی دوست اس کی دس انگلیاں ہیں"۔ دس انگلیوں سے اس کی مراد آدمی کے دو ہاتھ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آدمی کے دو ہاتھ جن میں اس کی دس انگلیاں ہیں ، یہ اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا تمام سونا بھی ان کی قیمت نہیں۔ آدمی جب اپنا باہر کا اثاثہ کھو چکا ہو ، اس وقت بھی اس کی دس انگلیاں اس کے پاس پوری طرح موجود ہوتی ہیں۔ انہیں انگلیوں اور انہیں دونوں ہاتھوں سے اس نے پایا تھا جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا۔ اب دوبارہ وہ ان کو استعمال کرکے پھر وہی چیز پا سکتا ہے جس کو اس نے پہلے حاصل کیا تھا اور پھر اس نے ان کو کھو دیا۔

مسٹر جے سی ملک ایک فوجی پائلٹ تھے۔ انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں فائٹر پائلٹ (ہندستان ٹائمس ۵ مئی ۱۹۸۲) کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فوجی پائلٹ جب ایک جنگی جہاز لے کر اڑتا ہے تو یہ اس کے لئے گویا موت کی طرف سفر کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اس کا آواز سے تیز رفتار جہاز اتنی بلندی پر اڑتا ہے جہاں عملاً مہیب خلا کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنا سارا سفر مشین کے اعتماد پر کرتا ہے۔ وہ یا تو اپنا کام کرکے دوبارہ اپنے سابقہ مقام پر واپس آجاتا ہے یا دشمن کا نشانہ بن کر ختم ہو جاتا ہے۔

فوجی پائلٹ کے اس جوکھم کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر ملک نے ایک بڑا سبق آموز جملہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پائلٹ کے اندر اس وقت جو آدمی ہے وہ ڈر کو جانتا ہے مگر اس کے اندر جو کارکن ہوا باز ہے اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے تیار کر رکھا ہے کہ وہ اس پر قابو پا سکے :

The man in him knows fear. But the professional pilot in him has taught and trained himself to master it

یہ بات جو مضمون نگار نے فوجی پائلٹ کے بارے میں کہی ہے وہی زندگی کے عام معرکہ کے لئے بھی صحیح ہے۔ زندگی ایک سخت معرکہ ہے جس کا سامنا ہر آدمی کو کرنا پڑتا ہے۔ انسان کی کمزوریاں اس کو ڈراتی ہیں۔ اس کے بظاہر ناموافق حالات اس کو بے ہمت کرتے ہیں۔ لیکن آدمی کو اگر زندگی کا معرکہ جیتنا ہے تو اس کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالے ، مشکلات سے گھبرانے کے بجائے وہ مشکلات پر فتح حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

"حافظ پیچھے دیکھتا ہے اور امید آگے" رام چندر ٹنڈن کا یہ قول اسی حقیقت کو ایک اور انداز سے بیان کرتا ہے۔ ڈریا نا امیدی دراصل حافظ کا ایک معاملہ ہے۔ ہمارے ذہن میں جو پچھلی یادیں چھپی ہوئی ہیں ان میں سے کسی یاد کو ہم اپنے ساتھ جوڑ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ صورت جو فلاں کے ساتھ پیش آئی تھی وہ ہمارے ساتھ بھی نہ پیش آجائے۔ اگر ہم پچھلی یادوں کو نظرانداز کر کے آگے کے امکانات پر اپنے ذہن کو جمادیں تو معلوم ہوگا کہ جہاں ہم صرف خطرہ دیکھ رہے تھے وہیں ہمارے لئے ایک نیا شاندار، امکان چھپا ہوا تھا۔ کسی نے صحیح کہا ہے" ہر خاتمہ ایک نئے امکان کا آغاز ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس راز کو جانتے ہوں۔

ایک مقولہ ہے کہ ہوائیں اکثر اوقات اس رخ کے خلاف چلتی ہیں جو کہ کشتیاں چاہتی ہیں (الریاح فی معظم الاحیان تجری علیٰ خلاف ماتریدہ السفن)

زندگی ایک ناہموار سفر ہے۔ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے باہر کے حالات بالکل ویسے ہی ہوں جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حالات آپ کے ساتھ موافقت نہیں کرتے۔ آپ کو اپنی زندگی کا سفر حالات سے لڑ کر طے کرنا ہوتا ہے۔

زندگی کی مثال دندانہ دار پہیہ (cog wheel) کی ہے۔ ایک دندانہ انسان کا ہے اور دوسرا دندانہ قدرت کا۔ جب تک قدرت کا پہیہ نہ چلے، انسان کا پہیہ نہیں چل سکتا۔

انسان جو کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ان کو محض اپنی ذاتی کوشش سے حاصل نہیں کرسکتا۔ ذاتی کوشش کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ باہر کے اسباب اس کے ساتھ موافقت کریں۔ گویا کہ موجودہ دنیا میں کسی کامیابی کو پانے کے لئے بیک وقت دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک، آدمی کی اپنی ذاتی محنت، دوسرے، باہر کے حالات کی موافقت۔

آدمی کو یقیناً اپنے آپ پر قابو حاصل ہے۔ مگر خارجی اسباب پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ ایسی حالت میں موجودہ دنیا میں کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ یہ کہ ہم اپنی زندگی کا منصوبہ بناتے ہوئے خارجی اسباب کا بھی ضرور لحاظ رکھیں۔ خشکی پر چلنے کی قوت رکھتے ہوئے سمندر میں چھلانگ نہ لگائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالات سے ہم آہنگی کر کے اپنا راستہ نکالنے کا نام کامیابی ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ حالات سے لڑ کر اپنا راستہ نکالنے کو کامیابی کا راز سمجھ لیتے ہیں۔

(نوٹ) یہ تقریر ۱۰-۱۱ دسمبر ۱۹۸۲ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

استقلال کی اہمیت

ایک بڑے تاجر کا قول ہے "کاروبار کو بار بار بدلنا کاروبار میں خود اپنے ہاتھ سے آگ لگانا ہے۔"
جب کوئی شخص اپنے کاروبار کو بدلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنی سابقہ تاریخ سے کاٹ دیتا ہے۔ پھر جو شخص خود ہی اپنی تاریخ سے اپنے آپ کو کاٹتا رہے اس کے پاس کیا چیز باقی رہے گی جو اس کا سرمایہ بن سکے۔

کاروبار ملازمت کی طرح نہیں کہ ایک مہینہ کام کیا تو پہلی تاریخ کو اس کی تنخواہ مل گئی۔ کاروبار ایک درخت کی مانند ہے جو سالوں کے بعد اپنے پھل دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ ایک درخت لگائے اور سال بھر کے بعد اس کو کاٹ کر دوسرا درخت لگائے اور اگلے سال تیسرا درخت۔ اسی طرح وہ پچیس سال تک کرتا رہے تو پچیس سال کی لمبی مدت گزارنے کے باوجود ایسا آدمی پھل دار درخت کا مالک نہ بن سکے گا۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ہرا بھرا باغ مقدر نہیں۔

کسی شخص کے لئے پھل دار درخت حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ ایک درخت لگائے۔ اور اسی ایک درخت کو برابر بڑھاتا رہے۔ وہ ایک ہی درخت پر اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس کے بعد جب مدت پوری ہوگی تو اس کا درخت بڑھ کر ایک پورا پھل دار درخت بن جائے گا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر ایک کاروبار شروع کرے اور پھر پوری طرح اس میں لگ جائے۔ وہ کسی حال میں نہ اپنے کاروبار کو چھوڑے اور نہ اس کو بدلے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ایک نہ ایک وقت کامیاب ہو کر رہے گا۔ گوئٹے نے سچ کہا ہے "جس شخص کے اندر اٹل اور مستحکم ارادہ ہے وہ دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔"

آپ اپنے آس پاس کے لوگوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ کام کرنے والے تو بہت ہیں مگر کامیاب ہونے والے بہت کم۔ اس کی وجہ اکثر حالات میں عدم استقلال ہوتا ہے۔ جو لوگ استقلال کا ثبوت دیتے ہیں وہ کامیاب رہتے ہیں اور جو لوگ استقلال کا ثبوت نہیں دے پاتے وہ ناکام ہو جاتے ہیں۔ استقلال کا نہ ہونا کسی کو پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور استقلال کا ہونا کسی کو زندگی میں اعلیٰ درجات تک لے جاتا ہے۔

کسی مفکر نے سچ کہا ہے کہ "لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادے کی۔"
طاقت اور صلاحیت اکثر لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اور سب لوگ اپنی طاقت اور صلاحیت کو استعمال

بھی کرتے ہیں۔ مگر بڑی کامیابی بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بڑی کامیابی مستقل ارادہ مانگتی ہے۔ اور یہی وہ امتحان ہے جس میں اکثر لوگ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ شروع کرنے کو تو ہر آدمی کوئی نہ کوئی کام شروع کر دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ زیادہ دیر تک اپنے کام کو جاری نہیں رکھ پاتے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ان کو زندگی میں ناکام بنا دیتی ہے۔

ترقی اور خوشحالی مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا دوسرا نام ہے۔ زندگی ایک ایسا مقابلہ ہے جس میں ٹھہرنا بھی گویا پیچھے ہٹنا ہے۔ اور جو شخص ایک بار پیچھے ہو گیا اس کو دوبارہ آگے بڑھنے کے لئے کئی گنا زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ آگے بڑھنا چلنا ہے۔ اور آگے نہ بڑھنا تھک کر بیٹھ جانا۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ "قدم پیچھے نہ ہٹانے والا ہی خوش حالی کو فتح کرتا ہے"۔

اس دنیا میں نتیجہ ہمیشہ اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو نتیجہ کی پروا کئے بغیر اپنا عمل برابر جاری رکھے۔ جس کی نظر ہر وقت نتیجہ پر ہو وہ بہت جلد مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا۔ وہ استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔ جس شخص کا یہ حال ہو کہ عمل ہی اس کے لئے لذت بن جائے۔ دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ اپنے عمل میں لگا رہنا جس کو کافی نظر آئے وہ مستقل عمل پر قائم رہے گا۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کامیاب ہوگا۔ یہی بات ہے جو مہابھارت کے ایک کردار کی زبان سے ان لفظوں میں ادا ہوئی ہے۔ "پھل کی خواہش کئے بغیر اپنا عمل کر"

برداشت کیجئے

شیلر نے کہا ہے "نفسانی خواہشات کا جنون تھوڑی دیر رہتا ہے مگر اس کا پچھتاوا بہت دیر تک" یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بڑی بڑی حماقتیں وقتی جذبہ کے تحت ہوتی ہیں۔ جب وقتی جذبہ ختم ہو جاتا ہے تو زندگی بھر آدمی افسوس کرتا رہتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اعتدال کی حالت میں آدمی خود ہی یہ مان لیتا ہے کہ بے اعتدالی کی حالت میں اس نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔

میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی۔ وہ فوجداری کے مقدمات کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اپنی قانونی پریکٹس کے دوران میرا تعلق بہت سے قاتلوں سے ہوا۔ میں نے پایا کہ ہر قاتل اپنے قاتلانہ فعل پر شرمندہ تھا۔ وکیل صاحب نے کہا کہ قتل ہمیشہ وقتی جذبہ کے تحت ہوتا ہے۔ وقتی جوش میں آکر ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار ڈالتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو ہوش آتا ہے تو ساری زندگی وہ پچھتاتا رہتا ہے۔ اس کا ضمیر ہمیشہ اس سے یہ کہتا ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ قاتل کی بعد کی زندگی ایک ایسی سزا ہوتی ہے جو اس کے ضمیر کی عدالت نے خود اس کے اوپر

نافذ کیا ہو۔

جب بھی آپ پر اس قسم کا جذبہ سوار ہو تو فوری کارروائی سے رک جائیے۔ آپ کا رکنا ہی آپ کی اصلاح بن جائے گا۔ شام کے وقت اگر آپ پر جذبہ طاری ہوا اور آپ کسی طرح اقدام سے بچ کر اپنے کو بستر پر پہنچا دیں تو اگلے دن جب آپ سو کر اٹھیں گے تو آپ کا جذبہ ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔ آپ کو خود یہ سوچ کر تعجب ہوگا کہ کل آپ کا کیا حال ہو گیا تھا۔

انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے "انتقام کی پلیٹ ٹھنڈی کر کے کھا"، آپ کے سامنے کھانا آئے اور وہ زیادہ گرم ہو۔ ایسی حالت میں اگر آپ فوراً اس کو کھانے لگیں تو کیا ہوگا۔ خود آپ کا منھ جل جائے گا۔ ہر عقلمند آدمی ایسے گرم کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھانا پسند کرے گا۔ یہی طریقہ ہم کو روزمرہ کی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انتقام کی آگ بجھا کر ہم کو لوگوں سے معاملہ کرنا ہے۔ اگر کسی کے اوپر آپ کو غصہ آجائے تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے۔ اس کے بعد سوچئے کہ آپ کو اپنے فریق کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے منفی ذہنیت کے ساتھ کوئی شخص نہ صحیح طور پر سوچ سکتا اور نہ صحیح طور پر یہ فیصلہ کر سکتا کہ اسے فی الحقیقت کیا کرنا چاہیئے۔

اسی بات کو شکسپیئر نے ان لفظوں میں کہا ہے "اپنے دشمن کے لئے اپنی بھٹی کو اتنا گرم نہ کر کہ وہ خود تجھ کو بھون ڈالے"۔ ظاہر ہے کہ جنون کی آگ سب سے پہلے آدمی کے اپنے اندر بھڑکتی ہے۔ اگر آدمی اپنے اندر تیز آگ بھڑکا لے تو دوسرے تک اس کا اثر بعد کو پہنچے گا۔ آدمی اس سے پہلے اپنے آپ کو جلا لے گا۔ پھر آپ ایسی حرکت کیوں کریں جس کا نقصان دوسرے تک پہنچانا مشتبہ ہو مگر خود اپنی ذات کو یقینی طور پر اس کا نقصان پہنچنے والا ہو۔ اگر آپ کو اپنے آپ سے محبت ہے تو یہی کافی ہے کہ آپ دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔

اس دنیا میں اپنے آپ سے محبت کا راز بھی یہی ہے کہ آدمی دوسروں سے محبت کرے۔ جو شخص دوسروں سے نفرت میں مبتلا ہو جائے وہ خود اپنے لئے ہر طرف نفرت کے کانٹے بکھیرے گا۔ لوگوں کے درمیان خود اپنے لئے سکون کے ساتھ رہنے کو ناممکن بنا دے گا۔ نفرت پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنا یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی معتدل حالت میں نہیں ہے۔ بائرن نے صحیح کہا ہے "نفرت دل کا پاگل پن ہے"، دماغی پاگل پن یہ ہے کہ آدمی ہوش کھو دے۔ دل کا پاگل پن یہ ہے کہ آدمی سنجیدگی اور اعتدال کھو دے۔ کوئی شخص دماغی پاگل پن کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح دل کا پاگل پن بھی اس قابل ہے کہ آدمی اس سے دور رہے۔ (آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۲-۴ دسمبر ۱۹۸۲ء کو نشر کیا گیا)

کامیابی اپنے ہاتھ میں

تھامس فلر کا قول ہے" پرندے اپنے پاؤں کے سبب سے جال میں پھنستے ہیں اور انسان اپنی زبان کے سبب سے"، انسان کی زبان اگرچہ بظاہر اس کے جسم کا بہت کمزور حصہ ہے مگر زندگی میں اس کا رول بے حد اہم ہے۔ زبان سے بولے ہوئے چند الفاظ آدمی کو مصیبت میں پھنسا دیتے ہیں اور زبان سے بولے ہوئے دوسرے قسم کے کچھ الفاظ اس کو مصیبت سے بچا لیتے ہیں۔

ایک شخص ایک کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ کارخانہ کا مالک اس کو بہت مانتا تھا۔ وہ اس کی صلاحیتوں کا بہت قدرداں تھا۔ ایک بار کارخانہ میں پیسہ کی کمی پڑ گئی۔ مالک نے بڑی مشکل سے کارکنوں کی تنخواہیں دیں۔ تاہم اس نے مذکورہ شخص کی تنخواہ روک لی۔ کئی مہینے اسی طرح ہوا۔ اس" امتیازی سلوک" پر وہ شخص بگڑ گیا۔ ایک روز مالک سے مل کر اس کو سخت سخت باتیں سنائیں۔

یہ برہمی اس شخص کے حق میں الٹی ثابت ہوئی۔ مالک نے اس کو اپنا سمجھ کر ایسا کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پیسہ آنے پر وہ نہ صرف اس شخص کو پوری تنخواہ دے گا بلکہ اس میں اضافہ کر دے گا۔ مگر زبان کے غلط استعمال نے دونوں کے درمیان نفرت پیدا کر دی۔ محبت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ مالک نے اس کی زبان درازی کی یہ سزا دی کہ اس کی تنخواہ مزید روک دی اور کارخانہ سے بھی اس کو نکال دیا۔ اس کے بعد کئی سالوں تک دونوں کے درمیان مقدمہ بازی ہوتی رہی۔ اگر وہ چپ رہتا تو وہ فائدہ میں رہتا مگر بول کر اس نے صرف نقصان اٹھایا۔

اس آدمی کو یہ غیر ضروری نقصان صرف اس لئے ہوا کہ وہ اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک مغربی کہاوت ہے کہ" دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کو اپنے لئے پسند کر لو"۔ زندگی میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کامل برائی اور کامل بھلائی کے درمیان انتخاب کا موقع ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ایک برائی اور دوسری برائی کے درمیان انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ آدمی کے سامنے ایک طرف وقتی مسئلہ تھا اور دوسری طرف مستقل مسئلہ۔ اس نے وقتی مسئلہ کو برداشت نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو مستقل نقصان برداشت کرنے پر راضی ہونا پڑا۔

ایک ہندی شاعر نے کہا ہے" چوٹ سہے جو شبد کی وائے گرو میں داس" لفظ کی چوٹ میں نہ خون بہتا اور نہ پاؤں ٹوٹتا مگر آدمی کے لئے وہ لاٹھی اور بھالے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اکثر آدمیوں کا حال یہ ہے کہ وہ لفظ کی نفسیاتی چوٹ کو سہہ نہیں پاتے۔ اس لئے انھیں بڑے بڑے عملی نقصانات سہنے پڑتے ہیں۔

آدمی اگر لفظ کی چوٹ برداشت کرلے تو وہ نارمل حالت میں رہتا ہے، وہ اپنی حاضر دماغی کو نہیں کھوتا۔ اس بنا پر وہ اس پوزیشن میں رہتا ہے کہ وہ زیادہ بہتر طور پر اپنے مسئلہ کے حل کی تدبیر سوچ سکے۔ وہ لفظ کی چوٹ سہہ کر زیادہ کامیابی کے ساتھ وہ چیز حاصل کرلیتا ہے جس کو وہ لفظ کی چوٹ نہ سہہ کر حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ حاصل نہ کرسکا۔

بوکر واشنگٹن امریکہ کا مشہور نیگرو گزرا ہے۔ ایک روز اس کو ایک ٹرین پکڑنی تھی۔ اس کو گھر سے نکلنے میں دیر ہوگئی وہ تیزی سے سڑک پر آیا تاکہ کسی سواری کے ذریعہ جلد از جلد اسٹیشن پہنچ سکے۔ وہ ایک گھوڑا گاڑی کے پاس آیا اور ڈرائیور سے کہا کہ میرے پاس وقت کم ہے تم مجھے فوراً اسٹیشن تک پہنچا دو ڈرائیور نے اس کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں نے آج تک کسی کالے آدمی کے لئے اپنی گاڑی نہیں چلائی میں تم کو نہیں لے جاسکتا۔

بوکر واشنگٹن نے کہا: " ٹھیک ہے۔ تم پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ، میں گاڑی چلانے کا کام کروں گا۔" یہ سن کر ڈرائیور حیرانی میں پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بوکر واشنگٹن گھوڑے کو ہانکتا ہوا اسٹیشن لے گیا اور گاڑی پکڑلی۔

زرتشت نے کہا ہے کہ " بھلائی کرنا فرض نہیں فائدہ ہے کیوں کہ بھلائی تمہارے سکھ میں اضافہ کرتی ہے" یہ ایک حقیقت ہے کہ بھلائی کر کے آدمی خود اپنے آپ کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بوکر واشنگٹن اگر برے الفاظ کے جواب میں برے الفاظ بولتا تو وہ اپنے مسئلہ کو اور زیادہ مشکل بنالیتا۔ کیوں کہ اس کے برے الفاظ گاڑی والے کو برہم کردیتے اور وہ زیادہ شدت کے ساتھ اس کو اسٹیشن لے جانے سے انکار کردیتا مگر بوکر واشنگٹن نے جب برے الفاظ کا جواب بھلے الفاظ سے دیا تو دوسرا آدمی بھی نرم پڑ گیا۔ پہلے اس کا دل جس خدمت کے لئے تیار نہ تھا اب اس نے اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے آمادہ پایا۔

پاؤں ٹوٹنے کے بعد بھی

" جو آدمی ارادہ کرسکتا ہے اس کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں" ایمرسن کا یہ قول زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں انسان کے لئے امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اگر آدمی کے اندر سچے ارادہ کی طاقت ہو تو وہ ہر مشکل کو آسان کرلے گا۔ راستے کی ہر رکاوٹ اس کے لئے اپنی منزل تک پہنچنے کا زینہ بن جائے گی۔

امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثالیں پوری انسانی تاریخ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں ہم ایک تازہ اور جیتی جاگتی مثال پیش کریں گے۔

سودھا چندرن جنوبی ہند کی ایک رقاصہ ہے۔ وہ سولہ سال کی تھی کہ ۲ مئی ۱۹۸۱ کو ایک حادثہ میں اس کا دایاں پاؤں ٹوٹ گیا۔ وہ فوری طور پر ایک مقامی اسپتال میں داخل کردی گئی۔ وہاں ڈاکٹروں سے یہ غلطی ہوئی کہ اینٹی ٹٹنس انجکشن اور دوسری ضروری احتیاطوں کے بغیر اس کے پاؤں پر پلاسٹر باندھ دیا گیا۔ چند دن بعد تکلیف بڑھی تو اس کے والدین اس کو مدراس لے گئے اور ایک بڑے اسپتال میں داخل کیا وہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کو ٹٹنس کا اثر ہوچکا ہے۔ کافی کوشش کے باوجود افاقہ نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اس کا پاؤں پنڈلی کے نیچے سے کاٹ دیا گیا۔

کسی کا قول ہے "محبت ہر رکاوٹ کو دور کردیتی ہے" یہ قول سودھا چندرن کے معاملہ میں لفظ بلفظ صحیح ثابت ہوا۔ اس کو رقص سے بے پناہ محبت تھی۔ پاؤں کٹنے کے بعد اس کا یہ حال ہوا کہ وہ روتی تھی اور کہتی تھی کہ میں تو رقص کرنا چاہتی ہوں، کیا میں دوبارہ رقص کرسکوں گی:

I want to dance. Will I dance again?

اس کے بعد اسپتال میں اس کے ساتھ وہی کیا گیا جو ہر ایسے مریض کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا پاؤں پنڈلی کے پاس سے کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ جدید طرز کا مصنوعی پاؤں (جے پور فوٹ) لگا دیا گیا۔ ڈاکٹر پی کے سیٹھی (جنھوں نے جے پور فوٹ ایجاد کیا ہے) کی ملاقات سودھا چندرن کے استاد سے ہوئی۔ انھوں نے ڈاکٹر سیٹھی سے اپنے شاگرد کے شوق کا حال بتایا۔ انھوں نے جواب دیا کہ سودھا کے اندر اگر واقعۃً خواہش ہے تو وہ ایک عام آدمی کی طرح رقص کرنے کے قابل ہوجائے گی۔ اس کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ کچھ زیادہ محنت کرے اور ابتدائی تکلیف کو برداشت کرلے:

Sudha would be able to dance like any one with normal limbs. Only one had to be tough to put in the extra effort and bear initial pain.

یہاں دوبارہ سودھا چندرن کے لئے کسی مفکر کا یہ قول صحیح ثابت ہوا ــــــ "تکلیف ہماری خوشیوں کی قیمت ہے۔ جو شخص تکلیف کو برداشت کرلے وہ خوشی کو بھی ضرور پاکر رہے گا"

سودھا چندرن کو ڈاکٹر سیٹھی کی بات بتائی گئی تو وہ فوراً اس کے لئے تیار ہوگئی کہ وہ "ابتدائی تکلیف" کو برداشت کرے گی۔ اس نے کوشش شروع کردی۔ وہ اپنے مصنوعی پاؤں پر مشق کرتی رہی یہاں تک کہ وہ دوبارہ کامل رقاصہ بن گئی۔

سودھا چندرن نے یکم اپریل ۱۹۸۴ کو بمبئی میں اپنے رقص کا مظاہرہ کیا۔ وہاں رقص کے ماہرین موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ سودھا چندرن نے اتنا کامیاب رقص کیا کہ ان کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ

اس کے دونوں پیروں میں سے کون سا پیر فطری ہے اور کون سا مصنوعی (ناردرن انڈیا پتریکا ۲۲ اپریل ۱۹۸۴) ـــــــــــ رقص جیسے حقیر مقصد کے لئے ایک عورت نے اتنی غیر معمولی جدوجہد کی۔ پھر جو لوگ حق و صداقت جیسی برتر چیز کو اپنا مقصد بنائیں اس کے لئے ان کی جدوجہد تو اس سے بھی زیادہ ہونی چاہئے۔

"زیادہ دشواری کو حل کرنے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ زیادہ محنت ہے" کسی کا یہ قول محض قول نہیں بلکہ زندگی کی ایک سادہ حقیقت ہے۔

جو شخص زندگی میں کسی رکاوٹ سے دوچار ہو جائے وہ بھی اسی طرح کامیاب زندگی حاصل کر سکتا ہے جیسے بے رکاوٹ والے لوگ حاصل کرتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ عام حالات سے کچھ زیادہ محنت کے لئے تیار ہو جائے اور ابتدائی مشقتوں کو برداشت کر لے۔

حالات سے مطابقت

ہر برٹ نکولس (Herbert L. Nicholas) نے لکھا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں ایک بار ایک بوڑھے آدمی کا قصہ پڑھا جو ساری زندگی مسلسل سخت تکلیفوں میں مبتلا رہا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن رہتا تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہارے سکون و اطمینان کا راز کیا ہے تو اس نے جواب دیا:

I learned to cooperate with the inevitable

میں نے ان چیزوں سے موافقت کرنا سیکھ لیا جن سے بچنا ممکن نہیں۔

زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں پیش آتی ہیں جو ہمارے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں سے مقابلہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس طرح ہم غیر ضروری الجھن اور ذہنی تناؤ (Tension) سے بچ سکتے ہیں۔ یہ طریقہ ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم اپنی قوتوں کو وہاں خرچ کریں جہاں کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ اپنی قوتوں کو وہاں ضائع نہ کریں جہاں بالآخر وہ صرف بے نتیجہ ہو کر رہ جانے والی ہیں۔

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کا اصول ہے۔ یہ اصول کسی ایک شخص کے لئے بھی کارآمد ہے اور پوری قوم کے لئے بھی۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۵-۱۶ مئی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

موقع نہ کھوئیے

" زندگی میں کامیاب ہونے کا راز یہ ہے کہ آدمی ہر آنے والے موقع کے لئے تیار رہے"
ڈزرائیلی کا یہ قول موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے۔ دنیا میں کامیابی حقیقۃً اس کا نام ہے کہ آدمی حالات کو سمجھے اور آنے والے موقع کو فوراً استعمال کرے۔ جو شخص کسی موقع کو وقت پر استعمال نہ کر سکے وہی وہ شخص ہے جو ناکام رہا اور زندگی کی دوڑ میں پچھڑ گیا۔

شہر کی ایک گلی میں ایک بار میں نے دیکھا کہ بجلی کا بلب سارے دن جل رہا ہے۔ مگر دن کے اجالے میں وہ بالکل گم تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد اس کی روشنی بس اتنی نظر آتی تھی کہ آدمی یہ جان لے کہ یہاں ایک بلب موجود ہے۔ مگر جب رات آئی اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تو وہی بلب نمایاں ہو گیا۔ اب وہ اپنے ماحول کو اس طرح روشن کر رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا سورج زمین پر اتر آیا ہو۔

میں نے یہ منظر دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ ـــــ چراغ کی روشنی دراصل تاریکی کے موقع سے فائدہ اٹھانے کا دوسرا نام ہے۔ چراغ اسی وقت چراغ ہے جب کہ وہ تاریکی میں ہو۔ سورج کی روشنی ظاہر ہونے کے بعد چراغ کا کوئی وجود نہیں۔

تاریکی عام معنوں میں صرف "تاریکی" نہیں وہ ایک "موقع" ہے۔ تاریکی کو دیکھ کر آدمی اکثر فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ تاریکی کسی آدمی کے لئے بہترین موقع ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تاریکی ہو وہاں کسی کے لئے اپنے آپ کو "روشن" کرنے کا ایک قیمتی موقع موجود ہوتا ہے۔ بشرطیکہ آدمی اس راز کو جانے اور اس کو بھرپور طور پر استعمال کرے۔ ظاہر ہے کہ تاریکی کو وہی شخص اپنے لئے موقع بنا سکتا ہے جس کے پاس اپنی کوئی روشنی موجود ہو۔ جو شخص خود تاریکی ہو اس کے لئے تاریکی مزید اندھیرا لانے کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے لئے تاریکی کبھی موقع نہیں بنتی۔

چامیلس نے کہا ہے کہ " موقع کو کھو دینا کامیابی کو کھو دینا ہے"۔ اگر آپ مسافر ہوں اور ٹرین پکڑنے کے لئے ریلوے اسٹیشن جائیں تو آپ کو چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ جب ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو تو آپ فوراً اس کے اندر داخل ہو جائیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو بیدار نہ رکھیں تو عین ممکن ہے کہ ٹرین آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو اور پھر سیٹی دے کر چلی جائے۔ اور آپ اس پر سوار نہ ہوئے ہوں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آپ زندگی کے جس میدان میں بھی ہوں، ہمیشہ آپ اس امتحان

میں ہوتے ہیں کہ مواقع کو پہچانیں اور ان کو استعمال کرسکیں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو جاگتا ہوا نہ رکھیں تو مواقع آئیں گے اور آپ ان کو استعمال نہ کرسکیں گے۔ مواقع آپ کا انتظار کریں گے اور آپ کو ان کی خبر بھی نہ ہوگی اور پھر بعد کو بیٹھ کر زمانہ کی شکایت کریں گے کہ اس نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔

دنیا میں مواقع آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ تاہم ایک موقع ایسا ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ امتیازی کارکردگی کا موقع ہے۔ حقیقت یہ کہ اس دنیا میں سب سے بڑا موقع وہ ہے جس کو امتیاز (Distinction) کہا جاتا ہے۔ کسی معاملہ میں امتیازی صلاحیت آدمی کو سب سے بڑا موقع فراہم کرتی ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر "امتیاز" وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر آدمی کے لئے موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے ڈینیل ویبسٹر (Daniel Webster) نے کہا ہے کہ چوٹی کی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے:

There is always room at the top.

اس دنیا میں سب سے بڑا موقع "امتیاز" ہے۔ دوسرے مواقع زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ مگر امتیاز وہ موقع ہے جو ہمیشہ ہر مقام پر موجود رہتا ہے۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

غصہ نہیں

کسی کا قول ہے کہ "غصہ آدمی کے چہرہ کو بگاڑ دیتا ہے"۔ اس قول کی سچائی دیکھنا ہو تو ایک کتے کو اس وقت دیکھئے جب کہ وہ دوسرے کتے سے بگڑ کر اس پر غرا رہا ہو۔ اس وقت کتا دنیا کا سب سے زیادہ بدشکل جانور دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس مثال پھول کی ہے۔ پھول کے سامنے کھڑے ہو کر آپ اس کو برا بھلا کہیں۔ اس کے باوجود اس کے حسن میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پھول آپ کے بُرا کہنے پر نہیں بگڑا۔ اس نے آپ کی کڑوی باتوں کا کوئی خراب اثر نہیں لیا۔

اسی بنا پر ایک مفکر نے کہا ہے کہ انسان سب سے زیادہ خوبصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک اشتعال انگیز بات پر غصہ نہ ہو۔ اور انسان سب سے زیادہ بدصورت اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ اشتعال انگیز بات سنے اور پھر قابو سے باہر ہو جائے۔

ایک مثل ہے "غصہ ہمیشہ حماقت سے شروع ہوتا ہے۔ اور ندامت پر ختم ہوتا ہے"۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تصدیق غصہ کے ہر واقعہ سے کی جاسکتی ہے۔ جب بھی کسی آدمی کو غصہ آتا ہے تو اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس غصہ کے علاوہ دوسرا جو طریقہ تھا وہ اس کو استعمال نہ کرسکا۔

ایک بار ایک لڑکے نے اپنے گھر میں کچھ نقصان کر دیا۔ اس کا جاہل باپ اس کو نظر انداز نہ کرسکا۔ وہ سخت غصہ میں آگیا۔ اس نے اپنے لڑکے کو پکڑ کر زور سے دھکیلا تو اس کا سر جا کر دیوار سے ٹکرا گیا۔

اس کے سر کی کوئی رگ شدید طور پر متاثر ہوگئی۔ اس لڑکے نے ہمیشہ کے لئے اپنا حافظہ کھو دیا۔ وہ کسی کام کے قابل نہ رہا۔ بظاہر وہ دیکھنے میں پہلے کی طرح تھا مگر اب اس کو کوئی چیز یاد نہیں رہتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بیکار ہو کر رہ گیا۔ باپ نے وقتی جذبہ سے مغلوب ہو کر ایک نادانی کی تھی مگر اپنے اس فعل پر بے پناہ شرمندگی اس کو ہمیشہ باقی رہی۔ اگر اس نے وقتی طور پر برداشت سے کام لیا ہوتا تو وہ مستقل شرمندگی سے بچ جاتا۔

داتا گنج بخش کا قول ہے کہ "غصہ عقل کو کھا جاتا ہے" گوسوامی تلسی داس نے کہا: جہاں غصہ ہے وہاں بربادی ہے۔ ان دونوں اقوال کا مطلب ایک ہے۔ غصہ آدمی کی عقل کے لئے بھی قاتل ہے اور اس کے جسم کے لئے بھی۔ وہ اس کی پوری شخصیت کو نگل جاتا ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو غصہ سے بچائے۔

ڈاکٹر آلبورٹ نے بتایا ہے کہ غصہ کرنے سے عضلات (پٹھوں) کا تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ جسم کی قوت غیر معمولی طور پر استعمال ہو کر تکان کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر آدمی کے اندر عمل کی قوت گھٹ جاتی ہے۔

دوسرے ڈاکٹر جے اے تنڈلر کا کہنا ہے کہ غصہ کی حالت میں آنتوں میں اینٹھن آجاتی ہے۔ دل کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر غصہ شدید ہے تو اس کا بھی امکان ہے کہ دماغ کی رگ پھٹ جائے اور آدمی کی اچانک موت واقع ہو جائے۔

چیسٹر فیلڈ نے نہایت گر کی بات کہی ہے۔ اس نے کہا کہ کوئی شخص اگر اپنے غصہ پر قابو نہیں پا سکتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ دنیا کا کوئی کام بھی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی چیز حاصل کرنے کے لئے دنیا پر قابو پانا پڑتا ہے۔ پھر جو شخص اپنے آپ پر قابو نہ پا سکے وہ دنیا پر قابو پانے میں کس طرح کامیاب ہوگا۔

نوٹ: آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۸-۹ جولائی ۱۹۸۴ کو نشر کیا گیا۔

مسئلہ کا حل

ایک کہاوت ہے ــــــ خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔ اسی طرح ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے: ''اگر تم کسی گول چھید میں جا پڑو تو تمھیں اپنے آپ کو گیند بنا لینا چاہئے۔''

دونوں جملے ایک ہی بات کو دو مختلف پہلوؤں سے واضح کررہے ہیں۔ وہ یہ کامیابی کا راز حالات سے مطابقت Adjustment میں ہے نہ کہ حالات سے ٹکراؤ میں۔ دنیا میں رہتے ہوئے بار بار مختلف قسم کے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی آدمی قدرت کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ کبھی ماحول کے مقابلہ میں اور کبھی کسی اور چیز کے مقابلہ میں۔ ایسے ہر موقع پر عقلمند آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ لڑنے کی کوشش نہ کرے بلکہ خارجی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنی راہ نکالے۔

جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں اکثر زلزلے آتے ہیں۔ بے حساب جانی اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ یہ ایک بے حد شکل مسئلہ تھا۔ جاپان والوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ پختہ مکانات کم بنائیں۔ وہ لکڑی اور بانس وغیرہ کے مکانات بنا کر اس میں رہنے لگے۔ لکڑی اور بانس کا مکان اگر گر بھی جائے تو اس کا نقصان کم ہوتا ہے نیز اس کے بقیہ اجزا رکسی حد تک دوبارہ استعمال ہو سکتے ہیں۔

زلزلہ میں انسان کا مقابلہ قدرت سے ہوتا ہے۔ یہاں انسان بالکل بے بس ہے۔ چنانچہ جاپان والے یہاں جھک گئے۔ انھوں نے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو جھکا کر اپنے مسئلہ کا حل نکال لیا۔

ٹویوٹا (Toyota) کا لفظ آج جاپانی کار کے ہم معنی بن گیا ہے۔ مگر پندرہ سال پہلے یہ لفظ جاپان میں ٹکسٹائل انڈسٹری کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جاپان کی ٹویوٹا کمپنی نے ابتداءً ٹکسٹائل انڈسٹری (کپڑے کی صنعت) سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ مگر جاپان ٹکسٹائل انڈسٹری کے لئے موزوں ملک ثابت نہیں ہوا۔ کمپنی اس کاروبار میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ٹویوٹا والوں نے اس تجربہ کے بعد نیا میدان اختیار کر لیا۔ وہ موٹر کار کی صنعت میں داخل ہو گئے۔ یہاں ان کو فضا اپنے موافق ملی۔ انھوں نے تھوڑے عرصہ میں زبردست ترقی کی۔ یہاں تک کہ تمام دنیا کی سڑکوں پر جاپانی کاریں دوڑنے لگیں۔

اس دوسری مثال میں جاپان کو ملکی اور جغرافی رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ جاپانیوں نے یہ کیا کہ انہوں نے اپنے عمل کا میدان بدل دیا۔ اس کے بعد کامیابی ان کے لئے اسی طرح یقینی ہو گئی جس طرح کوئی شخص دیوار کی طرف سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اور پھر وہ دروازہ کی طرف سے نکلنے کی تدبیر کرلے۔

جاپان کے چار بڑے اخباروں میں سے ایک اخبار خسارہ میں چلا گیا۔ ہاتھی کا ایک پاؤں ٹوٹ

جائے تو اس کے بعد اس کا بچنا سخت مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح اخبار اگر ایک بار خسارہ میں پڑ جائے تو اس کا سنبھلنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر جاپان والے اپنی قومی صحافت کو زندہ رکھنا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے بعد یہ ہوا کہ فوراً ایک بینک نے اس اخبار کو ایک بڑا قرض آسان شرطوں پر دے دیا۔ کمپنیاں اور نیم سرکاری ادارے اس کو مسلسل بڑے بڑے اشتہارات دینے لگے۔ اسی کے ساتھ اخبار کے کارکنوں نے بطور خود اخبار کے منتظمین سے کہہ دیا کہ ان کی ماہانہ تنخواہوں میں حسب قاعدہ جو اضافہ ہونا ہے اس کو روک دیا جائے۔ یہ اضافہ اس وقت تک رکا رہے جب تک اخبار کی حالت سنبھل نہ جائے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ اخبار دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

کسی کا قول ہے کہ "کبھی دوسرے کی مدد کرنا خود اپنی مدد کرنا ہوتا ہے" یہ قول مذکورہ مثال سے پوری طرح واضح ہو رہا ہے۔ اخبار کو دیوالیہ ہوتے دیکھ کر اگر جاپان کے لوگ اس سے کھنچنے لگتے تو وہ اخبار کا بھی نقصان کرتے اور خود اپنا بھی۔ مگر جب اس نازک وقت میں وہ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے تو انھوں نے اخبار کو بھی فائدہ پہنچایا اور خود اپنے آپ کو بھی۔

کسی کا قول ہے ــــــ اگر آپ دوسروں کے مقابلہ میں کم ہوں تو اس کا رنج نہ کیجئے۔ کیونکہ کم ہونا بھی آدمی کو ایک چیز دیتا ہے۔ اور وہ ہے اپنی کمی کو دور کرنے کا جذبہ۔ اگر یہ جذبہ آپ اپنے اندر پیدا کر لیں تو آپ کی کمتری وہ زینہ بن جائے گی جو آپ کو اٹھا کر برتر مقام تک پہنچا دے "مشہور باکسنگ چیمپئن محمد علی کلے کا واقعہ اس کا ایک زندہ نمونہ ہے۔

امریکہ کی کالی نسل کا ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ روزانہ دیکھتا تھا کہ سڑک سے خوبصورت کاریں گزر رہی ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے باپ سے کہا" ابا، یہ چمکتی ہوئی کاریں ہمارے پاس کیوں نہیں "

"بیٹے، ہم لوگ کالے ہیں اور یہ حق صرف گوروں کو حاصل ہے کہ وہ خوب صورت کاروں پر چلیں " باپ نے بیٹے کی کالی جلد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" ابا، کیا کالا ہونا جرم ہے "، بیٹے نے اپنے باپ سے کہا۔

" بات یہ ہے کہ کالا ہونے کی وجہ سے ہمیں کوئی ایسا کام کرنے نہیں دیا جاتا جو ہماری آمدنی میں زیادہ اضافہ کرنے والا ہو۔ اور جو آدمی صرف اتنا کمائے کہ اپنا پیٹ بھر سکے وہ کار خریدنے کا بوجھ کیسے برداشت کرے گا"، باپ نے اپنے بیٹے کو جواب دیا۔ تاہم جب اس نے دیکھا کہ اس جواب سے بیٹے کی افسردگی ختم نہیں ہوئی تو اس نے بیٹے کے لئے ایک بائیسکل خرید دی۔ بائیسکل دیتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے سے کہا: ہماری تو اتنی بھی سکت نہیں تھی مگر تم کو غمگین دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔

لڑکا بائیسکل پر سوار ہوا۔ وہ گھنٹی بجاتا اور ہینڈل اِدھر اُدھر گھماتا ہوا خوشی سے چل رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک دکان کے سامنے جاکر رکا۔ اس نے اپنی بائیسکل باہر کھڑی کی اور دکان کے اندر چلا گیا۔ جب وہ رومال خرید کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک سفید فام لڑکا اس کی بائیسکل پر سوار ہوکر دوڑا چلا جارہا ہے۔ اس نے دوڑکر اس کو پکڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ ناکام رہا۔

پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ جب اس نے ایک پولیس والے سے شکایت کی تو اس نے اس کے کالے رنگ کو دیکھ کر حقارت سے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ یہ موقع تھا کہ لڑکے کے دل میں سفید فام لوگوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے اندر خود اپنے اس احساس کے خلاف شدید جذبہ ابھر آیا کہ ہم اپنے کالے رنگ کی وجہ سے اپنے کو کم کیوں سمجھتے ہیں۔ جس طرح سفید ایک رنگ ہے اسی طرح کالا بھی ایک رنگ ہے۔ پھر اس کی وجہ سے ہم احساس کمتری میں کیوں مبتلا ہوں۔

لڑکے نے پولیس والے سے کہا کہ اگر مجھ کو وہ سفید فام لڑکا مل گیا تو میں اس کی ناک توڑ دوں گا۔ پولیس والا ہنستا ہوا بولا "جاؤ، پہلے تم ناک توڑنے کی مشق کرو" اس جملہ میں جو طنز چھپا ہوا تھا اس نے لڑکے کو آخری حد تک جھنجھوڑ دیا۔ اس نے طے کرلیا کہ وہ اس چیلنج کا جواب دے گا۔ اس نے اسی دن سے باکسنگ کی مشق شروع کردی۔

یہ لڑکا محنت کرتے کرتے بالآخر ایک روز عالمی باکسنگ چمپین بن گیا۔ اب خوب صورت کیڈلک کار اس کے گھر کے سامنے اس کی منتظر رہتی۔ وہ ان ہوٹلوں میں ٹھہرنے لگا جن میں صرف شہزادے اور سربراہان مملکت ٹھہرتے ہیں۔ وہ دنیا بھر کے اخبارات کے صفحہ اوّل میں جگہ پانے لگا ——— یہ محمد علی کلے تھا جس نے تمام باکسروں کو ہراکر باکسنگ کا عالمی اعزاز حاصل کیا ہے۔

محمد علی کلے نے ایک انٹرویو میں کہا "اگر میرا باپ اپنے کالے رنگ کی وجہ سے احساس کمتری کا اظہار نہ کرتا اور مجھ کو کار کے بجائے بائیسکل نہ دیتا تو آج میں عالمی باکسنگ کا چمپین بھی نہ بنتا۔ یہ دراصل اپنے پیچھے ہونے کا احساس تھا جس نے میرے اندر آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کیا۔

نوٹ: ۱۳-۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کیا گیا۔

ہار میں جیت

لاوزے قدیم چین کا ایک مشہور فلسفی ہے۔ اس کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے۔ اس کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "سچائی کا راستہ"، اس کتاب میں اس نے زندگی کے بڑے گہرے راز بتائے ہیں، لاوزے کا ایک قول یہ ہے:

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کیونکہ عام لوگ تو جیت اس کو سمجھتے ہیں کہ آدمی کبھی اپنی ہار نہ مانے۔ یہاں تک کہ مقابلہ میں اگر وہ ہار جائے تب بھی یہی کہتا رہے کہ لوگوں نے دھاندلی کر دی۔ ورنہ جیت لازماً میری ہوئی ہوتی۔ مگر لاوزے نے جو بات کہی ہے وہ زندگی کا بڑا گہرا راز ہے اور کامیابی کا سب سے زیادہ یقینی راستہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص ہار کو مان لینے کا حوصلہ پیدا کرے وہ اپنی جیت کو یقینی بنا لیتا ہے۔ ایک شخص جب ہارتا ہے تو وہ دراصل اپنی کمزوری کی قیمت ادا کرتا ہے، خواہ وہ کمزوری طاقت کے اعتبار سے ہو یا تدبیر کے اعتبار سے۔ ایک ظالم اگر اپنے ظالمانہ منصوبہ میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ کسی پہلو سے اپنے حریف کے مقابلہ میں زیادہ بہتر پوزیشن میں تھا۔ جب ایسا ہے تو بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی اپنی ہار کو تسلیم کرے اور اس کے بعد اپنی تمام توجہ اپنی کمی کی تلافی میں لگا دے۔ ہار مان کر وہ زیادہ بہتر طور پر اس مقصد کو حاصل کر سکتا ہے جو ہار کا انکار کر کے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ایک شخص نے زمین خریدی اور اپنا نیا مکان بنانا شروع کیا۔ جب نیو کی کھدائی شروع ہوئی تو پڑوس کے آدمی نے ایک دیوار پر جھگڑا شروع کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تمھاری نیو ایک فٹ آگے ہے۔ اس کو ایک فٹ پیچھے کرو، ورنہ ہم نہ نیو کھودنے دیں گے اور نہ گھر بنانے دیں گے۔ گھر والے نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ مانا اور تیز ہوتا چلا گیا۔ آدمی نے دیکھا کہ اس کا پڑوسی لڑائی پر تلا ہوا ہے۔ وہ کسی حال میں جھکنے پر راضی نہیں ہے۔ اب اس نے سوچا کہ اگر میں اصرار کرتا ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لاٹھی ڈنڈے تک نوبت آئے گی۔ سر پھوٹیں گے۔ مقدمہ بازی ہوگی۔ بے کار مدوں میں روپیہ خرچ ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس لڑائی جھگڑے میں گھر بننے کا کام بھی نامعلوم مدت تک رک جائے اور اسی کے ساتھ میرا جو کاروبار ہے وہ بھی خراب ہو۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد لاوزے کا طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہار مان لی۔ اس نے اپنے مزدوروں کو حکم دیا کہ ایک فٹ پیچھے ہٹ کر نیو کھودو۔ اس نے ایک فٹ چھوڑ کر بقیہ زمین پر اپنا گھر بنایا اور اس کے بعد اپنے کاروبار میں لگ گیا۔

یہ طریق کار اس کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ کچھ دنوں بعد اس نے اتنا کما لیا کہ اپنے مکان کے اوپر ایک اور منزل بنالی۔ دو منزلہ ہو کر اس کا مکان کافی کشادہ ہو گیا۔ اس کے اس تعمیری طریقہ کا اثر اس کے بچوں پر پڑا۔ ان میں لڑائی جھگڑے کا ذہن ختم ہو گیا۔ سب تعمیری انداز میں سوچنے لگے۔ سب بچے خاموشی کے ساتھ کام کرنے کے راستہ پر لگ گئے۔ کچھ دنوں بعد باپ بیٹوں نے مل کر اتنا کافی پیسہ کما لیا کہ انھوں نے اپنے مکان سے ملا ہوا ایک پرانا بڑا مکان خرید لیا۔ اس کو گرا کر دوبارہ تعمیرات کرائیں اور کافی بڑا مکان اپنے لئے بنا لیا ——— آدمی نے ایک فٹ زمین ہاری تھی، اس کو ہزاروں فٹ زمین اس کے بدلہ میں حاصل ہو گئی۔

نہ ہونا بھی ہونا ہے

سوامی رام ترتھ (۱۹۰۶ — ۱۸۷۳) ہندستان کے ایک بڑے مفکر گزرے ہیں۔ وہ اردو، فارسی، انگریزی ہندی، سنسکرت، پنجابی زبانوں کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتے تھے۔ انھوں نے ریاضیات میں ایم اے کیا تھا۔ ان کا ایک قول یہ ہے:

صفر ہر ہندسہ کی قیمت دس گنا بڑھا دیتا ہے، اگر اس کو ہندسہ کے دائیں طرف رکھ دیا جائے

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کے پاس کچھ نہیں ہوتا تب بھی اس کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے، شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو جانے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرے۔ سوامی رام ترتھ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ گئے۔ اس وقت وہاں ان کا کوئی دوست یا جاننے والا نہ تھا۔ سوامی رام جب امریکہ کے ساحل پر خالی ہاتھ اترے تو ان کی بے سروسامانی کو دیکھ کر ایک امریکی نے پوچھا: کیا یہاں آپ کا کوئی دوست ہے۔ سوامی رام نے کہا "ہاں، ایک دوست ہے"۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنے دونوں بازو سوال کرنے والے امریکی کے گلے میں ڈال دئے اور کہا "وہ دوست یہ ہے"۔ سوامی رام اگرچہ اس امریکی کے لئے اجنبی تھے مگر ان کے اس سلوک سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ وہ سچ مچ سوامی رام کا دوست بن گیا۔ امریکہ میں وہ تنہا داخل ہوئے تھے۔ مگر ڈیڑھ سال کے قیام میں اپنے اس سلوک کی وجہ سے انھوں نے وہاں اپنے بہت سے دوست اور ساتھی پیدا کر لئے۔ اپنے "صفر" کو انھوں نے اپنے "دائیں طرف" رکھ دیا تو وہ ان کے لئے بہت بڑی گنتی بن گیا۔

ایک نوجوان بے روزگاری سے پریشان تھا۔ اس کے پاس نہ روپیہ تھا کہ کوئی کاروبار کرے اور نہ کسی بڑے آدمی کی سفارش جو اس کو ملازمت دلا سکے۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے کو "صفر" کے مقام پر پاتا تھا۔ ایک روز کسی پرچہ میں اس نے ایک قصہ پڑھا جس سے اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ دنیا میں کام کی کمی نہیں بلکہ کام کرنے والے کی کمی ہے۔ ہر بڑے کاروبار کو بہت سے کام کرنے والے آدمی چاہئیں مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کو اپنے مطلب کے آدمی نہیں ملتے۔ کوئی شخص محنتی ہے تو ایماندار نہیں۔ اور ایماندار ہے تو محنتی نہیں۔ "اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ میں محنتی بھی ہوں اور ایماندار بھی"، اس نے سوچا "تو میں اپنے لئے جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا"۔

اب آدمی نے یہ کیا کہ وہ بازار میں گیا۔ ایک دکان دیکھی کہ بڑی ہے اور اس میں کافی کام ہو رہا ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہو گیا اور مالک سے کہا کہ میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ کو اپنے یہاں رکھ لیں۔ اس نے کہا کہ میں ایک مہینہ تک آپ سے کوئی تنخواہ نہیں لوں گا۔ بلکہ مفت کام کروں گا۔ ایک مہینہ میرا کام دیکھنے کے بعد اگر میں آپ کو پسند آؤں تو آپ مجھ کو رکھ لیں۔ ورنہ رخصت کر دیں۔ اس طرح وہ کئی دوکان داروں سے ملا۔ بالآخر ایک بڑے دکان دار نے اس کو رکھ لیا۔ آدمی نے اپنا کام اتنی محنت اور دیانت داری سے کیا کہ اس کا مالک خوش ہو گیا اور صرف دو ہفتہ دیکھنے کے بعد اس کی تنخواہ مقرر کر دی اور مہینہ ختم ہونے پر پورے مہینہ کی تنخواہ دی۔ چند ماہ بعد اس نے اس کی تنخواہ میں کافی اضافہ کر دیا۔ چند سال اور گزرے تو وہ اس کی لیاقت اور کارکردگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے کاروبار میں اس کو شریک کر لیا —— نوجوان کے پاس "صفر" کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر جب اس نے اپنے صفر کو صحیح طور پر استعمال کیا تو اس کا صفر اس کے لئے دولت کا خزانہ بن گیا۔

جلدی میں دیر

ونسٹن چرچل (۱۹۶۵-۱۸۷۴) مشہور انگریز مدبر تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے وقت وہ برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ جب کہ برطانیہ کی سلطنت آج سے بہت زیادہ بڑی تھی۔ انھوں نے اپنے ملک کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ چرچل کا ایک قول یہ ہے :

تم جتنی جلدی کرو گے اتنی ہی زیادہ دیر لگے گی

یہ زندگی کی بڑی گہری حقیقت ہے۔ آپ ایک مکان کی تیسری منزل پر ہیں اور آپ کو کسی ضرورت کے تحت فوراً نیچے اترنا ہے۔ تاہم آپ کو کتنی ہی جلدی ہو، آپ کو بہرحال سیڑھیوں کے ذریعہ اترنا ہوگا۔ اگر جلدی کی خاطر آپ ایسا کریں کہ تیسری منزل سے زمین کی طرف کود پڑیں تو یقیناً آپ بہت جلد نیچے پہنچ جائیں گے۔ مگر یہ جلدی عملاً بہت زیادہ دیر بن جائے گی۔ کیوں کہ آپ کا ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے گا اور آپ نیچے اتر کر اپنی منزل کی طرف جانے کے بجائے ہسپتال لے جائے جائیں گے اور وہاں مہینوں تک علاج کے بستر پر پڑے رہیں گے۔

ایک شخص اپنے گھر کے آنگن میں آم کا درخت دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں آم کا چھوٹا پودا لگاؤں تو اس کو بڑھنے میں کم از کم دس سال لگ جائیں گے۔ اس کے باغ میں آم کا ایک پانچ سال کا درخت تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ اس درخت کو کھود کر نکالے اور اس کو لاکر گھر کے آنگن میں لگائے۔ وہ خوش تھا کہ اس طرح پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے ہو جائے گا اور چند ہی سال کے بعد گھر کے اندر آم کا ایک پورا درخت کھڑا ہوا نظر آئے گا۔ اس نے پانچ سالہ درخت کی کھدائی کے لئے مزدور لگادئے۔ کئی آدمیوں نے گھنٹوں کی محنت کے بعد اس کو کھودا اور پھر ایک بڑی چارپائی پر رکھ کر اس کو گھر کے اندر لے آئے۔ درخت آنگن میں لگا دیا گیا۔ مگر اگلے ہی دن اس کے پتے مرجھا گئے۔ اور چند ہفتوں کے بعد آدمی کے آنگن میں شاداب درخت کی جگہ صرف سوکھی لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایک آدمی پیسہ کمانا چاہتا تھا۔ اس نے کراکری کی دکان کھولی۔ سال بھر اس میں بیٹھا۔ جب اس نے دیکھا کہ دکان زیادہ نہیں چل رہی ہے تو اس نے طے کیا کہ کسی اور چیز کی دکان کھولے۔ اب اس نے بساطہ کا کام شروع کیا۔ ایک سال کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ اس میں بھی زیادہ فائدہ نہیں ہے۔ اب اس نے اسٹیشنری کا کام شروع کر دیا۔ ایک سال میں اس سے بھی جی بھر گیا اور اس نے جوتہ کی دکان کر لی۔ اس طرح وہ بار بار اپنی لائن بدلتا رہا اور بالآخر مایوس اور ناکام ہو کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس راز کو نہ سمجھ سکا کہ کسی کام میں کامیابی کے لئے وقت درکار ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ادھر دکان کھولی اور ادھر وہ شاندار طریقے سے چلنے لگی۔ آدمی نے کئی کاموں میں جتنا وقت لگایا وہی وقت اگر وہ ایک کام میں لگاتا تو یقیناً وہ کامیاب ہو جاتا۔ اس نے "جلدی" چاہی اس لئے اس کو دیر ہوتی چلی گئی۔ اگر وہ جلدی نہ کرتا تو اس سے کم وقت میں وہ کامیاب ہو جاتا جتنا وقت اس نے بار بار کے ناکام تجربوں میں ضائع کر دیا۔

کسی بھی میدان میں کامیابی کے لئے ایک لازمی شرط استقلال ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ تمام پہلوؤں کے بارے میں اچھی طرح سوچ کر اپنا راستہ متعین کرے۔ اس معاملہ میں لوگوں سے

مشورہ بھی کرے تاکہ اپنے فیصلہ پر اس کو پورا یقین حاصل ہو سکے۔ زندگی میں اس طرح کا فیصلہ ایک بار کیا جاتا ہے، بار بار نہیں۔

آدمی جب ایک بار فیصلہ کر لے تو اس کے بعد اس کو اپنے فیصلہ پر جم جانا چاہئے۔ اس کے بعد اگر کوئی بات سامنے آتی ہے جو اس کے فیصلہ میں تذبذب پیدا کرنے والی ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ایسی بات کے خلاف لڑ کر اس کو اپنے دماغ سے نکال دے اور اسی ایک فیصلہ پر قائم رہے جو اس نے سوچ سمجھ کر اپنے لئے طے کیا تھا۔

ایسے ہی لوگ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ بار بار اپنا راستہ بدلتے رہیں وہ اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

نوٹ: یہ مضامین ۲۶ - ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کئے گئے۔

انتقام نہیں

کسی کا قول ہے ——— "انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔"
یہ زندگی کی نہایت گہری حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد ہی کوئی شخص موجودہ دنیا میں اپنے لئے کامیاب زندگی بنا سکتا ہے۔

ایک شخص سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آپ کے دل میں اس کے خلاف انتقام لینے کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ آپ چاہنے لگے کہ اس سے بدلہ لے کر اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کریں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے تکلیف دینے سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا، پھر وہی تکلیف جب آپ اس شخص کو دیں گے تو کیا اس کے اندر دوبارہ انتقام کا جذبہ نہیں بھڑکے گا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ اور پھر برائی کا ایک چکر چل پڑے گا۔ آپ کو ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف سہنی پڑے گی۔ اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ نظرانداز کرنے کا طریقہ اختیار کر کے بات کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔

میری ملاقات ایک بار یوپی کے ایک شخص سے ہوئی۔ اس نے ایک نیتا کی شرکت میں ایک بس خریدی۔ اس آدمی نے پیسہ لگایا۔ اور نیتا نے لائسنس حاصل کیا۔ لائسنس قانونی طور پر نیتا کے نام تھا۔ مگر نفع میں دونوں برابر کے شریک تھے۔

کچھ دنوں کے بعد نیتا کی نیت بگڑی۔ اس نے سوچا کہ قانونی طور پر گاڑی میری ہے کیوں کہ لائسنس میرے نام ہے۔ پھر میں اس کا نفع دوسرے کو کیوں دوں۔ اس نے یک طرفہ طور پر گاڑی پر قبضہ کر لیا۔

اب آدمی بہت غصہ ہوا۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے ارادہ کیا کہ نیتا کو قتل کر ڈالے۔ چنانچہ وہ اس کے قتل کا منصوبہ بنانے لگا۔ اس دوران اس کی ملاقات ایک بوڑھے تجربہ کار آدمی سے ہوئی۔ حالات سننے کے بعد بوڑھے آدمی نے کہا کہ اگر تم اپنے منصوبہ کے مطابق نیتا کو مار ڈالو تو اس کے بعد اس کے بچے کیا تم کو زندہ چھوڑ دیں گے۔

یہ بات آدمی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے نیتا کو مارنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے اس نے یہ کیا کہ اس کے پاس جو رقم اب بھی باقی تھی اس سے چھوٹے پیمانہ پر بزنس شروع کر دیا۔ چند سال بعد جب اس آدمی سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں بہت خوش ہوں۔ بس کی شرکت سے میں جتنا

کماتا تھا، اب میں اس سے زیادہ کمارہا ہوں۔ اور میرا کاروبار برابر ترقی کر رہا ہے۔

جب بھی آپ کے سینہ میں کسی کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکے تو اپنے ذہن کو ٹھنڈا کرکے سب سے پہلے یہ سوچئے کہ میرا فائدہ انتقام لینے میں ہے یا انتقام نہ لینے میں۔

ظاہر ہے کہ دوسرے کو نقصان پہنچانا بذات خود کوئی مقصد نہیں۔ اصل مقصد جو ہر آدمی اپنے سامنے رکھتا ہے یا اس کو رکھنا چاہئے ، وہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا ہے۔ اگر دوسرے کو نقصان پہنچانے کا نتیجہ یہ ہو کہ آخر میں آپ کو خود اس سے بڑا نقصان اٹھانا پڑے، تو ایسی حالت میں عقلمندی کیا ہے۔ اگر آپ ٹھنڈے دماغ سے سوچیں تو آپ یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ ایسی کارروائی جو آخر میں خود اپنے خلاف پڑنے والی ہو ، وہ کسی بھی حال میں صحیح نہیں کہی جاسکتی۔ ایسی ہر کارروائی صرف بے وقوفی ہے نہ کہ وہ کام جو ایک عقلمند آدمی کو کرنا چاہئے۔

ہمارے سماج میں جو جھگڑے ہیں اور عدالتوں میں جو مقدمات کی بھرمار ہے وہ سب اسی انتقامی جذبہ کا نتیجہ ہے۔ لوگ شکایت یا تکلیف کی کوئی بات پیش آنے کے بعد اس کو بھلا نہیں پاتے۔ وہ فوراً ردعمل کا شکار ہو جاتے ہیں اور جوابی کارروائی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس طرح جو جھگڑے اور مقدمے بڑھتے ہیں اس کا نقصان صرف فریق ثانی کو نہیں پہنچتا بلکہ اس شخص کو بھی پہنچتا ہے جس نے جوابی کارروائی کرکے دوسرے کے خلاف بدلہ لینا چاہا تھا۔

ہر آدمی سکون کی زندگی چاہتا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا سماج امن وامان کا سماج ہو۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر بدلہ نہ لینے کا مزاج پیدا ہو جائے۔ یہی ہمارے مسئلہ کا واحد حل ہے۔ اسی سے ہر آدمی کو ذاتی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ اور پورا سماج بھی اسی کے ذریعہ امن وامان کا گہوارہ بن سکتا ہے۔

جب بھی آپ کسی سے انتقام لیں تو انتقام لینے میں آپ اپنی طاقت خرچ کرتے ہیں۔ وقت اور پیسہ کی کافی مقدار خرچ کئے بغیر کوئی شخص دوسرے سے انتقام نہیں لے سکتا۔ اگر بالفرض آدمی انتقام لینے میں کامیاب ہو جائے تب بھی انتقام لے کر اس کو جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ صرف ایک نفسیاتی تسکین ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

لیکن یہی وقت اور یہی رقم اگر کسی مثبت چیز کو حاصل کرنے میں لگا دیا جائے تو وہ نفع کے ساتھ

آدمی کی طرف لوٹتا ہے، جیسا کہ مذکورہ شخص کے ساتھ پیش آیا۔ انتقام لینے میں طاقت کو خرچ کرنا طاقت کو کھونا ہے، اور ایک مثبت کام میں طاقت لگانا، طاقت کو مزید اضافہ کے ساتھ دوبارہ پالینا ہے۔ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ عقل مند آدمی کو دونوں میں کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

حقیقت پسندی

کسی کا قول ہے کہ ـــــ "اپنے حق سے زیادہ چاہنا اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کر لینا ہے۔" کوئی آدمی جب اتنا ہی چاہے جس کا وہ واقعی طور پر حق دار ہے تو ہر چیز اس کی مانگ کی تصدیق کر رہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہنے لگے تو ہر چیز اس کے خلاف ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ہمیشہ ناکام۔

ایک بڑا ادارہ تھا۔ اس میں ایک منیجر کی ضرورت تھی۔ ایک آدمی کے اندر انتظامی صلاحیت تھی۔ چنانچہ اس آدمی کو وہاں منیجر کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ ادارہ کے ڈائرکٹر نے منیجر کے ساتھ کافی رعایت کا معاملہ کیا۔ معقول تنخواہ، رہنے کے لئے مکان، آنے جانے کے لئے ایک جیپ، اور دوسری کئی چیزیں انھیں حاصل ہو گئیں۔

مگر کچھ دنوں کے بعد اس آدمی کے ذہن میں زیادہ کی حرص پیدا ہو گئی۔ "منیجر" کی حیثیت اس کو کم لگی، اس نے چاہا کہ ڈائرکٹر کی سیٹ پر قبضہ کر لے۔ اب منیجر نے چپکے چپکے ڈائرکٹر کے خلاف منصوبہ بنایا۔ مگر منصوبہ کی کامیابی سے پہلے ڈائرکٹر کو اس کی خبر ہو گئی۔ اس نے فوری کارروائی کرکے اس آدمی کو منیجر کی پوسٹ سے ہٹا دیا۔ مکان اور جیپ وغیرہ بھی چھین لی گئی۔ ان کو ذلت کے ساتھ ادارہ سے باہر نکال دیا گیا۔

یہ وہی چیز ہے جس کو اخلاقی زبان میں قناعت اور حرص کہا جاتا ہے۔ اپنی واقعی حیثیت پر راضی رہنے کا نام قناعت ہے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ چاہنے کا نام حرص۔ مذکورہ آدمی اگر قناعت کا طریقہ اختیار کرتا تو وہ نہ صرف کامیاب رہتا بلکہ مزید ترقی کرتا۔ مگر حرص کا طریقہ اختیار کرکے اس نے اپنے پائے ہوئے کو بھی کھو دیا، اور آئندہ جو کچھ وہ پا سکتا تھا اس کو بھی۔

جب آپ اپنے حق کے بقدر چاہتے ہیں تو آپ وہ چیز چاہ رہے ہوتے ہیں جو واقعۃً آپ کی ہے، جو از روئے انصاف آپ ہی کو ملنا چاہئے۔ مگر جب آپ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہیں تو گویا آپ ایسی چیز

چاہ رہے ہیں جو از روئے انصاف آپ کی چیز نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی چیز ہے۔ پھر دوسرا شخص کیوں آپ کو اپنی چیز دینے پر راضی ہو جائے گا۔

جب بھی آدمی اپنے حق سے زیادہ چاہے تو فوراً اس کا ٹکراؤ دوسروں سے شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب کش مکش اور ضد اور مزاحمت وجود میں آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اصل سے زیادہ کی طلب میں اصل کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اپنے حق سے زیادہ کی طلب کرتے ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی تضاد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حصہ کی چیز لینے کے لئے ایک دلیل دیتا ہے، اور دوسرے کے حصہ کی چیز پر قبضہ کرنے کے لئے دوسری دلیل استعمال کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقدمہ کو خود ہی کمزور کر لیتا ہے۔ وہ اپنی نفی آپ کر دیتا ہے۔ دو قسم کی دلیلوں سے وہ ثابت کرتا ہے کہ پہلی چیز اگر اس کی ہے تو دوسری چیز اس کی نہیں ہے، اور اگر دوسری چیز اس کی ہے تو پہلی چیز اس کی نہیں ہو سکتی۔

ایسے آدمی کے اوپر وہ مثال صادق آتی ہے کہ جو شخص دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی پکڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اصل حق کے ساتھ مزید کا طالب بنے، وہ اصل کو بھی کھو دے گا اور اسی کے ساتھ مزید کو بھی۔

ہر آدمی جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ خاص صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کو اس کے پیدا کرنے والے نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ایک کامیاب زندگی حاصل کرے۔ مگر ہر آدمی کی ایک حد ہے۔ اور ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنی حد کو جانے۔ جب آدمی اپنی حد کے اندر رہے تو دنیا کی تمام طاقتیں اس کو کامیاب بنانے کے لئے اس کی پشت پر آجاتی ہیں اور جب وہ اپنی حد سے آگے بڑھنے لگے تو ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ایسے آدمی کے لئے ناکامی کے سوا کوئی اور انجام اس دنیا میں مقدر نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۹ اپریل اور ۲۶ اپریل ۱۹۹۰ کو نشر کیا گیا۔

ترقی کا راز

گلاب کا درخت فطرت کا ایک مظہر ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک علامت ہے جو ہر دیکھنے والے کو بتا رہا ہے کہ دنیا میں ہم کو کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔

آپ جانتے ہیں کہ گلاب کے درخت میں بیک وقت پھول بھی ہوتے ہیں اور کانٹے بھی۔ ہر عقل مند آدمی یہ کرتا ہے کہ وہ پھول کو لے لیتا ہے اور کانٹے کو چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں خوش گوار پہلو ہیں اور اسی کے ساتھ ناخوش گوار پہلو بھی۔ یہاں بھی دانش مندانہ طریقہ یہ ہے کہ خوش گوار پہلو کو لیا جائے اور ناخوش گوار پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہمارے پرائم منسٹر نے ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر میں کہا کہ ہم کو ایک قسم کے مورٹیوریم کی ضرورت ہے۔ یعنی چند سال کے لیے ہم لوگ طے کر لیں کہ ہم اختلافی باتوں کو بازو میں رکھ دیں گے اور اتفاقی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ موجودہ حالات میں اس قسم کا مورے ٹوریم ملک کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے۔

تاہم یہ صرف چند سال کی بات نہیں بلکہ پوری زندگی کی بات ہے۔ کوئی فرد یا کوئی قوم اسی وقت ترقی کر سکتی ہے جب کہ وہ اس حکمت کو اختیار کرلے کہ انھیں مسائل سے اعراض کرنا ہے اور مواقع کو استعمال کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔

آپ اپنی سواری لے کر سڑک پر نکلتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ سڑک پر آپ کے ساتھ دوسرے بہت سے لوگ بھی اپنی سواریاں دوڑا رہے ہیں۔ آپ دوسروں سے ٹکراتے نہیں۔ بلکہ دوسروں سے بچتے ہوئے اپنا سفر طے کرتے ہیں۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں کوئی شخص اکیلا نہیں ہے۔ یہ دنیا بہت سے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ اب اس دنیا میں کامیاب زندگی حاصل کرنے کا راز اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ہر ایک دوسرے کا لحاظ کرے۔ ہر ایک دوسرے کو راستہ دیتے ہوئے اپنا راستہ اختیار کرے۔ دوسروں کی رعایت کرنا اپنے لیے کامیاب سفر حاصل کرنے کی سب سے زیادہ یقینی ضمانت ہے۔

ہندستان میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ رہتے ہیں۔ ان تمام کو بدل کر ایک مذہب اور ایک کلچر بنانا ممکن نہیں۔ اگر اس قسم کی وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو وحدانیت تو پیدا نہیں ہوگی۔ البتہ وحدانیت پیدا کرنے کی کوشش میں ملک برباد ہو جائے گا۔ اس لیے ہم کو وحدانیتِ کلچر کے بجائے تعددِ کلچر کے اصول کو اختیار کرنا ہے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی کامیابی کا طریقہ بھی۔

آج ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ رواداری (ٹالرنس) ہے۔ رواداری کا مطلب ہے اپنے طریقہ پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے طریقہ کا احترام کرنا۔ اسی رواداری پر صدیوں سے ملک کا انتظام چلا آرہا ہے۔ اسی پر وہ آئندہ بھی چل سکتا ہے۔ خواہ ایک فرقہ کے لوگ ہوں یا مختلف فرقہ کے لوگ، رواداری ہر حال میں ضروری ہے۔ حتیٰ کہ ایک خاندان کے دس افراد اگر ایک ساتھ رہتے ہوں تو وہ بھی کامیاب گھر اسی وقت بنا سکتے ہیں جبکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا معاملہ کریں۔

دو سال پہلے میں شولاپور گیا۔ وہاں ایک جلسہ میں ایک ہندو بھائی کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرے باپ نان ویجیٹیرین تھے اور میری ماں ویجیٹیرین تھی۔ مگر دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ میری ماں روزانہ صبح کو اٹھ کر پہلے میرے باپ کے لیے کھانا بناتی۔ اور اس کو کھانے کی میز پر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ نہا کر اپنے لیے ویجیٹیرین کھانا بناتی۔ اسی طرح وہ دونوں پوری زندگی میں عمل کرتے رہے۔ انھوں نے نہایت پُرمسرت زندگی گزاری۔

یہی قومی تعمیر کا واحد طریقہ ہے۔ قومی زندگی میں ہم کو یہی کرنا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو گوارا کریں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ انسانی احترام کے اصول پر معاملہ کریں جس طرح وہ اپنے لیے یہ حق سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے مذہب اور کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہو اسی طرح وہ دوسروں کو بھی یہ حق دیں کہ وہ اپنے پسندیدہ مذہب اور اپنے پسندیدہ کلچر کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہیں۔ اس قسم کے فرق کو رواداری کے خانہ میں ڈالنا ہے، اس کو اختلاف کا مسئلہ نہیں بنانا ہے۔ یہی قومی تعمیر کا واحد کامیاب طریقہ ہے۔

مثلاً ایک فرقہ کے لوگ شہر کی سڑک پر اپنا جلوس نکالتے ہیں۔ اس میں کچھ پُرجوش لوگ

ایسے نعرے بھی لگا دیتے ہیں جو دوسرے فرقہ کے لیے ناگوار ہوں۔ اب دوسرے فرقہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اس کو وقار کا مسئلہ بنالے اور جلوس کو روکنے یا اس کی روٹ بدلوانے کے لیے کھڑا ہو جائے۔ جلوس کے مسئلہ کا حل جلوس کو نظر انداز کرنا ہے نہ کہ اس سے ٹکرانا۔ اگر جلوس کے معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے تو وہ چند منٹ میں اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ مگر جب روک ٹوک اور مزاحمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو الٹا نتیجہ نکلتا ہے۔ جو چیز ابتداءً صرف جلوس کی حیثیت رکھتی تھی وہ فساد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے انتخاب (چوائس) جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے، بلکہ جلوس اور فساد میں ہے۔ جلوس کو اگر روکا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ بے جلوس صورت حال نہیں ہے، بلکہ دو فرقوں کے درمیان فساد ہے جس میں جان و مال کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موجودہ دنیا میں آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک طرف مسائل ہوتے ہیں اور دوسری طرف مواقع۔ یہ قدرت کا قانون ہے اور اس دنیا میں کبھی اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو استعمال کیا جائے۔ مسائل کو نظر انداز کرنا گویا اپنے لیے عمل کا وقفہ حاصل کرنا ہے۔ اور مسائل سے الجھنا ملے ہوئے وقت کو ضائع کر دینا۔

نوٹ: یہ تقریر ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ کو آکاش وانی ناگپور سے نشر کی گئی۔

تعمیرِ حیات

کسی کا قول ہے : ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے، سوا اس مسئلہ کے جس کو ناقابل حل سمجھ لیا جائے۔
یہ بہت بامعنی قول ہے۔ اس کا تعلق انسان کے ہر معاملہ سے ہے، خواہ وہ چھوٹا معاملہ ہو یا کوئی بڑا معاملہ۔ خواہ وہ ایک شخص کا معاملہ ہو یا پوری قوم اور پورے ملک کا معاملہ۔

انسان کے سامنے جب کوئی مسئلہ آتا ہے تو عام طور پر اس کو مسئلہ کا ایک ہی پہلو دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اس مسئلہ کا مشکل ہونا ہے، مسئلہ کا آسان پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو صرف مشکل ہی مشکل ہو۔ اس میں آسانی کا پہلو موجود نہ ہو۔ مسئلہ پیش آنے کے بعد آدمی اگر گہرائی کے ساتھ سوچے تو اس کو نظر آئے گا کہ جہاں مشکل تھی وہیں آسانی کی صورتیں بھی اس کے لیے موجود تھیں۔ جہاں ناموافق پہلو تھے، وہیں کچھ موافق پہلو بھی تھے جو اس انتظار میں تھے کہ کوئی آئے اور ان کو استعمال کرے۔

ایک صاحب نے ایک شخص کی شرکت میں ایک کاروبار کیا۔ کاروبار میں اچھا نفع ہوا۔ اس کے بعد شریک کی نیت بگڑی۔ اس نے کچھ غلط تدبیر کر کے پورے کاروبار پر قبضہ کر لیا۔ اور دوسرے صاحب کو اس سے الگ کر دیا۔ پہلے دونوں کی حیثیت برابر کے شریک کی تھی۔ اب یہ صورت بن گئی کہ ایک شخص تنہا پورے کاروبار کا مالک ہے، اور دوسرے کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

ان صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بہت غصہ میں تھے اور اتنا مایوس تھے کہ خودکشی کر لینا چاہتے تھے، میں نے کہا کہ آپ کے پاس دو چیزیں تھیں۔ ایک کاروبار، اور دوسرے آپ کا اپنا وجود۔ کاروبار اگر آپ سے کھویا گیا تو اس کے لیے اتنا غم کرنے کی کیا ضرورت۔ آپ کا اپنا وجود تو پھر بھی بدستور آپ کے پاس باقی ہے۔ آپ اپنے اس باقی سرمایہ کو استعمال کیجئے، آپ پہلی چیز سے اپنی نظریں ہٹا لیجئے اور اپنی ساری توجہ دوسری چیز پر لگا لیجئے۔ اللہ کی مدد سے یقیناً آپ کامیاب رہیں گے۔

یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ انھوں نے پچھلے کاروبار کو بھلا دیا اور ازسرِ نو ایک نیا کاروبار شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنی عقل اور محنت کو استعمال کیا۔ یہاں تک کہ ان کا کاروبار چل گیا۔ چند سال کے بعد وہ اس شخص سے بھی آگے بڑھ گئے جس نے دھوکا دے کر پچھلے کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا۔

وہ آدمی جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ اور انھوں نے اپنی محنت سے ترقی کا برتر مقام حاصل کرلیا۔

یہی اس دنیا میں زندگی اور ترقی کا راز ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو اس احساس کے ساتھ زندگی گزارنا ہے کہ یہاں اگر دشواریاں ہیں تو یہاں مواقع بھی ہیں۔ یہاں اگر نقصان ہے تو یہاں فائدہ کی صورتیں بھی موجود ہیں۔ یہاں اگر دشمن ہیں تو یہاں دوست بھی ہیں۔ یہاں اگر تاریک پہلو ہیں تو اسی کے ساتھ یہاں روشن پہلو بھی ہیں۔ یہاں اگر کھونے کی مثالیں ہیں تو یہاں پانے کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ یہاں اگر انسان کے لیے "نہیں" ہے تو یہاں اس کے لیے "ہاں" بھی پوری طرح موجود ہے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ وہ کسی بھی صورت میں اپنا حوصلہ نہ کھوئے۔ وہ ماضی کو بھلا کر ہمیشہ مستقبل کی طرف دیکھے۔ ہر بار گرنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کرے۔ وہ کسی ہونے والی بات کو کبھی آخری ہونے والی بات نہ قرار دے۔

حوصلہ مندی اس دنیا میں کسی آدمی کا سرمایہ ہے۔ یہ ایسا سرمایہ ہے جو کبھی کھویا جانے والا نہیں۔ حوصلہ مندی بلاشبہ سب سے زیادہ قیمتی دولت ہے، اور حوصلہ مندی وہ دولت ہے جس کو کوئی چھیننے والا چھیننے پر قادر نہیں۔

کسی کا قول ہے: سب کچھ کے پیچھے دوڑنے والا کچھ نہیں پاتا، اور جو آدمی کچھ کے پیچھے دوڑے وہ آخر کار سب کچھ کو پالیتا ہے۔ یہ زندگی کا اہم ترین راز ہے۔ زندگی انھیں لوگوں کے لیے ہے جو اس راز کو سمجھیں اور اس کو عملی طور پر استعمال کریں۔

آپ پھل دار درختوں کا ایک باغ لگانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کریں کہ کہیں سے بڑے بڑے درخت لائیں اور ان کو اپنی زمین پر گاڑ دیں تو اس طرح آپ باغ والے نہیں بن سکتے۔ آج آپ جو درخت لگائیں گے وہ کل سوکھ چکے ہوں گے۔ کل آپ دوسرے درخت لاکر لگائیں گے تو دوبارہ وہ پرسوں تک سوکھ چکے ہوں گے۔ آپ پچاس سال تک بھی ایسا کرتے رہیں تو کبھی آپ ہرے بھرے پیڑوں کے باغ کے مالک نہیں بن سکتے۔

باغ کا مالک بننے کی صورت صرف یہ ہے کہ آپ اپنے مطلوبہ درخت کے بیج حاصل کریں اور ان کو زمین میں گاڑ دیں۔ اس کے بعد ان کو کھاد اور پانی دیتے رہیں۔ جب آپ ایسا کریں گے تو ضروری مدت گزرنے کے بعد آپ کی زمین پر ہرے بھرے درختوں کا باغ لہلہا رہا ہوگا۔

یہی معاملہ زندگی کے تمام معاملات کا ہے۔ آپ کو علم میں آگے بڑھنا ہو، یا آپ کو کاروبار کرنا ہو۔ یا آپ کو ایک کارخانہ چلانا ہو، ہر کام میں ترقی حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ شروع سے آغاز کیا جائے۔ کم سے چل کر زیادہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ پہلے صرف جزء پر قناعت کی جائے، اس کے بعد کل کی امید کی جائے۔ موجودہ دنیا میں ترقی اور کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جو کسی کو ترقی اور کامیابی کے درجہ تک پہنچانے والا ہو۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی کو کسی دوسرے شخص سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ جو کچھ دینے پر راضی ہوتا ہے وہ پہلے شخص کو کم نظر آتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسرے آدمی سے زیادہ سے زیادہ حاصل کر لے۔ مگر یہ دانش مندی نہیں۔ اس قسم کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ دونوں آدمیوں کے درمیان جھگڑا کھڑا ہو جائے گا اور جو کچھ مل رہا تھا اس کا ملنا بھی مشتبہ ہو جائے گا۔

آدمی کو چاہیے کہ ایسی نادانی نہ کرے۔ دوسرا شخص جو کچھ دینے پر راضی ہے اس کو لے کر اپنی زندگی کی جدوجہد شروع کر دے۔ وہ ملی ہوئی چیز کو زینہ بنا کر نہ ملی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی محنت میں لگ جائے۔ اگر وہ ایسا کرے تو چند سال کے بعد وہ دیکھے گا کہ دوسرا شخص اس کو جو کچھ دینے پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مزید اضافہ کے ساتھ اس نے خود اپنی محنت کے ذریعہ حاصل کر لیا ہے۔

آدمی جب کسی نہ ملی ہوئی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بھول جاتا ہے کہ اس کوشش میں وہ اپنی ملی ہوئی ایک چیز کو ضائع کر رہا ہے۔ یہ ضائع ہونے والی چیز اس کا وہ وقت ہے جو اب بھی اس کو حاصل ہے۔ نہ ملی ہوئی چیز کی خاطر ملی ہوئی چیز کو کھونا عقل مندی نہیں ہو سکتی۔ غیر حاصل شدہ چیز کے پیچھے حاصل شدہ چیز سے محروم ہو جانا کسی سمجھ والے آدمی کا کام نہیں۔

وقت آدمی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے۔ دانش مند وہ ہے جو اپنے وقت کی قدر کرے، جو وقت کے کھونے کو کسی بھی حال میں برداشت نہ کرے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۰ دسمبر ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔

اچھا کردار

وہ کیا چیز ہے جو کسی سماج کو اچھا سماج بناتی ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے افراد کا اچھا کردار۔ جس سماج کے افراد میں اچھا کردار ہو وہ سماج اچھا سماج ہوگا، اور جس سماج کے افراد میں برا کردار ہو وہ سماج برا سماج بن جائے گا۔

اچھا کردار کون سا ہوتا ہے اور برا کردار کون سا۔ اس کی پہچان بہت آسان ہے۔ اچھے کردار والا انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے جو اس کو خود اپنے لیے پسند ہے۔ اور برے کردار والا انسان وہ ہے جو اپنے لیے کچھ اور پسند کرے اور جب دوسرے کا معاملہ ہو تو وہ کچھ اور پسند کرنے لگے۔

ایک آدمی اپنے گھر سے نکل کر بازار میں گیا۔ وہاں کسی نے اس سے کڑوا بول بول دیا۔ آدمی کو کڑوا بول سن کر غصہ آگیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا۔ اس کے بعد جب یہ آدمی اپنے گھر اور محلہ میں آیا تو وہ خود بھی گھر والوں سے اور محلہ والوں سے کڑوا بول بولنے لگا۔ حالانکہ اس کو اس تجربہ کے بعد سوچنا چاہیے تھا کہ کڑوا بول جب مجھ کو اچھا نہیں لگا تو دوسروں کو بھی وہ اچھا نہیں لگے گا۔ اگر میں اپنے بارہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھ سے میٹھا بول بولیں تو مجھے خود بھی ایسا بن جانا چاہیے کہ دوسرے لوگوں کو مجھ سے صرف میٹھا بول سننے کو ملے۔

انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے درمیان مل جل کر زندگی گزارے۔ سب کی کامیابی میں ایک کی کامیابی ہے اور سب کی بربادی میں ایک کی بربادی۔ آدمی جب دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو گویا کہ وہ سماج میں ایسا ماحول بنا رہا ہے اور ایسی روایات قائم کر رہا ہے جبکہ دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی اس کو اچھے سلوک کا تحفہ دیا جائے۔

ایک آدمی جب جھوٹ بولے تو گویا کہ وہ دوسروں کو بھی جھوٹ بولنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک آدمی جب دوسرے کی چیز ہڑپ کر لے تو وہ اپنے اس عمل سے سماج میں ناجائز قبضہ کی روایت قائم کر رہا ہے۔ ایک آدمی جب وعدہ کرے اور وقت آنے پر وعدہ کو توڑ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سارے سماج کو وعدہ توڑنے پر جری کر دیا۔

سماجی زندگی کا رخ متعین کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز روایت ہے۔ سماجی زندگی ہمیشہ روایات پر چلتی ہے۔ اچھی روایت قائم کی جائے تو اچھا سماجی ماحول بنے گا۔ اور بری روایت قائم کی جائے تو برا سماجی ماحول پرورش پائے گا۔

اس طرح آدمی کا ہر عمل کسی نہ کسی طور پر خود اس کی اپنی طرف واپس آتا ہے۔ آدمی کے اچھے کردار سے سماج میں اچھی روایتیں قائم ہوں گی جس کا نتیجہ خود اس کو بھی مختلف صورتوں میں ملے گا۔ اسی طرح آدمی کے برے کردار سے سماج میں بری روایتیں قائم ہوں گی۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ ایسا ہوگا کہ اس کے اثرات مختلف صورتوں میں خود اس کی اپنی ذات تک بھی پہنچیں گے۔

اچھے کردار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کی اپنی روح کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ سماج ایک اچھا سماج بن جاتا ہے جس میں اسے رہنا ہے۔ اسی طرح برے کردار کا پہلا نقصان یہ ہے کہ آدمی روحانی سکون سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس کو رہنے کے لیے ایک ایسا سماج ملتا ہے جو جھاڑ جھنکاڑ کا سماج ہو۔ پہلی صورت میں اس کا سماج پھولوں کا سماج بن جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا سماج کانٹوں کا سماج۔

ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا کہ مختصر طور پر یہ بتائیے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپ بھی اسی طرح رہنے لگیں جس طرح آپ کے گردوپیش کی ساری دنیا رہ رہی ہے۔ کائناتی اخلاق ہی بہترین انسانی اخلاق بھی ہے۔ کائنات گویا ایک اخلاقی نمونہ ہے اور ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اس نمونہ کو ہم اپنی زندگی میں بھی اپنا لیں۔

آپ سورج کو دیکھیے۔ وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کو روشنی پہنچا رہا ہے۔ اس کے پاس ایک قوم کے لیے بھی روشنی ہے اور دوسری قوم کے لیے بھی روشنی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی سورج کو گالی دے تب بھی اس کو سورج کی طرف سے روشنی اور حرارت ہی کا تحفہ ملے گا۔

یہی آفتابی اخلاق ہمیں بھی اپنی زندگی میں اپنانا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے دینے والا بننا ہے، خواہ اس کی طرف سے ہمیں کچھ مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔ اس معاملہ میں ہمارا اخلاقی معیار اتنا اونچا ہونا چاہیے کہ ہم دشمن کو بھی دوست کی نظر سے دیکھیں اور غیر کے ساتھ بھی اپنوں جیسا سلوک کریں۔

آپ درخت کو دیکھئے۔ درخت کیا کرتا ہے۔ آپ کی سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو وہ لے لیتا ہے۔ اس کے بدلے وہ آکسیجن نکالتا ہے جو آپ کی تندرستی اور توانائی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ گویا کہ درخت ایک ایسا کارخانہ ہے جس کے اندر مضر چیز داخل ہو کر بھی صحت بخش چیز بن جاتی ہے۔

اب آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ اسی اخلاق کو اپنائے۔ اس کے کان میں کڑوا بول داخل ہو تو اندر پہنچ کر اس میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ وہ منہ سے میٹھے بول کی صورت میں نکلے۔ کوئی اس کو گالی دے تو اس کے بدلے وہ اس کے لیے نیک دعائیں کرے۔ کوئی اس کو نقصان پہنچائے تو وہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرے۔ کوئی اس کو ذلیل کرے تو وہ اس کو عزت دینے کی فکر کرنے لگے۔

کائنات میں یہی معاملہ ہر چیز کا ہے۔ یہاں تک کہ زہریلے جانوروں کا بھی۔ گجرات میں ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہ کئی قسم کے سانپ پالے ہوئے ہیں۔ وہ ان سانپوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، آپ کو ان زہریلے سانپوں سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بالکل نہیں۔ کیوں کہ یہ جانور تو قابل پیشین گوئی کردار کے حامل ہیں۔ وہ صرف اس وقت آپ کو کاٹتے ہیں جب کہ آپ انھیں ستائیں۔ اگر آپ جانوروں کو دکھ نہ دیں تو وہ کبھی آپ کو دکھ دینے والے نہیں۔

اسی طرح آدمی کو بھی قابل پیشین گوئی کردار والا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو پیشگی طور پر معلوم ہو کہ آپ کسی کو دھوکا دینے والے نہیں ہیں۔ آپ امانت میں خیانت کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ کبھی اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔ آپ کسی کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ آپ اپنے بارے میں ہمیشہ اس امید کو پورا کریں گے کہ آپ جب انسان ہیں تو آپ ہمیشہ انسانی کردار پر قائم رہیں گے۔ کسی بھی حال میں آپ انسانی روش سے ہٹنے والے نہیں۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲ ستمبر اور ۹ ستمبر ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔

کامیابی کا راز

کسی کا قول ہے کہ قیدی ہونا برا ہے ، مگر سب سے برا قیدی وہ ہے جو اپنی سوچ کا قیدی ہو۔ یعنی جو طرز فکر ایک بار اس کا بن جائے وہ اس کے خول میں بند ہو۔ اس محدود ذہنی خول سے باہر آکر وہ کچھ نہ سوچ سکے۔

جیل خانہ کی قید آدمی کے جسم کو دیواروں کے پیچھے بند کر دیتی ہے۔ مگر اس کا ذہن پھر بھی آزاد رہتا ہے۔ اس کا جسم ایک کمرہ کے اندر گھرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر اس کی فکر لامحدود فضا میں پرواز کرنے کے لئے آزاد رہتی ہے۔ لیکن جو آدمی اپنی سوچ کا قیدی ہو جائے اس نے گویا اپنے پورے وجود کو قید و بند میں مبتلا کر لیا۔

مثلاً آپ کو گھر یا محلہ کے کسی شخص سے تکلیف پہنچی۔ اس نے آپ کے جذبات کو ٹھیس لگا دی۔ اس کے بعد آپ کے اندر یہ خیال ابھر آیا کہ اس آدمی کو سبق پڑھانا ہے۔ آپ صبح و شام اسی رخ پر سوچنے لگے۔ یہاں تک کہ آپ کا یہ حال ہو گیا کہ آپ کو اس کے سوا کوئی اور بات یاد نہ رہی کہ فریق ثانی کو سبق پڑھا کر اپنے جذبات کو ٹھنڈا کریں۔

یہ گویا سوچ کا قیدی ہونا ہے۔ یہ انتقامی سوچ کے خول میں اپنے آپ کو بند کر لینا ہے۔ اگر آپ انتقامی سوچ میں گم نہ ہو جاتے اور اپنے ذہن کو پوری طرح کھلا رکھتے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اپنے حریف کو جواب دینے کا اس سے بھی زیادہ کارگر طریقہ یہاں موجود ہے۔

یہ زیادہ کارگر طریقہ کیا ہے۔ وہ ہے انتقامی ذہن کے بجائے درگزر کے ذہن سے سوچنا۔ زیادتی کرنے والے کو سبق سکھانے کے بجائے اس کو نظر انداز کر دینا۔ جس آدمی نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے اس کے ساتھ اچھے سلوک کا معاملہ کرنا۔

جو لوگ سوچ کے قیدی ہوں ان کا ذہن ہمیشہ ایک ہی رخ پر چلتا ہے۔ اور ایک رخ پر سوچنے والا آدمی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جو لوگ سوچ کے قیدی نہ ہوں وہ کھلے ذہن کے ساتھ رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے پر الگ الگ انداز میں غور کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مختلف راستوں میں سے اس صحیح ترین راستہ

کو پالیتے ہیں جو انھیں کامیابی کی منزل تک پہنچانے والا ہو۔

کسی مفکر نے کہا ہے کہ کوئی شخص کسی کا اتنا بڑا دشمن نہیں ہو سکتا جتنا بڑا دشمن وہ خود اپنا ہوتا ہے۔ یہ قول بلاشبہ صدفی صد درست ہے۔

مثلاً ایک شخص نے اگر آپ کا ایک ہزار روپیہ چوری کر لیا تو اس نے آپ کو ایک وقتی نقصان پہنچایا۔ لیکن اگر آپ اس ہزار روپیہ کا غم لے کر بیٹھ جائیں یا روپیہ لے کر بھاگنے والے کی نفرت اپنے دل میں بٹھالیں تو آپ برسہا برس تک منفی نفسیات میں مبتلا رہیں گے۔ اور منفی نفسیات سے زیادہ بری چیز انسان کے لئے اور کوئی نہیں۔

آپ کے پڑوس میں ایک شخص نے آپ سے زیادہ بڑا گھر بنا لیا ہے۔ یا اس کے لڑکے ترقی کرکے آپ سے آگے بڑھ گئے۔ اس فرق کو دیکھ کر آپ حسد اور جلن میں مبتلا ہو گئے۔ اب غور کیجئے تو پڑوسی آدمی نے بظاہر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن آپ حسد میں مبتلا ہو کر اپنا نقصان آپ کر رہے ہیں۔ کیونکہ حسد آدمی کے خون کو جلاتا ہے۔ آپ کا پڑوسی تو ترقی کی راہ پر چل کر اپنا خون بڑھا رہا ہے لیکن آپ حسد میں مبتلا ہو کر اپنا خون جلا رہے ہیں۔ اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاک کر رہے ہیں۔

کسی کا قول ہے کہ سکھانے والوں کی کمی نہیں۔ مگر سیکھنے والے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر بستی اور ہر سماج پر صادق آتی ہے۔

آپ سڑک پر دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی گاڑی دوڑاتا ہوا آیا۔ اچانک ایک غیر متوقع صورت حال پیش آئی۔ وہ اپنی گاڑی کو کنٹرول نہ کر سکا۔ اس کی گاڑی الٹ گئی۔ وہ بھی تباہ ہو گیا اور اس کی گاڑی بھی۔ یہ واقعہ ہلاک ہونے والے کے لئے حادثہ ہے اور دیکھنے والے کے لئے ایک سبق ہے۔ مگر کوئی گاڑی والا اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی بدستور اپنی گاڑی تیز دوڑاتا رہتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ جو کچھ ہوا دوسرے کے ساتھ ہوا، میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ دو آدمی ایک مسئلہ پر لڑ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ وہ پولیس کیس بن گیا۔ دونوں کئی سال تک تھانہ اور عدالت

میں دوڑتے رہے۔ آخر کار دونوں تباہ ہوکر بیٹھ گئے۔ اس قسم کے واقعات ہر روز پیش آتے ہیں۔ لوگ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مگر کوئی دیکھنے والا اس سے سبق نہیں لیتا۔ کسی سے جھگڑا پیش آنے پر ہر آدمی دوبارہ اس کہانی کو دہراتا ہے جو اس سے پہلے بار بار دہرائی گئی ہے اور ہر بار ناکام ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی آنکھ اور اپنے کان کو کھول کر دنیا میں رہے تو وہ پائیگا کہ ہر لمحہ اور ہر مقام پر کوئی سبق دینے والا اسے سبق دے رہا ہے۔ حتی کہ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات بھی سبق دینے کی اس مہم میں شریک ہیں۔

اگر آدمی کے اندر سبق لینے کی صلاحیت زندہ ہو تو اس کو خود تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسروں کے تجربات ہی اس کو ہر قسم کا بہترین سبق دینے کے لئے کافی ہو جائیں گے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۱ جولائی ۱۹۹۴ کو نشر کی گئی۔

ترقی کے آداب

اس دنیا میں ہر آدمی ترقی کرنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم آدمی ہیں جو فی الواقع کوئی بڑی ترقی حاصل کرتے ہوں۔ زیادہ لوگ معمولی یا اوسط درجہ کی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ کیا کچھ لوگ خوش قسمت پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ لوگ پیدائشی طور پر محروم اور بد قسمت ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ایسا کہنا خدا پر بے انصافی کا الزام عائد کرنا ہے۔ اور خدا کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی کا معاملہ نہیں کرتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر آدمی اعلیٰ صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی بڑی بڑی ترقیوں کا امکان اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ جو آدمی عقلمندی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتا ہے وہ اعلیٰ ترقی حاصل کرتا ہے۔ اور جو آدمی اپنی خداداد صلاحیتوں کو استعمال نہیں کرتا۔ یا اسی کے ساتھ مہلک نادانیاں بھی کرتا رہتا ہے وہ کامیابی اور ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔

مثلاً کچھ لوگ چھلانگ لگانے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات غیر دانش مندانہ طور پر چھلانگ لگا کر اپنا ہاتھ پاؤں توڑ لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس دنیا میں ترقی ہمیشہ لمبی محنت اور مستقل کوشش سے ملتی ہے۔ وقتی چھلانگ لگانے سے کسی کو ترقی نہیں مل سکتی۔

کچھ لوگ دوسروں سے چھین جھپٹ میں ترقی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بہت بڑی بھول ہے۔ دوسرے کی چیز کبھی آپ کی چیز نہیں بن سکتی۔ اگر بالفرض آپ کسی غلط تدبیر سے دوسرے کی چیز کو ہڑپ کر لیں، دوسرے کی چیز پر ناجائز قبضہ کر کے بیٹھ جائیں تو اس طرح آپ کبھی ترقی کا مقام نہیں پا سکتے۔ یہ قدرت کے قانون کے خلاف ہے۔ قدرت کا قانون جلد یا بدیر آپ کو رسوا کر کے رکھ دے گا۔ وہ آپ کی آئندہ نسلوں تک کو ترقی اور کامیابی سے محروم کر کے چھوڑ دے گا۔

کچھ لوگوں کی ترقی اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ حرص اور خود غرضی میں حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ چاہنے لگتے ہیں کہ سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹ لیں، دوسروں کو کچھ نہ ملنے دیں۔ حالاں کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اُس کو اِس طرح بنایا ہے کہ یہاں دینے والا پائے۔ دوسروں کو نفع پہنچانے والا خود بھی نفع اٹھائے۔ اپنی کمائی میں دوسروں کا حصہ لگانے والا دوسروں کی کمائی میں

حصہ دار بنے۔

کچھ لوگ حسد اور جلن میں پڑ کر اپنی ترقی کا راستہ روک لیتے ہیں۔ جب وہ کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس کی کاٹ میں لگ جاتے ہیں۔ وہ اس کی کامیابیوں پر جلنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھیں تو آپ بھی آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ دوسروں کی ترقی سے آپ کے اندر شوق پیدا ہونا چاہئے نہ کہ حسد۔

بڑی ترقی حاصل کرنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ دوسروں کو ساتھ لے کر چل سکیں۔ کوئی بھی آدمی اکیلے اکیلے بڑی ترقی حاصل نہیں کرسکتا۔ آپ اگر بڑی ترقی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دوسروں کا دل جیتنا ہوگا۔ دوسروں کے اندر اپنا اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ اس طرح رہنا ہوگا کہ دوسرے لوگ آپ کو اپنا سچا خیر خواہ سمجھیں۔ آپ کو ایسا بننا ہوگا کہ جو کچھ آپ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی آپ دوسروں کے لئے بھی پسند کریں۔ اور جو کچھ آپ کو اپنے لئے پسند نہیں ہے وہ آپ کو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ ہو۔

اس دنیا میں ترقی ہر آدمی کا حق ہے۔ ترقی ہر آدمی کا مقدر ہے۔ ترقی ہر آدمی کے لئے لکھ دی گئی ہے۔ مگر ترقی صرف اس کے لئے ہے جو ترقی کے اصول اور آداب کو جانے اور ان کو درست طور پر اپنی زندگی میں استعمال کرے۔

زلزلہ قدرت کا ایک مظہر ہے۔ دنیا کے اکثر حصوں میں زلزلے آتے رہتے ہیں۔ پہلے جب زلزلہ آتا تھا تو بہت زیادہ جانی نقصان ہوتا تھا۔ مگر اب ترقی یافتہ ملکوں، مثلاً جاپان، کیلی فورنیا (امریکہ) وغیرہ میں زلزلہ آتا ہے تو بہت کم آدمی مرتے ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطالعہ اور تجربہ سے لوگوں نے جانا کہ زلزلہ میں جان کا نقصان زیادہ تر مکانوں کے گرنے سے ہوتا ہے۔ اس کا حل زیادہ پختہ یا زیادہ مضبوط مکان بنانا نہیں ہے۔ کیوں کہ زلزلہ کے مقابلہ میں کوئی بھی مکان مضبوط نہیں۔ اسی طرح اس کا یہ حل بھی نہیں تھا کہ زلزلہ کے خلاف شکایت اور احتجاج کیا جائے۔ کیوں کہ زلزلہ نیچر کے قانون کے تحت آتا ہے، اور نیچر کے خلاف احتجاجی شور وغل کبھی موثر نہیں ہوسکتا۔

ترقی یافتہ ملکوں میں اس مسئلہ کا حل یہ نکالا گیا کہ وہ لوگ اپنے مکان زیادہ پختہ

بنانے کے بجائے لوز انداز میں بنانے لگے۔ وہاں زلزلہ اب بھی آتا ہے۔ مگر اب یہ ہوتا ہے کہ زلزلہ کے جھٹکے کے وقت مکانات صرف ہل کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کر گرتے نہیں۔ اس طرح انسانوں کے مرنے کی نوبت نہیں آتی۔ کیوں کہ انسان چھتوں اور ملبوں کے نیچے دب کر مرجاتے تھے نہ کہ محض جھٹکے سے۔

یہی معاملہ خود انسانوں کا بھی ہے۔ ہر آدمی اپنے سینہ کے اندر ایک خطرناک زلزلہ چھپائے ہوئے ہے۔ یہ غصہ اور انتقام کا زلزلہ ہے۔ ایک آدمی کو جب دوسرے آدمی سے کوئی ٹھیس پہنچتی ہے۔ ایک شخص کو جب دوسرے شخص سے کوئی جھٹکا لگتا ہے تو اس کے بعد اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے سینہ میں انتقام کا زلزلہ آجاتا ہے۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے گھر اور دکان میں آگ لگا دیتا ہے۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کے نقصان کے درپے ہو جاتا ہے۔

یہ گویا سماجی زلزلہ ہے۔ یہ زلزلہ بھی فطرت کا ایک مظہر ہے۔ ہم اس کے وجود کو مٹانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہاں بھی ہم یہی کر سکتے ہیں کہ حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچا لیں۔ اپنی عقل کو استعمال کر کے اپنے آپ کو اس کی زد میں نہ آنے دیں۔

اس سماجی زلزلہ کے مقابلہ میں حکیمانہ تدبیر کیا ہے۔ ایک لفظ میں، وہ اعراض ہے۔ یعنی ٹکراؤ کے مواقع کو اوائڈ کرنا۔ آپ کو کوئی برا کہے تو اس کا اثر نہ لیجئے۔ کسی کی طرف سے کوئی اشتعال انگیز کلمہ آپ کے کان میں پڑے تو اس کو سنی ان سنی کر دیجئے۔ کوئی آپ کے کپڑے کے اوپر کیچڑ ڈال دے تو کیچڑ ڈالنے والے سے الجھنے کے بجائے پانی کے نل کے پاس جائیے اور اس کو دھو دیجئے۔ راستہ چلتے ہوئے کوئی شخص آپ کے اوپر کنکری پھینک دے تو اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیے۔ غرض ناخوشگوار باتوں کو بھلا کر اعتدال کے ساتھ اپنا سفرِ حیات جاری رکھئے۔

زمینی زلزلے کبھی بند نہیں ہوں گے۔ زمینی زلزلوں کے سلسلہ میں صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ان کے نقصان سے اپنے آپ کو بچا لیں۔ اسی طرح انسانی یا سماجی زلزلے بھی کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یہاں بھی جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ کہ ہم اعراض اور برداشت کی تدبیر کو استعمال کر کے اپنے آپ کو ان کی زد میں نہ آنے دیں۔ اپنے آپ کو ان کے نقصانات سے محفوظ رکھیں۔

یہ دنیا مسائل کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو آزادی ہے۔ ایک آدمی جب اپنی آزادی کو بے جا استعمال کرتا ہے تو وہ دوسرے آدمی کے لئے مسئلہ پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک آدمی جب اپنی زبان، اپنے ہاتھ اور اپنے پاؤں کو بے قید طور پر استعمال میں لاتا ہے تو وہ ایسا کرکے دوسرے لوگوں کو مسائل و مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے۔

اس کا حل کیا ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ہم لوگوں کی آزادی کو ختم کرنے کی مہم چلائیں۔ ایسی مہم بے معنی شور وغل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کو یہ آزادی ان کے خالق نے دی ہے۔ اور جو چیز خود خالق نے دی ہو اس کو ہم لوگوں سے چھین نہیں سکتے۔

ایسی حالت میں مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے تدبیر۔ حکیمانہ اصول پر عمل کرتے ہوئے لوگوں کے ضرر سے ممکن حد تک اپنے آپ کو بچانا اور اپنی تعمیر کے مواقع تلاش کرکے اس کے حصول میں لگ جانا۔

مثلاً ٹکراؤ سے اعراض کرنا، چھوٹے نقصان کو برداشت کر لینا، اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا، دوسروں سے مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنے استحکام پر توجہ دینا۔ مسائل کو نظر انداز کرکے مواقع اور امکانات کو استعمال کرنا۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں کامیابی کا یہی واحد طریقہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں جس کے ذریعے کوئی شخص اس دنیا میں کامیابی حاصل کر سکے۔

حکیمانہ تدبیر ہر مسئلہ کا حل ہے۔ حکیمانہ تدبیر ہر نقصان سے بچنے کا یقینی نسخہ ہے۔ آپ حکیمانہ تدبیر کو اپنا اصول بنا لیجئے اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔

نوٹ:۔ یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۶ دسمبر ۱۹۹۳ کو نشر کی گئی۔

وقت کا استعمال

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ کشادگی کا انتظار کرنا افضل عبادت ہے (افضل العبادۃ انتظار الفرج) یہ ایک حکیمانہ بات ہے جو خدا کے پیغمبر نے ہمیں بتائی۔ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے الجھے ہوئے معاملات میں اکثر کسی مسئلہ کا سادہ حل یہ ہوتا ہے کہ اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔

خدا نے اس دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں سارے اسباب ہمیشہ اصلاح اور تعمیر کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ راستہ میں کوئی گندگی ڈال دیں تو فوراً لاکھوں کی تعداد میں بیکٹیریا وہاں جمع ہوجاتے ہیں تاکہ اس کو تحلیل (decompose) کرکے اس کو مفید گیس میں تبدیل کرسکیں۔ یہی فطرت کے پورے نظام کا حال ہے۔ اس لئے انتظار کی پالیسی اس دنیا میں کوئی بے عملی کی پالیسی نہیں۔ وہ عین عمل کی پالیسی ہے کیوں کہ انسان کا انتظار کرنا گویا فطرت کو یہ موقع دینا ہے کہ وہ حرکت میں آکر اس کے مسئلہ کو زیادہ بہتر طور پر حل کردے۔ اسی بات کو شاعر نے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ایک بار میں ایک بڑے شہر میں گیا۔ وہاں میری ملاقات ایک تاجر سے ہوئی۔ وہ سخت پریشان تھے۔ حتی کہ ان کا بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے ایک تجارتی سامان تیار کیا۔ مگر جب وہ اس کو مارکیٹ میں لائے تو انھیں بروقت خریدار نہ مل سکے۔ ان کا سامان گودام میں ڈھیر ہوکر رہ گیا۔ انھوں نے کہا کہ مجھے کوئی دعا یا عمل بتائیے جس سے میں اس تجارتی بحران سے نکل سکوں۔

میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بجائے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ایک نصیحت لکھی اور اس کاغذ کو ایک لفافہ میں بند کرکے انھیں دے دیا۔ میں نے کہا کہ اس لفافہ کو آپ دس دن کے بعد کھولئے گا۔ اس لفافہ کے اندر جو کاغذ بند تھا اس پر میں نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں ایک مختصر جملہ ان الفاظ میں لکھا تھا: اپنے معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

ڈیڑھ سال کے بعد مذکورہ تاجر کی طرف سے ایک خط میرے پاس آیا۔ اس میں انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ آپ کے مشورہ کے مطابق میں نے انتظار کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ نہایت شاندار نکلا۔ اللہ کے فضل سے میرا سارا مال نفع کے ساتھ فروخت ہوگیا۔ میرا پھنسا ہوا روپیہ خالی ہوگیا ہے اور اب میں ایک نیا کاروبار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ اخلاقی عمل کا عظیم قانون خدا کے بعد یہ ہے کہ وقت کا احترام کیا جائے:

The great rule of moral conduct is, next to God, to respect time.

خدا کا حق انسان پر یہ ہے کہ وہ خدا کی پرستش کرے۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ وہ انسان کا خالق اور مالک ہے۔ وہی سب کچھ دینے والا ہے۔ اس لئے وہی اس کا حقدار ہے کہ سب سے زیادہ اس کی تعظیم کی جائے۔ اسی کا نام پرستش یا عبادت ہے۔

وقت موجودہ دنیا میں انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں سب کا سب وقت کے دائرہ میں کرتے ہیں۔ جہاں وقت ختم ہوجائے وہاں انسان کا عمل بھی ختم ہوجاتا ہے۔

اس لئے انسان کو سب سے زیادہ وقت کا پاس و لحاظ کرنا چاہئے۔ وقت کو ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس جو سب سے بڑی دولت تھی اس کو اس نے ضائع کردیا۔ وقت کو اگر آپ استعمال نہ کریں تو وہ آپ کے پاس ٹھہرا نہیں رہے گا بلکہ چلا جائے گا۔ اور پھر کبھی لوٹ کر آپ کے پاس نہیں آئے گا۔ وقت کا جو لمحہ کھویا گیا وہ ابدی طور پر کھویا گیا۔ اسی کو شاعر نے سادہ طور پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

شیکسپیر جو مشہور انگریزی ادیب اور شاعر ہے، اس کا ایک قول یہ ہے کہ — میں نے وقت کو برباد کیا تھا اب وقت مجھ کو برباد کر رہا ہے:

I wasted time and now doth time waste me.

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو وقت مجھے ملا تھا وہ میرے لئے عمل کا یا ترقی کی طرف بڑھنے کا ایک لمحہ تھا۔ جب میں نے اس ملے ہوئے وقت کو استعمال نہیں کیا تو اس کے بعد یہ ہوا کہ میں ترقی کی طرف اپنا

سفر بھی جاری نہ کرسکا جس کا نتیجہ ابدی محرومی تھا۔اس طرح اب میں محرومی کی صورت میں اپنے ضیاع وقت کی قیمت ادا کر رہا ہوں۔

گول برن (Goulburn) کا ایک قول اس قابل ہے کہ ہر آدمی اس کو یاد کرلے۔ وہ اس کو اس طرح محفوظ کرلے کہ وہ ہمیشہ اس کے دماغ میں مستحضر رہے۔ وہ قول یہ ہے کہ زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں جس کے ضائع کرنے کا ہم تحمل کرسکیں:

There is not a single moment in life that we can afford to lose.

وقت کو کھونا عمل کے مواقع کو کھونا ہے۔ جس نے عمل کے مواقع کو کھو دیا اس نے گویا کہ اپنا سب کچھ کھو دیا۔ وقت کو کھونے کے بعد کوئی بھی چیز باقی نہیں رہتی جس کو پانے کے لئے کوئی شخص جد و جہد کرے۔

وقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لئے زندگی میں انضباط (ڈسپلن) پیدا کرنا لازمی طور پر ضروری ہے۔اس کی چند ضروری تدبیریں یہ ہیں۔

۱. صبح کو سویرے اٹھنا۔ رات آرام کرنے کے لیے ہے اور دن کام کرنے کے لئے۔ آدمی جتنا زیادہ سویرے اٹھے گا اتنا ہی زیادہ وہ اپنے دن کو مفید طور پر استعمال کرسکے گا۔ اگر آپ اپنے ملے ہوئے وقت کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو صبح کو سویرے اٹھنے کی عادت ڈالئے۔

۲. اپنا احتساب کرنا۔ شام کو جب آپ سونے کے لئے بستر پر لیٹتے ہیں تو یہ سوچئے کہ آج کا دن آپ نے کیسا گزارا۔ آپ نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ کون سا کام آپ کا صحیح تھا اور کون سا کام غلط۔ اپنے آج کے دن کو آپ اور زیادہ بہتر کس طرح بنا سکتے تھے۔ حال کا یہ احتساب آپ کے مستقبل کو زیادہ بہتر بنانے میں مدد کرے گا۔

۳. ڈائری کا استعمال۔ ہمیشہ اپنے پاس ایک پاکٹ ڈائری رکھئے۔ اس میں ہر روز کے مشاہدات اور تجربات کو مختصر طور پر لکھتے رہئے۔ یہ ڈائری آپ کے لئے نہ صرف ایک یادداشت ہوگی بلکہ وہ آپ کے لئے ایک ریگولیٹر بھی بن جائے گی۔ وہ آپ کی زندگی کی بہترین گائڈ ثابت ہوگی۔

نوٹ : آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲۹ جون ۱۹۹۵ کو نشر کیا گیا۔

استقلال میں کامیابی

"استقلال میں کامیابی ہے۔" کسی کا یہ قول نہایت بامعنی طور پر کامیابی کی حقیقت کو بتاتا ہے۔ اور پوری تاریخ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ زندگی ہمیشہ ناہموار راستوں میں سطے ہوتی ہے۔ یہاں ہر آدمی کو طرح طرح کے ناموافق حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لئے زندگی میں ہمیشہ یہ کرنا پڑتا ہے کہ ناموافق تجربات کے باوجود آدمی اپنا سفر برابر جاری رکھے۔ اسی کا نام استقلال ہے۔ اور جو آدمی استقلال کا ثبوت دے وہی اس دنیا میں کامیابی کی منزل کو پہنچتا ہے جتنا استقلال اتنی ہی کامیابی۔

یہ فطرت کا قانون ہے اور اگر آدمی آنکھ کھول کر دیکھے تو ہر طرف اس کو ایسے نشانات نظر آئیں گے جو اس کو اس حقیقت کا پتہ دے رہے ہوں۔ جو اس کو اس حقیقت کی یاد دہانی کرانے والے ہوں۔

ایک آدمی دریا کے کنارے ایک چٹان پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا تو اس کو نظر آیا کہ پانی کی موجوں کے مسلسل ٹکرانے سے چٹان کا پتھر گھس گیا ہے۔ اس نے کہا کہ دیکھو، چٹان ایک سخت چیز ہے اور پانی ایک نرم چیز ہے۔ لیکن اگر نرم چیز بھی استقلال کے ساتھ عمل کرے تو وہ چٹان جیسی سخت چیز کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ چنانچہ ساری دنیا میں سمندروں کے کنارے بے شمار مقدار میں ریت کے جو ذرے پائے جاتے ہیں وہ ساحلی چٹانوں کے ساتھ پانی کے اسی ٹکراؤ کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں۔

مولانا اسماعیل میرٹھی ایک ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے بہت سی اصلاحی نظمیں لکھی ہیں۔ استقلال کی اس اہمیت کو انھوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے :

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل   تو گھس جائے بے شبہہ پتھر کی سل

اس معاملہ کی ایک تازہ مثال ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر (۱۹۹۵ - ۱۹۱۰) کا واقعہ ہے۔ وہ بچپن سے ریاضی اور فلکیات میں دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر ریسرچ شروع کی کہ ستارے کس طرح وجود میں آتے ہیں۔ اور کس طرح فنا ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تحقیقات کے

ابتدائی نتیجہ کو ایک مقالہ کی صورت میں مرتب کیا اور پہلی بار ۱۱ جنوری ۱۹۳۵ کو لندن میں ہونے والی ایسٹرو فیزیکل سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں یہ مقالہ پیش کیا۔ اس میٹنگ میں برطانیہ کے بڑے بڑے سائنس داں موجود تھے۔ ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر جب اپنا مقالہ پیش کر چکے تو اس وقت کے ایک ممتاز برطانی سائنس داں سر آرتھر ایڈنگٹن اٹھے۔ انھوں نے نوجوان چندر شیکھر کا مذاق اڑایا اور ان کا مقالہ سب کے سامنے پھاڑ کر پھینک دیا۔

اس کے بعد چندر شیکھر نے چاہا کہ اپنا یہ مقالہ لندن کے ایسٹرو فیزیکل جرنل میں چھپوائیں۔ مگر اس سائنسی جرنل نے بھی ان کا مقالہ چھاپنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر چندر شیکھر برطانیہ میں پیش آنے والے اس حوصلہ شکن تجربہ سے بد دل ہو کر اپنے وطن ہندستان واپس آئے اور یہاں یونیورسٹیوں میں ملازمت کی تلاش کی مگر یہاں اپنے وطن میں بھی انھیں کسی یونیورسٹی میں ملازمت نہ مل سکی۔ وطن کے باہر بھی انھیں ٹھکرا دیا گیا اور وطن کے اندر بھی۔

لیکن چندر شیکھر مایوس نہیں ہوئے۔ اس کے بعد وہ شکاگو (امریکہ) چلے گئے۔ وہاں انھیں حالات سازگار ملے۔ مگر وہ اپنی تحقیقات میں از سر نو مشغول ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کا نظریہ مقبول ہونے لگا۔ ان کے مقالات بڑے بڑے سائنسی مجلات میں چھپنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کا نظریہ چندر شیکھر لمٹ (Chandra Shekhar Limit) کے نام سے سائنسی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں جب کہ ڈاکٹر چندر شیکھر کی عمر ۷۳ سال ہو چکی تھی ان کو سائنس کا نوبل پرائز دیا گیا۔

اس طرح کے سبق آموز واقعات سے انسانی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی حقیقی کامیابی حاصل کی ہے اسی استقلال اور مسلسل عمل کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ نہیں۔

کسی مفکر کا قول ہے کہ اگر تم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر انتظار کی طاقت پیدا کرو۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ کامیابی ہمیشہ لمبے انتظار کے بعد ملتی ہے۔ اور انتظار کی ضرورت اسی لئے ہے کہ کوشش کے دوران ہر بار ایسی رکاوٹیں پیش آتی ہیں جو بظاہر منزل کو دور کر دیتی ہیں۔ اس لئے آدمی کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ہمت نہ ہارے۔ وہ صبر و برداشت سے کام لیتے ہوئے اپنی کوشش میں لگا رہے۔ وہ انتظار کی مدت کو کبھی ختم نہ ہونے دے۔

یہ معاملہ اتنا قطعی ہے کہ اس میں ہمارے لئے کوئی دوسرا انتخاب نہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ فطرت کے اس فیصلہ کو مانیں۔ ہم فطرت کے نظام سے مطابقت کرتے ہوئے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ فطرت کے مقرر نظام کو بدلنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی نہ شکایت اور احتجاج میں وقت ضائع کرے۔ اور نہ مایوس اور پست ہمت ہو۔ وہ حقیقت پسندی کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنا عمل مسلسل جاری رکھے۔ اس کے بعد کامیابی اس کے لئے اتنی ہی یقینی ہو جائے گی جتنا کہ شام کو سورج ڈوبنے کے بعد اگلی صبح کو دوبارہ روشن سورج کا نکلنا۔ مسلسل عمل لازمی طور پر آدمی کو اس کے مطلوب نتیجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

قدرت کو ککڑی کا درخت اگانے کے لئے صرف چند مہینے درکار ہوتے ہیں۔ مگر جب چنار کا درخت اگانا ہو تو اس میں خود قدرت کو بھی سو سال کا وقت لگ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کا معاملہ اس سے مستثنیٰ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

اگر آپ لمبی محنت کے اصول کو نہ مانیں تو پھر آپ کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ کیوں کہ لمبی مدت تک مستقل محنت ہی کسی بڑی کامیابی کی لازمی قیمت ہے۔ جو آدمی یہ قیمت دینے کے لئے تیار نہ ہو اس کو اپنے لئے کسی بڑی کامیابی کی امید بھی نہ کرنا چاہئے۔

نوٹ : یہ تقریر ۲۸ ستمبر ۱۹۹۵ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی